

ایک دانا دیکھو

PDFBOOKSFREE.PK

ماڈل: آمنہ کریم
میک اپ: روز چوٹی پارلر
فوٹو گرافی: مہوش رضا

مکمل ناول

دلوں کا مل کر پھڑنا نزہت ناز ۳۰
اعتبار بھی آہی جائے گا سباس گل ۱۳۶

ملاقات

ابن آس روحان دانش ۲۱۵

ناولٹ

کس دیس میں ہے میرادل سحر مبین ۵۸

سلسلے وار ناول

جو عشق میں بیتی وہ عشق ہی جانے نانکھ طارق ۱۲۲
بند قباہ کھلنے لگی سعدیہ عابد ۱۷۸
تجھ سے مانگوں میں تجھ کو شازیہ مصطفیٰ عمران ۹۰
تیرے پیار کی خوشبو قمر شہک ۱۰

افسانے

اندھی تقلید فاطمہ مقبول ۷۵
ماں سدرہ اصف علی ۷۸
محبت شریک سفر میری شراجہ ۱۰۷
سانسوں کی مالا ثوبیہ ملک ۱۱۲
میں پیشماں تیرا دانیہ آفرین ۱۳۰
تم سے مل کے رضوانہ آفتاب ۱۶۴

اپریل 2014ء

جلد نمبر ۱۹ شمارہ نمبر ۴

قیمت 60 روپے

زرد گالانہ بذریعہ رجسٹری

720 روپے



34535726

پبلشر وائیڈ نر صالیہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۱۲۹/ ڈی بلاک 2- پی-ای-سی-ایچ-سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ماہ نامہ ”ردا“ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار کسی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کراوے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ ”ردا“ پبلشر۔

مستقل سلسلے

ردائے جنت صالیہ محمود ۷ سندیلے
ردا کی ڈائری صدف سعد ۱۹۵ کچن
ذرا پھر سے کہنا شہلا مشائق ۲۰۴ سنگھار
خوشبو نورین ملک ۲۰۱ اشعار
اس ماہ میں نورین ملک ۱۹۹ ردا کی شہزادیاں
نقش فریادی صدف سعد ۲۲۰ دوستوں کے نام
عائشہ حمد ۲۲۱

نیو کی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
سائیکسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
نئے اور پرلے فوائڈیشن کی شریہ فروخت کی جاتی ہے
دوکان نمبر ۶ صدر بازار ہری پور





زندگی بہت مصروف ترین لمحہ ہے، وہ لمحہ جسے ہم بھی با مقصد یا بس یوں ہی وقت گزارنے کے لیے سمجھ لیتے ہیں، زندگی اتنی آسان بھی نہیں ہے، با مقصد زندگی کے لیے ہمیں کٹھن اور دشوار محلوں سے گزرنا پڑتا ہے، یہی زندگی کی ایک آزمائش کا سفر ہے، زندگی کے سفر کا آغاز اتنا سہل نہیں ہوتا کہ بندہ بشری صراط سے دامن بچا کر گزر جائے۔ گزرنے کے لیے ہمیں با مقصد حیات کا گوشوارہ خود ہی مرتب کرنا ہوتا ہے، تب جا کے وقت کا تعین اور ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔ انسان ہر وقت ہر لمحہ اس تک دو دو میں وقت گزار دیتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ حاصل زیست یا یوں کہہ لیجیے زاد سفر حاصل کر لیتا ہے اور زندگی یوں گزر جاتی ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری تکمیل کا مقصد اللہ کے آگے جھکنا ہے سوائے رب سے خیر کی پناہ مانگتے رہیے اللہ بے نیاز ہے، عطا کرنے میں بے حساب ہے۔

تو آپ بتائیے! ہم ردا کو بہت پیار اور محبت سے سنوارتے ہیں ہماری کسی بھی تخلیق کا مقصد یہ نہیں رہا کہ حرم، بے راہ روی یا معاشرے کی کسی بھی برائی کو اچھالیں، کچھ ہمارے رائٹرز بے حساب معاشرے کی برائیوں کو نقل و غارت گری نہ صرف بلکہ خود کشی جیسے موضوع پر لکھنا چاہتے ہیں ایسے موضوعات کی ردا میں کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ اپنے قلم سے آپ خود کشی جیسے واقعات کو روکنے کے لیے دین کا حوالہ دے سکتی ہیں، بہت سارے ایسے موضوعات ہیں، عزت نفس، عورت کی جدوجہد، پرورش کا آغاز جو کہ تناور درخت ثابت ہوتا ہے آپ ایسے موضوعات پر لکھیں پڑھنے والی بچیاں اس سے کچھ سیکھ سکیں نہ کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اقدام خود کشی کی مرتکب ہوں، معاشرے کی تو اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جنہیں ہم بے نقاب نہیں کر پاتے، تنگ بچیوں کے لیے میں نے اس سفر کا آغاز کیا تھا اور میرا پہلا ادارہ یہ بھی یہی تھا کہ خود کشی کے رجحان کو روکا جائے۔ عزت اور محنت کی طرف بچیوں کو راغب کیا جائے۔ الحمد للہ! میں اس میں کامیاب ہوں، لہذا میں تمام رائٹرز سے گزارش کرتی ہوں کہ اقدام خود کشی پر کوئی تحریر یہاں نہ بھیجیں۔ بات آپ لوگوں کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ موت کا حق میں نے کبھی اپنے قلم کو نہیں دیا، افسانے سے لے کر دیگر ناول تک ہم نے اپنے کسی کردار کو موت نہیں دی، ہاں اگر کہیں واقعی طبعی موت ہوئی ہے اور وہ کردار ہمارے نوک قلم سے تحریر ہوا ہے تو میں اس کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ورنہ میں نے کبھی کسی کردار کو خود موت کا حکم نہیں دیا۔ آپ بھی کوشش کیجیے بات بات پر آپ لکھتی ہیں ”وہ مر گیا، حادثہ ہو گیا، اس نے بھی اپنی جان دے دی، فلاں پاگل ہو کر نکل گئی، قبر پر جا کر بچاؤ بن گئی“۔ میری پیاری شہزادیوں! ایسا کچھ نہیں ہے معاشرے کی سچائی لکھیں، حقیقت لکھیں کہ ایک لڑکی کا نکاح ٹوٹ گیا، تو کیا اس نے خود کشی کر لی۔ بھئی! لکھیں کہ اس نے گھر سے نکل کر ایم فل کر لیا، پی ایچ ڈی کر لی، اس نے وقت اور حالات کو بدل دیا، یاد رکھیے قلم سے نکلا ہوا ایک جملہ کسی کے بھی دماغ کو ہٹ کر سکتا ہے۔ میں تمام رائٹرز سے جو میڈیا پر سیریل لکھتی ہیں ان سے بھی گزارش کرتی ہوں کہ خود کشی کو روکیے۔ خود کشی کرنے والے بھی یہ سوچ لیں کہ کوئی کسی کے لیے نہیں رکھا، آپ کے چلے جانے سے کسی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، لہذا اپنی سوچ پر ہی استغفار کریں، توبہ کریں، نہ صرف یہ بلکہ جس حالت میں خود کشی کی گئی ہے، قیامت تک اسی حالت میں اللہ بار بار اسے گزارے گا، لہذا دنیا کے دکھ، تکلیفیں، ذلت، رسوائی سب کچھ برداشت کریں اور اللہ کے عذاب سے کوئی بڑا عذاب نہیں ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھیے۔ جذباتی بچیوں کو یہ بات بار بار بتائی جائے اللہ کی دی ہوئی زندگی کو مٹانا اللہ کے گھر بار اس عذاب سے گزرنا پڑے گا پلیر میرا یہ پیغام ہے آپ پڑھنے کے بعد اس پر ڈسکس کریں اور اسے آگے بڑھائیں۔

(آپی)



فیوڈ کی لاجسٹریکس اینڈ فریمنگ پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
میں اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 1 صدر بازار ہرنی پور

نے ابھی تک بچہ نہ دیا ہو (اور جس کے تھن خشک ہوں دودھ نہ دیتے ہوں) چنانچہ وہ ایک سوکھی سی بے دودھ والی بکری پکڑ لائے۔ آپ ﷺ نے کچھ پڑھا، تھنوں پر دست مبارک پھیرا تو یکا یک تھن دودھ سے بھر گئے اور پھر آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اسی بکری کے تھنوں سے خوب دودھ پیا اور جب تینوں خوب سیر ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے کچھ پڑھ کر تھنوں پر ہاتھ مبارک پھیرا تو اس بکری کے تھن اپنے پہلے والی حالت پر آ گئے اور دودھ غائب ہو گیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ یہ حیرت ناک منظر دیکھ کر حیرت و مسرت سے دو چار ہو گئے اور آپ ﷺ سے درخواست کی مجھے بھی اس علم کی تعلیم دیجئے جو آپ ﷺ کے پاس ہے آپ ﷺ نے اس کے لئے دعا فرمائی۔ اس ہمت افزائی نے عبداللہ بن مسعودؓ پر اتنا اثر کیا کہ وہ فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور حضور اقدس ﷺ کی بے پناہ محبت اور جذبات جاں نثاری ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر گئے۔

ایمان لانے والے سرکار دو عالم ﷺ پر سابقون الاولون ہی میں یہ چھٹے مسلمان تھے جو ایمان کی نعمت عظمیٰ سے مشرف ہوئے۔ سرور کائنات ﷺ نے انہیں اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا۔ وہ حضور انور ﷺ کے خاص خدام میں شامل ہو گئے۔ آپ سرور کو نمین ﷺ کی بعض باتوں کے امین بھی تھے اور خاص راز داں بھی۔ سرکار دو عالم ﷺ کی مسواک، تعطین مبارک اور وضو کا پانی سفر میں بھی لئے رہتے اور وقت ضرورت آپ کو پیش کرتے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ غزوہ بدر اور اس کے بعد کے

عبداللہ نام کے متعدد صحابہ کرامؓ میں سے چار خوش قسمت صحابہؓ ایسے بھی ہیں جن کی بعض انفرادی خوبیوں اور ذاتی صلاحیتوں کے سبب انہیں مقام دوام حاصل ہوا اور محدثین کرام و فقہائے عظامؓ نے ان چاروں کو ایک ہی لقب ”عبادلہ“ سے موسوم فرمایا۔ ان عبادلہ اربعہ میں 1۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ 2۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ 3۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ 4۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شامل ہیں۔ ان مبارک ہستیوں میں سے فی الوقت فقیہ الامت حضور ﷺ کے ایک محبوب سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے ذکر خیر سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

سرکار دو عالم ﷺ منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد اپنے رفیق اور بالغ مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے جاں نثار صحابی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے کہ ایک نوجوان بکریاں چراتا ہوا نظر آیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور آپ ﷺ نے شفقت بھرے لہجے میں اسے مخاطب کیا پھر حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ ہمیں پیاس لگ رہی ہے تم ہمیں کسی بکری کا دودھ پلاؤ (تا کہ بھوک اور پیاس دونوں کو فائدہ پہنچے) نوجوان عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ یہ بکریاں کسی اور مالک کی ہیں تو امین ہوں اور خیانت نہیں کر سکتا کہ اس کی اجازت کے بغیر آپ کو بکری کا دودھ پیش کر سکوں۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا یہ جواب سنا تو بہت خوش ہوئے۔ امانت داری پاک بازی اور ایمان داری سے خوش ہو کر اس نوجوان کو دعا دی اور پھر فرمایا کہ اچھا کوئی ایسی بکری لے آؤ جس

تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوہ بدر کے موقع پر تو اللہ کے دشمن فرعون امت ابو جہل کو واصل جہنم کرنے میں دونوں جوانوں عفراء کے بیٹوں معاذ اور معوذ بن عمرو بن الجموح شریک تھے اور وہ تلواروں سے زخمی کر کے بے فکر ہوئے کہ وہ جہنم رسید ہو گیا مگر جب آنحضرت ﷺ نے بدر کے میدان میں ہی فرمایا کہ ”ہے کوئی جو ابو جہل کی خبر لائے۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہی تھے کہ پھرتی اور چابک قدمی کے ساتھ دوڑ پڑے اور لاشوں میں دیکھا کہ ابو جہل شدید زخمی حالت میں پڑا ہے مگر زندگی کی ابھی رتی باقی ہے روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے دشمن رسول ﷺ کی گردن پر پیر رکھ کر یہ کہا ”خزاک اللہ یا عدو اللہ۔ زلیل اور رسوا کیا تجھے اللہ نے اے اللہ کے دشمن! ابو جہل نے آنکھیں کھولیں اور کہا اے بکریوں کے چرانے والے! البتہ تو بہت اونچے مقام پر چڑھ بیٹھا تو حضرت ابن مسعود نے جواب دیا۔ حمد ہے اس ذات پاک اللہ سبحانہ کی کہ جس نے مجھے یہ قدر عطا فرمائی۔ ابو جہل پھر بولا۔ کس کو فتح اور کامیابی حاصل ہوئی اور غلبہ نصیب ہوا؟ حضرت ابن مسعود چیخ اٹھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو۔ پھر وہ بولا۔ تیرا کیا ارادہ ہے؟ حضرت ابن مسعود بولے میں نے تیرا سر (پر غرور) قلم کرتا ہے۔ کہنے لگا اچھا تو دیکھو یہ میری (سردار) کی تلوار ہے اس سے میرا سر کاٹنا۔ یہ بہت تیز ہے۔ تیری مراد اور مدعا کو جلد پورا کرے گی اور دیکھو میرا سر شانوں کے پاس سے کاٹنا تاکہ دیکھنے والوں کی نظروں میں مہیب اور ہیبت ناک معلوم ہو۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ بعد ازاں میں نے اس کا سر قلم کیا اور حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ اللہ کے دشمن ابو جہل کا سر ہے اور اس کا پیام بھی پہنچایا۔ آپ ﷺ نے معاً اللہ اکبر کہا اور فرمایا کہ یہ میرا اور میری امت کا فرعون تھا۔ یوں تو واضح و

رداؤا تجسٹ 8 اپریل 2014ء

فیو کی لائبریری اینڈ کمریمینٹ چوانست
ساؤنڈ سٹیم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
میں اور پرائیویٹ اسٹور کی طرح فروخت کی جاتی ہے
دوران کاروبار اسٹور پر کاروبار ہوتا ہے



WIP A-17/B. S I T E Karachi-75700. Pakistan Ph 7560911-13. Fax #: (92-21) 2562570-2560911, e-mail: freedomthp@yahoo.com

قیر پیر کی خوشبر

”ڈالے! آج تمہارا پلاسٹرا تر جائے گا، بولو تو یہیں ڈاکٹر بلوالوں یا اسپتال چلو گی؟“ ثرن اس کے لیے سیب کاٹ رہی تھی اور ایک پھانک کاٹ کر اس کے منہ میں ڈال دی تھی۔



”نہیں ثرن بھائی! میں اسپتال ہی چلوں گی، سچ اس قدر اگلی ہوئی ہے کہ میں باہر نکلا ہوں، باہر نکلتا چاہتی ہوں میں اسپتال ہی چلوں گی۔“ سیب کھاتے ہوئے وہ بولی تھی۔

”چلو ٹھیک ہے پھر تم جلدی سے یہ سیب تم کرو، میں تمہارے کپڑے چینیج کروادوں گی پھر چلتے ہیں۔“ آہستہ آہستہ اور باتوں باتوں میں ثرن نے اسے دو بڑے سرخ سیب کھلا دیئے تھے۔ اتنے میں حرا بھی کمرے میں چلی آئی تھی اس نے وارڈ روم سے اس کا کاشن کا سوٹ نکالا، ثرن نے اسے چینیج کروادیا تھا، دونوں کے سہارے وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہو؟“ نجمہ اپنے بیڈروم سے نکل کر ڈالے کے پاس ہی آرہی تھیں، اسے ان دونوں کے سہارے آتے دیکھا تو تیزی سے ان تینوں کے پاس آئیں۔

”ماما! میں اسپتال جاؤں گی۔“ ڈالے نے پہلے ہی کہہ دیا۔

”مگر بیٹا! ڈاکٹر فرید نے کہا ہے وہ خود شام میں یہاں آجائیں گے، جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں تھوڑا سا اور



”ہوتم دونوں“۔ وہ اس کے قریب آیا حرا اور ثمرن کو بٹنے کے لیے کہا وہ دونوں پیچھے ہٹی تھیں کہ زرمیل نے جھک کر ڈالے کو اپنے دونوں مضبوط آہنی بازوؤں میں کسی نازکی گڑیا کی طرح اٹھا لیا تھا۔
”یہ کیا ہے ہو رہی ہے؟“ وہ تو اس کی اس حرکت پر سرتاپا سگ کر رہی تھی، مگر اس نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا تو اس نے مزاحمت کی۔

”دوسرے پاؤں میں بھی پلاسٹر چڑھوانے کا ارادہ ہے کیا تو بتاؤ میں ہی تمہیں یہاں سے چھوڑ دیتا ہوں۔“ پہلی سیڑھی پر آ کر اس نے ہلکا سا ڈھیلا چھوڑا تو اس نے ڈر کے زرمیل کا مضبوط شانہ سختی سے پکڑ لیا تھا، جس پر وہ دھیمے سے مسکرا دیا۔

”چھوڑنا تو آپ کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔“ وہ طنز سے باز نہیں آئی تھی زرمیل بھی اس کے طنز کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

”میری جان! ایک موقع تو دو، زندگی بھر خود ہی میری بانہوں سے نکلنے کی خواہش نہیں کرو گی۔“ اس کے طنز کا برامنائے بغیر نہایت چاہت سے اسے دیکھتے ہوئے شوخی سے بھرے لب و لہجے میں کہا تھا، اس کی اس بے باک گفتگو پر وہ بری طرح حینپ کر رہ گئی تھی۔

”آپ مجھے نیچا تارے آپ کی کبھی چپ گفتگو سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس کی بے باک گفتگو سے اندر ہی اندر سنسنے لگی تھی، ان دو سالوں میں زرمیل بہت بدل گیا تھا، جس کا اندازہ اسے ہو چکا تھا کون کہہ سکتا تھا کہ سوہرا، منجیدہ رہنے والا، غصے والا زرمیل کا یہ روپ بھی دیکھنے کو ملے گا، اسے یاد تھا شادی سے پہلے وہ حرا کتنا مذاق اڑایا کرتی تھیں زرمیل کا، اس کے پیچھے بھی تھی تو حرا برا بھی مان جاتی تھی، بس غصے میں یہ بات بول دیتی کہ۔

”اللہ کرے تیری قسمت میں زرمیل بھائی کا ساتھ ہو۔“ جس پر وہ کہتی۔

”زرمیل بھائی کو اپنی طرح کی کوئی منجیدہ سی میچور لڑکی چاہیے۔“ مگر کسے معلوم تھا کہ دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں، شوخ و چٹیل، چٹیلی سی ہر دم ہنسنے مسکرانے والی امیچوری ڈالے، زرمیل جیسے اکڑو بندے کے نصیب میں لکھی جا چکی تھی، وہ ان ہی سوچوں میں غلطان تھی کہ زرمیل کی گیمیر آواز نے اس کا سکوت توڑا تھا۔

”سوچ لو اگر تم خود نیچے اترنے کا بول ہی رہی ہو تو میں تمہیں سیدھا اپنے اور تمہارے شتر کہ بیڈروم میں اتار دوں گا، پھر چاہے کوئی کچھ بھی کر لے وہاں سے تمہیں کوئی نکال نہیں سکتا، تم جانتی ہو میری ضد کو۔“ ذومعنی بات کی سرگوشی کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے کپے پر ٹٹل کر سے پیچھے سے ثمرن بھائی، ماما کو زور زور سے پکارنے لگی تھیں۔

”چندا! میں بالکل آپ کے پیچھے ہی کھڑی ہوں۔“ بہت قریب سے نجمہ کی آواز آئی تو زرمیل نے ہلکا سا رخ موڑا، وہ چاروں منہ نیچے کیے دھیمی سی مسکراہٹ لیے کھڑی تھیں، زرمیل تھوڑا سا خف سا ہو کر رہ گیا تھا، یقیناً ان لوگوں نے ان دونوں کی ساری گفتگو سن لی تھی، وہ ہولے سے مسکراتے ہوئے نیچے اتر اور نہایت آہستگی سے اسے اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھادیا تھا اور دروازہ بند کر دیا۔

”آپ لوگ یہیں رکیں میں ڈالے کو لے کر اکیلے ہی جا رہا ہوں۔“ اس نے ان چاروں کو آنے سے روک دیا اور جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا تھا، ڈالے نے دنگو سے ثمرن کو آواز دی مگر زرمیل نے آگے بولنے کا موقع دیے بغیر گاڑی زن سے آگے بڑھا دی تھی۔

”نہیں ماما! اب مجھ سے صبر بالکل نہیں ہوتا، جب ڈاکٹر انکل نے کہا ہے کہ آج نکلے گا تو شام کی دیر کیوں کریں؟“

”مگر چندا! تم نیچے کیسے اترو گی بیڑھیوں سے؟“ نجمہ پریشان ہو گئی تھیں، اس کی زرائی ضد سے کیونکہ گھر میں اس وقت کوئی مرد نہ تھا جو اسے نیچے لے کر جاتا۔

”میں بہت کڑوں گی ماما! آپ پریشان مت ہوں۔“

”ڈالے! ابھی بھی تم پر بہت غصہ آتا ہے، مانتی نہیں ہو، اپنی ہی کرتی ہو اگر خدا نخواستہ کوئی اونچ نیچ ہوگی پھر... نہیں کوئی نہیں جاری ہو تم۔“ وہ تو سوچ کر ہی دل تھام گئیں۔

”ثمرن! تم نے بھی اسے نہیں سمجھا یا؟“ نجمہ نے ثمرن کو دیکھا تھا۔

”ماما! میں نے اسے یہی کہا تھا کہ یہاں پلاسٹر کھلواؤ گی یا اسپتال چلو گی، مگر اس نے تو ابھی چلنے کی ضد لگائی۔“ ثمرن کو بھی شرمندگی ہونے لگی اپنی غلطی کا احساس بہت جلدی ہو جاتا تھا اسے۔

”حد ہوتی ہے ضدی پن کی بھی، بس میں نے کہہ دیا تم شام میں چلو گی یا پھر ڈاکٹر فرید خود یہاں آ جائیں گے۔“ انھوں نے اہل لہجے میں کہہ دیا۔

”نہیں ماما! مجھے ابھی جانا ہے۔“

”مگر ڈالے! تمہارے پاپا، عارفین بھی تو نہیں ہیں ناں۔“ نیچے زرمیل جو آسہ کو خدا حافظ کہہ کر نکلنے لگا تھا اوپر سے آتی آوازوں پر رک گیا، وہ سمجھ گیا تھا معاملے کی نوعیت کو، ڈالے کی ضدی طبیعت سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا، اگر اس نے کہہ دیا تو وہ اپنے کپے پر ضرور عمل کرے گی، وہ اپنا جانا تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کیے اوپر چلا آیا تھا، اور اس کے پیچھے آسہ بھی آ گئی تھیں۔

”کیا بات ہے پتی جان! آپ پریشان کیوں لگ رہی ہیں؟“ زرمیل نے منجیدہ سے نجمہ سے پوچھا تھا، اس کا اوپر آنا ڈالے کو اس قدر ناگوار گزارا تھا کہ ثمرن کو چلنے کا کہنے لگی تھی اس نے زرمیل کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔

”کچھ نہیں زرمیل بیٹا ڈالے پریشان کر رہی ہے، سن نہیں رہی میری، ڈاکٹر فرید نے کہا ہے کہ وہ شام میں خود آئیں گے پلاسٹر کھلوانے مگر یہ لڑکی اپنی ضد پر اڑی ہے کہ ابھی اسپتال جانا ہے۔“ انھوں نے کچھ غصے سے ڈالے کو دیکھا تھا زرمیل کی بھی نگاہیں ڈالے کی سمت انھیں جو رخ پھیرے ثمرن سے چلنے کا بول رہی تھی۔

”ڈالے! کیوں پریشان کر رہی ہو پتی جان کو؟ ٹھیک تو کہہ رہی ہیں، شام تک انتظار کرو۔“

”ثمرن بھائی! میں نے یہاں کسی سے مشورہ نہیں مانگا ہے، جب بول دیا کہ جاؤ گی تو مطلب جاؤں گی۔“ اس نے تنک کر ضدی لہجے میں کہا تھا، زرمیل بھی سمجھ گیا کہ وہ تو اسے دیکھ کر اور بھی ضدی ہو گئی تھی۔

”ڈالے...!“ نجمہ نے سختی سے اسے ڈانٹ دیا، انھیں ڈالے کا لہجہ سخت ناگوار گزارا تھا، وہ مزید بھی کچھ کہتی کہ زرمیل نے روک دیا تھا۔

”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“

”ثمرن بھائی! چلیں بھی۔“ اس نے زرمیل کو بری طرح نظر انداز کر دیا، اس کو اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی، زرمیل نے ایک سر دھانس کھینچی تھی اور پھر بتاؤ کچھ اور کہے آگے بڑھا تھا۔

”شرن بھائی کو تو آنے دیں۔“ اس نے زرمیل کو گھورا۔

”کیوں میرے ساتھ اکیلے جانے میں کیا قیاحت ہے، شوہر ہوں تمہارا ذمے داری ہو تم میری۔“

”ہونہ... شوہر... ذمے داری...“ ڈالے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی۔

”بہت جلدی آپ کو میری ذمے داری کا خیال آ گیا۔“ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

”چلو دیر سے ہی سہی آ تو گیا، اب تم بھی اپنی ذمے داری قبول کر لو، ساری ناراضی دور کر لو اور میرے پاس واپس آ جاؤ۔“ زرمیل نے ہلکا سا گردن موڑ کے ڈالے کو دیکھا تھا، سر مٹی کا گچ میں اس کے لیے شوشی کا ایک جہاں آباد تھا، جسے وہ بری طرح نظر انداز کر گئی۔

”فطی نہیں، یہ آپ کی بھول ہے کہ میں واپس آپ کے پاس آؤں گی۔“ اس نے ذرا سی سختی سے جواب دے کر چہرے کا رخ اس کی طرف سے پھیر کے وندو سے باہر کی طرف کر لیا، جس کا مطلب تھا وہ اس سے کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتی ہے۔

”چلو خیر، یہ تو پھر وقت ہی بتائے کافی الحال تو نیچے اترو اسپتال آ گیا ہے۔“ کوئی ایک گھنٹہ لگا تھا انھیں اسپتال میں ڈاکٹر فرید نے اس کا پلاسٹر کھولا اور سر کا زخم چیک کیا۔

”گڈ کرل! بہت جلدی کو کر لیا ہے آپ نے خود کو۔“ ڈاکٹر فرید نے مسکراتے ہوئے ڈالے کو دیکھا تھا۔

”ڈاکٹر انگل! میں اب نہیں بھی آ جا سکتی ہوں ناں؟“ وہ خوش ہو گئی تھی۔

”آف کورس مائی چائلڈ! آپ اسلام آباد گھومنے جا سکتی ہیں۔“ انھوں نے بات کو مزاح کا روپ دیا تھا۔

”ارے آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں اسلام آباد جا رہی ہوں؟“ ڈالے نے حیرانگی سے دیکھا۔

”بیٹا! مجھے سیم نے سب بتا دیا تھا کہ آپ اسلام آباد جانے کے لیے کس قدر ایکسٹینڈ تھیں، مگر اپنے اس زخم کی وجہ سے کیٹل کرنا پڑا، جب ہی تو پندرہ دن کے زخم کو ایک ہفتے میں کو کر لیا ہے۔“

”یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا ڈاکٹر انگل! اصل میں، میں فرسٹ ٹائم جا رہی ہوں، اس لیے بہت خوش ہوں۔“ اس کی سبز آنکھوں سے خوشی کی روشنی سی پھوٹ رہی تھی اس کے چہرے پر اس قدر خوشی تھی کہ ساتھ بیٹھا زرمیل بہوت سادہ کہنے لگا۔

”اوکے ڈاکٹر انگل! اللہ حافظ!“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”اوکے مائی چائلڈ! ایک کیئر، ویسے تو اب انشاء اللہ کوئی درد وغیرہ نہیں ہوگا، مگر پھر بھی اگر سر کے زخم میں درد اٹھے تو میں یہ ٹیبلٹ لکھ کر دے رہا ہوں اسے کھالینا اور خاص بات کہ اپنی غذا کا پراپر خیال رکھنا۔“ ڈاکٹر فرید نے اسے ایک وائٹ پیپر پر ٹیبلٹ کا نام لکھ کر دیا۔

”اوکے تھینک یو!“ وہ مسکرائے کمرے سے نکل گئی تھی، وہ بہت خوشی و مسرت محسوس کر رہی تھی اپنے اندر، کتنے دن بعد اپنے حیرتوں پر چلی تھی اس کی یہ بے انتہا خوشی اس کی سبز آنکھوں سے ہی نہیں اس کے چہرے سے بھی عیاں تھی۔

”بہت خوش ہو؟“ زرمیل کو وہ اس بل ہر شے سے زیادہ حسین لگ رہی تھی سب سے منفرد والگ۔

”کیوں مجھے خوش نہیں ہونا چاہیے؟“ نہایت جل کر جواب دیا تھا۔

”بالکل ہونا چاہیے اگر میں کہوں کہ مجھے بھی اپنی خوشی میں شامل کر لو۔“ ڈالے نے صرف چند بل خاموشی سے اس کی آس بھری سر مٹی کا گچ میں دیکھا تھا اور انی میں سر ہلا کر چہرے کا رخ ہی پھیر گئی۔

”ڈالے...!“

”مت نام لیں میرا، میری خوشیوں میں میرے دل و دماغ میں میری زندگی میں آپ کی کہیں کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ اس نے نفرت سے اسے بری طرح جھٹک دیا تھا۔

”گنجائش نکالنے کی کوشش تو کرو۔“ زرمیل نے اسٹیرنگ گھمایا تھا۔

”نہیں نکال سکتی چاہوں بھی تو آپ کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دے سکتی، آپ نے مجھے بہت دکھ دیے ہیں۔“

”میں ان دکھوں کا مداوا کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ آج پھر جان تو ڈکوش کر رہا تھا، ڈالے کو مٹا لینے کی۔

”نہیں آپ میرے اندر کے زخموں کا مداوا نہیں بن سکتے، آپ میرے جذبیوں و احساسات کے قاتل ہیں،

خون کیا ہے میرے ارمانوں کا، میرے خوابوں کو بڑھ بڑھ کر کرنے کے گناہ گار ہیں آپ، میری زندگی میرے جسم و

روح کو جس طرح اس ایک رات میں چھلنی چھلنی کیا ہے، اس کا آپ زندگی بھر مداوا نہیں کر سکتے، چاہ کر بھی نہیں

کر سکتے، اس لیے میں آپ سے نفرت کرتی ہوں، شدید نفرت۔ مت آیا کریں میرے سامنے آپ کو دیکھ کر

میرے زخموں میں پھر سے ٹیسس اٹھنا شروع ہو جاتی ہیں۔“ بالآخر اس کی سبز آنکھوں سے چند موٹی ٹوٹ کر رخسار

پر بکھرنے لگے، ان آنسوؤں کو دیکھ کر زرمیل کا دل کٹ کر رہ گیا، کس قدر دکھ ہوا تھا اس کے آنسو دیکھ کر، زرمیل

نے بے اختیار گاڑی سائینڈ میں روک دی تھی۔

”ڈالے! امیرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا بالکل نہیں تھا، پلیز اس طرح مت رو، مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“

زرمیل بے ساختہ اس کی طرف جھکا اور اس کا مرمیں سفید ہاتھ تھامنے کی کوشش کرنے لگا، ڈالے کو تو جیسے سو

والٹ کا کرنٹ چھو گیا ہو۔

”ہاتھ مت لگا میں مجھے اور یہ گاڑی کیوں روک دی آپ نے؟ آپ گاڑی چلائیں ورنہ میں گاڑی سے نیچے

اتر جاؤں گی۔“ اس نے زرمیل کا ہاتھ بری طرح جھٹکنے کے بعد ادھر ادھر دیکھا تو گاڑی کو رکاد دیکھ کر اس کا پیانہ

لبریز ہو گیا، اس کی آنکھوں سے مزید دریا بہنے لگا تھا۔

”اوکے... تم چپ ہو، میں گاڑی اشارت کرتا ہوں۔“ وہ گھبرا کر رہ گیا، ڈالے کا یوں روناد دیکھا نہیں جا رہا

تھا، اس نے گاڑی اشارت کر دی، ڈالے نے خاموشی سے اپنے بیٹے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کیا اور اس

کی طرف سے چہرہ موڑ لیا، زرمیل نے اس کی خاموشی کو بے بسی سے دیکھا اور نگاہیں وندو اسکرین پر جمادیں۔

پھر پورے راستے سفر خاموشی سے گزرا، دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی، گھر

آ چکا تھا، مگر اترنے سے پہلے ڈالے نے زرمیل کو دیکھا تھا۔

”یہ تو طے ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ قطعی نہیں رہنا ہے، چاہے میں اپنی جان سے ہی کیوں نہ گزر جاؤں،

آپ کی مجھے حاصل کرنے کی ہر کوشش ناکام ہی رہے گی، اس لیے میرے حصول کا خیال اپنے دل و دماغ سے

نکال دیجیے، دو سال جہاں گزارے ہیں وہیں واپس چلے جائیے، کیونکہ جب جب میں آپ کو دیکھتی ہوں مجھے خود

اپنے وجود سے کراہیت آتی ہے، دل شدت سے چاہتا ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی ہی مٹا دوں۔“ اس نے

بڑی بہادری سے ان سر مٹی کا گچ میں دیکھا تھا، آج دل کا سارا غبار ساری نفرت نکال دی تھی، اس کے اتنے سخت

الفاظ سن کر زرمیل دنگ رہ گیا تھا۔

”اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے؟“ کس قدر ٹوٹا بکھرا ہوا لہجہ تھا اس بل اس کا، سر مٹی کا گچ میں مایوسی و اداسی کے واضح رنگ جھلک رہے تھے، جنھیں ڈالے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”اس سے بھی کہیں زیادہ۔“ جسے کسی آخری انتہاؤں پر تھی وہ، چند بل لگے تھے دونوں کو یوں ہی خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے وہ کیا بولتا اب تو جیسے کچھ بچائی نہیں تھا کچھ بولنے کے لیے، آج لگتا تھا وہ ہار گیا، اس کی امید ٹوٹ گئی تھی، وہ جی دامان رہ گیا تھا، اس کا شکوہ خالی لوٹا دیا گیا تھا، اس کے اطراف ڈالے کے نفرت بھرے الفاظ گون گون کر بس یہی اعلان کر رہے تھے کہ۔

”زمین اتم ہار گئے اس جنگ میں، تمہاری جیت ممکن نہیں ہے، واپس لوٹ جاؤ۔“

”آئندہ میرے راستے میں مت آئیے گا۔“ وہ پھر کی نہیں بلکہ ایک جھکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور آرام سے اتری کہ پلاسٹر ابھی ابھی کھلا تھا، دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی، جہاں ہال میں بیٹھے سب ان ہی دونوں کا انتظار کر رہے تھے، اسے اپنے پیروں پر اتار دیکھ کر سب خوشی سے آگے بڑھے تھے، نجمہ نے تو اپنی لخت جگر کو اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔

”ارے یہ زمین کہاں ہے؟“ آسیہ نے زمین کی غیر موجودگی نوٹ کر لی تھی، انھوں نے ڈالے کو دیکھا مگر وہاں سے جواب نہ دار، وہ کوئی نوٹس لیے بغیر ٹرن سے اوپر چلنے کا کہہ رہی تھی، وہ سمجھ گئی کوئی بات ہوئی ہے، وہ باہر آئیں اور جس کا خدشہ تھا وہ سچ ثابت ہوا تھا، وہ مایوس واداس سا گاڑی میں ہی بیٹھا تھا، کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح سر کو جھکائے ہوئے تھا، وہ آہستہ سے اس کی طرف بڑھیں اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اس خالی سیٹ پر براجمان ہو گئیں، جہاں کچھ دیر پہلے ڈالے بیٹھی تھی۔

”زمین!...“ انھوں نے بولے سے پکارا تھا، زمین نے چہرہ اوپر اٹھا کر اپنی ماں کو دیکھا۔

”ہمت ہار گئے ناں؟“ جس پر وہ بولے سے مسکرایا اور ایک سرد سانس کھینچتے ہوئے ونڈا سکرین پر اپنی نگاہیں گاڑ دیں۔

”بندہ بشر ہوں، مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے، درد ہوتا ہے کبھی کبھی تو سوچتا ہوں ڈالے کی نفرت کی آگ کہیں اتنی نہ بھڑک اٹھے کہ اس سے نکلے شعلوں سے وہ خود کو ہی نقصان نہ پہنچالے، اس نفرت کی چنگاری جانے کتنے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، مجھے ہمارے رشتے کی ہی نہیں ہمارے خاندان کی ہمارے بیٹے کی بھی بہت فکر ہے، میں نے جو غلطی کی ہے اس کا ازالہ بھی کرنے کو بہ خوش تیار ہوں، لیکن ڈالے جو غلطی کرتے جا رہی ہے اس کے حصے میں شاید بچتا واپس نہ آئے، اسے اپنے بڑھتے قدموں کو روکنا ہو گا کی! اور نہ سب کچھ بس نہیں ہو جائے گا، ہمارے گھر کا شیرازہ بگڑ جائے گا۔“ شدت غم سے اس کی سرئی آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھرنے لگے تھے۔

آج پہلی بار وہ اپنے مضبوط و توانا بیٹے کو اس طرح ہارا ہوا، ٹوٹا بکھرا دیکھ رہی تھیں، اس کے لب و لہجے میں افسردگی و مایوسی کے نامیدی کے رنگ جھلک رہے تھے، وہ ایسا تو نہیں تھا، ہارنے والوں میں سے تو نہیں تھا، اتنی جلدی ہمت ہار جائے یہ ممکن ہی نہیں تھا، تو پھر اس کے حوصلے پست کیوں ہو رہے تھے؟ امید کا دامن کیوں چھوڑ رہا تھا وہ؟

”زمین اتم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ہمت نہیں ہارو گے، یاد رکھنا اگر تم ہمت ہار گئے، اس جنگ میں تمہاری جیت نہ ہوگی تو سب سے پہلے میرا ہوا منہ دیکھو گے۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

”مئی! کیا کہہ رہی ہیں آپ، اللہ نہ کرے جو آپ کو کچھ ہو، آپ سے پہلے میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا، جو آپ کا وعدہ پورا نہ کیا ہو تو۔“ اس نے آسیہ کے کندھے پر ہاتھ پھیرا کہ خود سے لگا تھا۔

”تو پھر وعدہ کرو کہ تم یہ جنگ جیت کے دکھاؤ گے نامیدی کی باتیں پھر کبھی سوچو گے بھی نہیں۔“

”او کے میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد اپنی پیاری سی مئی کا دل نہیں دکھاؤں گا۔“ اس نے آسیہ کے ہاتھ کو نرمی سے تھام کر اس کی پشت پر بوسہ دیا، ان کا چہرہ اٹھا کے اپنی انگلیوں کے پوروں سے ان کے ہتھے آنسو صاف کیے۔

”ناراض تو نہیں ہیں ناں؟“

”نہیں۔“ وہ مسکرا دیں۔

”اور اب تمہیں اکیلے جانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے، ڈرائیور کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ۔“ انھوں نے فکر مند انداز میں کہا۔

”مئی! آئی ایم آل رائٹ۔“

”نہیں، جب میں نے کہہ دیا کہ تم اکیلے نہیں جاؤ گے تو مطلب نہیں جاؤ گے۔“

”او کے، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“ وہ اپنا درد چھپائے دھیرے سے مسکرایا۔

”جیتے رہو، اللہ تمہیں ہر منزل ہر راہ پر کامیاب کرے۔“ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا، پھر وہ آسیہ کے کہنے پر ہی ڈرائیور کے ہمراہ پونڈ کی طرف نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ساری پینلنگ ہو گئی۔“ عارفین واش روم سے خالی جینز پر ٹاؤل ہاتھ میں پکڑے باہر نکلا تھا، مقبوم بیگ میں اپنے کپڑے ڈال رہی تھی، ساتھ کچھ ضروری اشیاء بھی تھیں جنہیں وہ چھوٹے بیگ میں ڈالنے لگی عارفین کا بیگ تو وہ بنائی چکی تھی، اپنا بیگ بنا رہی تھی، خود وہ تیار ہو چکی تھی، کٹن کے دھانی اینڈ ریڈ کڑھائی کے سوٹ پر اوپر سے ریڈ کوٹ پر جا رنٹ کا دوپٹہ ڈالے لیے سلکی بالوں کو دو تین بل باندھ کے باقی کے کپڑے چھوڑ دیے تھے، سرخ و سفید رنگت پر سیاہ آنکھیں جنہیں کا جل سے سجایا تھا، گال پر بڑے ڈھیل مسکرانے سے گہرے ہونے لگے تھے۔

”جی تقریباً ساری تیاری مکمل ہو گئی ہے۔“ وہ مسکراتی ہوئی جیسے ہی چلتی تھی سیاہ کھیری پلکیں فوراً ہی جھکائی پڑیں، سرخ و سفید رنگت میں مزید سرخی کھل گئی تھی، ہونٹوں کی مسکراہٹ لبوں کے تراش میں ہی سمٹ کر رہ گئی تھی، کیونکہ عارفین اسی حالت میں اس کے قریب چلا آیا تھا، اس کا یوں جھجکا عارفین کو پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا مگر جب نگاہ اپنے بالکل سامنے ڈرائیونگ ٹیبل کے سر پر پڑی تو سب سمجھ میں آ گیا تھا، وہ بولے سے مسکرایا تھا۔

”مقبوم!“ دھیرے سے مزید قریب آ کر کان میں ہلکے سے سرگوشی کی، چہرہ اس کے نازک شانے پر جھکا لیا تھا، مقبوم کی تو جیسے جان ہی مشکل میں پڑ گئی تھی، اس کی دھیمی سرگوشی پر بمشکل لرزتی پلکوں کی باڑھ کو اوپر اٹھایا تھا، دل کی دھڑکن کی رفتار بہت تیز سے تیز بڑھنے لگی تھی، گلابی ہونٹ کپکپانے لگے تھے، جنہیں وہ بار بار دانتوں سے کاٹ رہی تھی، اس کی غیر ہونی حالت پر عارفین کو رحم آ گیا، وہ مزید اسے اور امتحان میں نہیں ڈال سکتا تھا۔

”دوبری انویٹ!“ صرف اتنا بول کر اس نے گیلٹا ٹاؤل اس کے گھبرائے شرائے چہرے پر ڈال دیا اور وارڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔ مقبوم نے اپنے چہرے سے گیلٹا ٹاؤل ہٹایا اور عارفین کو دیکھا جو وارڈ روم سے اپنی بیوی شرت نکال رہا تھا۔

اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی، مقبوم نے خود پر قابو کیا اور شکر ادا کرتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھی، وہ عارفین کی حرکتوں سے سنبھل گئی تھی، آج کل وہ بہت بے باک سا ذوقی سا ہوتا جا رہا تھا لہذا اس نے وعدہ کیا ہو، مگر تھا تو ایک مرد ہی ناں، بس یہی سوچ کر وہ اس کے ساتھ اکیلے کمرے میں رہنے سے کترانے لگی تھی، اور

پھر یہ کھنسا تھا کہ وہ اس کا شوہر تھا، کچھ بھی ہو کیسے بھی ہو، نکاح نامے پر تو سائن اس نے کیے تھے ناں، شرعی جائز رشتہ تھا ان کا۔ مقصود سب چھوڑ چھاڑ دروازے کی سمت بڑھی، دروازہ کھولا وہاں حرا اور ڈالے کھڑی تھیں، اس نے دونوں کو اندر بلا لیا تھا۔

”ہم لوگ مکمل تیار ہیں، آپ لوگوں کو کتنا وقت لگے گا؟“ ڈالے نے بیڈ پر بیگ اور کچھ سامان بکھرا دیکھا۔
”تمہیں تو سب سے زیادہ جلدی ہے“۔ عارفین نے اپنی کلائی میں گھڑی باندھی اور والٹ جینز کی جیب میں ڈالا اور مسکراتے ہوئے ڈالے کو دیکھ رہا تھا۔

”ظاہری بات ہے ویسے ہی میری وجہ سے ہم لوگ اس قدر لیٹ ہو چکے ہیں، مقصود بھائی! آپ نے پیکنگ نہیں کی ابھی تک؟“ ڈالے نے بیڈ پر آ کر آرام سے بیٹھی تھی اور بیڈ پر بکھرے سامان کو اٹھانے لگی۔
”ہاں بس ذرا تھوڑی سی ہی رہ گئی تھی“۔ مقصود اپنے بیگ کی زپ بند کرنے لگی۔
”چلیں میں آپ کی ہیلپ کر دیتی ہوں“۔ اس نے وہ چھوٹا سائیک اٹھایا اور اس میں بیڈ پر بکھرے سامان کو اس بیگ میں رکھنے لگی تھی۔

”ارے ڈالے! رضا کے گرم کپڑے رکھے ہیں؟ وہاں دسمبر کے ماہ میں بہت ٹھنڈ ہوتی ہے“۔ عارفین نے شوڑہ پہنتے ہوئے فکر مند سی کہا۔
”جی عارفین بھائی! ثمرن بھائی نے رضا کا بیگ تیار کیا ہے۔“

”پھر تو فکر کی بات نہیں ہے، اچھا اور تم لوگوں نے اپنے گرم کپڑے وغیرہ رکھے، یہاں کراچی میں اس قدر ٹھنڈ ہے تو سوچو وہاں اسلام آباد میں کتنی ہوگی“۔ اس نے شوڑہ پہن لے لیے تھے۔
”اسی میں تو مزہ ہے عارفین بھائی! اچھی میری تو دلی مراد پوری ہوگئی، میری خواہش تھی کہ دسمبر کے ٹھنڈے موسم میں مری، کاغان، سوات کی سیر کروں وہاں کی سردی، برف باری.... جی بہت مزہ آئے گا“۔ حرا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی سب سے زیادہ وہ دونوں ایکسا پیٹنڈ ہو رہی تھیں۔

”یہ تو جب پتہ چلے گا جب وہاں جاؤ گی“۔ عارفین نے ہنستے ہوئے دونوں کو دیکھا تھا۔
”ارے بھی! اب تیار مکمل ہوگئی ہے تو چلو نکلیں، رات ہونے سے پہلے ہمیں وہاں پہنچنا ہے“۔ ثمرن، رضا کو لیے وہاں چلی آئی۔

”میں تو ریڈی ہوں ثمرن بھائی! یہ خواتین ہی باتوں میں اتنا نام لگا رہی ہیں۔“
”غور فرمائیے گا ثمرن بھائی! میرا خواتین کی لسٹ میں شمار نہیں ہوتا ہے، ابھی فی الحال“۔ حرا نے سب سے پہلے اس الزام سے خود کو بری الذمہ کیا تھا۔

”ہاں تم دو سال کی فیڈر پتی بے بی ہو جیسے، پاکی سے سوتا ہوا اٹھا کے لائے ہیں“۔ ڈالے نے چڑکرا کر کہا تھا۔
”اس میں کوئی شک نہیں ہے، ابھی میں ان میرڈ ہوں، تو اپنے مٹی، ڈیڈی کی چھوٹی سی بے بی ہی ہوں“۔ اس نے مزید ڈالے کو چڑایا۔

”ارے تو ہم کہیں اس چھوٹی سی بے بی کو لے جا کر غلطی تو نہیں کر رہے ہیں، کیوں عارفین بھائی؟“ اس نے ہنستے ہوئے عارفین کا نیو مانگا۔
”میرا تو خیال ہے میں اور مقصود تم سب کو لے جا کر غلطی کر رہے ہیں“۔ عارفین نے توجہ جلتی پرتیل کا کام کیا

تھا، اس کی طرف داری کرنے کے بجائے اپنا ہی راگ الاپا تھا، اپنے مطلب کی بات کہہ کر خود ہی زور سے ہنس دیا تھا کہ ڈالے کی شکل دیکھنے والی جو تھی۔
”عارفین بھائی! یہ چیخ!“ اس نے تپ کر ہاتھ میں جو پاؤڈر کا ڈبہ تھا وہ کھینچ کے مارا تھا، جسے اس نے بڑی مہارت سے کھینچ کیا تھا۔

”آپ تو اس لائق ہی نہیں ہیں کہ آپ سے بات بھی کی جائے“۔ وہ منہ بناتی پھر سے اپنے کام میں جت گئی۔
”اچھا سوری!“ وہ آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھے دونوں کان پکڑے چہرہ جھکا کے ڈالے کو دیکھا، ڈالے ہلکے سے ہنس دی، جس کا مطلب تھا ”اٹس اوکے“۔

”مگر ہاں آگے کی گارنٹی نہیں دے سکتا کہ میں تمہیں دوبارہ تنگ نہیں کروں گا۔“
”آپ ہیں ہی بدتمیز“۔ اس نے اپنی نازک ہتھیلی کا مکا بنا کے زور سے اس کے سر کی بازو پر جڑ دیا تھا۔
”ڈالے! ایک میری طرف سے بھی“۔ حرا نے ہانکا۔

”کیوں مجھے مقصود بھائی سے پٹوائے گی“۔ ڈالے نے حرا کو کہا، پھر مقصود کو دیکھا۔
”ایسے کیوں بول رہی ہو تم؟“ مقصود نے بے دھڑک بول دیا۔
”اس کا مطلب ہے آپ کو برا نہیں لگے گا۔“
”مجھے تمہاری کسی بات کا برا تو نہیں لگا“۔ وہ شاید کبھی نہیں تھی۔

”یعنی کہ یہاں آپ کے شوہر نامدار کی پٹائی ہو رہی ہے اور آپ کو بالکل برا نہیں لگ رہا؟“ عارفین نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔
”جی...!“ وہ بری طرح شیشا کے رہ گئی بلا سوچے سمجھے بول تو گئی، مگر اب آگے کیا بولے سمجھ نہیں آ رہا تھا، کیونکہ وہ اسے گھبر چکے تھے، وہ واقعی میں اس وقت گھبرا کر رہ گئی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ...!“ ڈالے اور حرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔
”عارفین بھائی! آپ کی مزہ بہت معصوم ہیں“۔ حرا کی ہنسی نہیں رک رہی تھی، لطف اندوز تو وہ خود بھی بہت ہو رہا تھا۔

”یہ تو ہے کہ محترمہ معصوم بہت ہیں۔“ وہ اٹھا تھا اور اس کے دلکش و گھبرائے چہرے کو اپنی آنکھوں میں قید کر لیا تھا۔
”اب بس بھی کرو بے چاری کینفوڈ ہوگئی ہے“۔ ثمرن اس کے پاس چلی آئی تھی۔

”کوئی بات نہیں، ہم میں رہیں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے“۔ ڈالے نے کہا۔
”خدا را بس اپنی طرف مت بنانا۔“
”عارفین بھائی...!“ ڈالے بری طرح چیخ پڑی کہ سب ہی پھر سے ہنس دیے تھے۔

☆.....☆.....☆
”وانی جان! کیا کر رہی ہیں آپ؟“ ریحان شیخ اس کے بیڈروم میں چلے آئے تھے۔
”السلام علیکم بابا! آپ کب آئے آفس سے؟“
”بالکل ابھی آیا ہوں اور سیدھا آپ کے کمرے میں آیا ہوں“۔ سائیڈ میں رکھی آئرن چیئر گھسیٹی اور اس پر

”آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا اور میں نے آپ کے آفس فون کیا تھا آپ کی سیکریٹری بتا رہی تھی آپ نے لُج بھی نہیں لیا آج کا۔“

”بس بیٹا! مصروفیت ذرا بڑھ گئی ہے۔“

”پھر بھی بابا! آپ نے اپنی صحت کا خیال رکھنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔“ ہلکی سی خفگی کے ساتھ دیکھنے لگی۔

”مگر مجھے خود سے زیادہ آپ کا خیال رہتا ہے، میری تو گزر گئی اب آپ کی فکر لاحق رہتی ہے۔“ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، اچھا رکھیں... نوری!“ اس نے پاس ہی بیٹھی نوری کو پکارا۔

”جاؤ بابا کے لیے کھانا میٹیں گرم کر کے لے آؤ۔“

”مگر پہلے میں ذرا فریش ہو جاؤں پھر کھالوں گا اور ابھی فی الحال مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔“ انھوں نے اشارے سے نوری کو جانے سے منع کرنے کے بعد وانیہ کو دیکھا۔

”ارے ایسے کیسے بھوک نہیں ہے، لُج نہیں کیا اور مجھے معلوم ہے کھانا بھی نہیں کھائیں گے، اس لیے آپ کو میرے سامنے ہی کھانا کھانا پڑے گا۔“ ضدی لہجے میں بولی۔

”لیکن...!“

”نہیں، اب لیکن ویکن کچھ نہیں چلے گی، جاؤ نوری! جلدی سے کھانا گرم کر کے یہیں لے آؤ۔“

”جی بہتر۔“ وہ کمرے سے چلی گئی۔

”آپ بھی اپنی ضدی ایک ہو۔“ انھوں نے شفقت سے اپنی بیٹی کو دیکھا وہ مسکرا دی۔

”اچھا ایک بات اور...! آج صبح عارفین کا فون آیا تھا، وہ سب لوگ یہاں سیر و تفریح کے لیے آ رہے ہیں۔“

”ج... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“ وانیہ دلی خوشی سے بولی چہرے پر خوشی کے واضح رنگ جھلک رہے تھے۔

”ہاں وہ تو کہہ رہے تھے کہ ہوٹل میں رکیں گے، مگر میں نے منع کر دیا کہ جب یہاں ہمارا گھر ہے تو ہوٹل جانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”عارفین بھائی بھی ناں... کبھی کبھی بہت فارل ہو جاتے ہیں، یہ بھلا کیا بات ہوئی، ہم کتنے دنوں سے ان کا انتظار کر رہے ہیں، دیکھیے آئے دیں انھیں اچھی طرح کلاس لوں گی۔“

”چلیں ٹھیک ہے اب ایسا ہے کہ دونوں کمرے کھلو کے صفائی وغیرہ کروادیں، وہ لوگ شاید اب تو پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“

”بابا! آپ مجھے صبح ہی فون کر دیجئے۔“

”تو پھر اپنی بیٹی کے چہرے پر یہ اچانک سے پھوٹی خوشی کیسے دیکھ پاتا؟“ انھوں نے وانیہ کا مسکراتا چہرہ دیکھا تھا۔

”یہ تو ہے، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے، مگر بابا! بہت مزہ آئے گا ہمارے گھر میں بھی خوب رونق لگے گی، بابا! میں انھیں ایک ماہ سے پہلے تو بالکل جانے نہیں دوں گی۔“ ریحان شیخ ہنس دینے۔

”یہ تو اب عارفین ہی آ کر بتائیں گے کہ وہ کتنے دن کے لیے یہاں رکیں گے۔“

”وہ چاہے کچھ بھی کہیں مگر میں انھیں ایک ماہ سے پہلے نہیں جانے دوں گی۔“ اسی دوران نوری بھی کھانا گرم کر کے لے آئی تھی، کھانے کی ٹرے اس نے ٹیبل پر رکھ دی، اور اس چھوٹی سی کچ کی ٹیبل کو ریحان شیخ کے آگے کھکا دیا۔ وانیہ نے ہاتھ بڑھا کے سائڈ سے اپنی بیساکھی اٹھائی تھی۔

”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ وانیہ کو اٹھتے دیکھا تو کہا۔

”بابا! کمروں کی صفائی کرواؤں گی۔“

”تو آپ نوری کو بتا دیجیے، وہ کر دے گی۔“

”نہیں بابا! میں خود اپنی نگرانی میں کرواؤں گی، کسی چیز کی کمی نہیں ڈینی چاہیے، عارفین بھائی کی مسز اور ان کی کزنز پہلی بار ہمارے گھر آ رہی ہیں، میں چاہتی ہوں انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، وہ یہاں سے بہت خوش ہو کر جائیں کہ پھر دوبارہ سے آنے کی خواہش ہو۔“

”اوہ مائی گاڈ! ریحان شیخ ہولے سے ہنس دینے۔“

”آپ تو کام سے نکلیں... اب یقیناً مجھے آپ سے بات کرنے کے لیے اپائنٹ لیڈنا پڑے گا۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر دے اسی پر ریحان شیخ ہنسے تھے۔

”جی نہیں میرے پیارے سے بابا کو مجھ سے اپائنٹ لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی، کیونکہ آپ بھی آفس سے چھٹی لے رہی ہیں، ہمارے ساتھ فل انجوائے کرنے کے لیے۔“

”ارے نہیں وانی بیٹا! یہ غضب بھی مت کریئے گا۔“ انھوں نے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کی جس پر وہ مسکراتے ہوئے نوری کو لیے کمرے سے باہر نکلے گئی۔

”مگر میں پھر یہاں اکیلے کیا کروں گا، نوری! ایک کام کرو، یہ ٹرے وہاں ڈائننگ ٹیبل پر رکھو، میں فریش ہو کر واپس آ رہا ہوں۔“ انھوں نے نوری کو آواز دی تھی، نوری ان کے حکم کی پاسداری کرتے ہوئے ٹرے اٹھا کے باہر نکلی تھی۔

کوئی ایک گھنٹہ لگا کر وانیہ نے اپنی نگرانی میں دونوں کمروں کو شیشے کی طرح چمکا دیا تھا، ضرورت کی ہر شے وہاں رکھوا دی تھی، کہ ان لوگوں کو کسی شے کے لیے پریشان نہ ہونا پڑے۔

اتنے میں ایک بڑی سی گاڑی ان کے دروازے کے باہر آ کر کھڑی تھی، ریحان شیخ سمجھ گئے عارفین اپنی فیملی کو لے کر آ گیا تھا، انھوں نے اندر کا دروازہ کھولا، چونکدار مین گیٹ کھول چکا تھا عارفین اپنی گاڑی اندر لا رہا تھا، پورچ میں گاڑی لا کر روکی سب آرام آرام سے نیچے اتر رہے تھے۔

”السلام علیکم! ایک بہت ہی پیاری سی چھوٹی سی کم عمر لڑکی ان لوگوں کے پاس آئی تھی، سب نے کورس میں آہستہ سے ولیم السلام کا جواب دیا تھا۔“

”کیسے ہیں آپ لوگ؟“ وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔ کتنی پیاری تھی وہ نازک سی شیشے کی طرح کوئی کی نہیں لگ رہی تھی، مگر اس کی بے ساختگی دیکھ کر مقصود کو بہت دکھ ہوا تھا، معصوم سا دلکش ساجن کدنی رنگت برنین کٹورے جس میں بے پناہ خوشی اٹھانے کے جھلک رہی تھی، فنکرنی لب جس پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اس کی سب سے خوبصورت صراحتی دار گردن جس پر ایک قل واضح اس کی خوبصورتی کو بڑھا گیا تھا، بلاشبہ بہت پرکشش شخصیت کی مالک تھی، مکمل ترین لڑکی مگر اس کی بے ساختگی نے جیسے چاند میں گر بن سا لگا دیا تھا۔

”بالکل ٹھیک، تم سناؤ کیسی ہو؟“ عارفین نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”وای بیٹا! حال احوال اندر آ کر پوچھ لیجئے گا، وہ لوگ سفر سے تھکے ہوئے آئے ہیں۔“ ریحان شیخ نے یہی اسے احساس دلایا تھا۔

”اوہ آئی ایم سوری، میں اپنی خوشی میں اس قدر ایکسائینڈ ہو گئی کہ اندر آنے کا بھی نہیں کہا۔“ وہ دل بھر کے شرمندہ ہوئی تھی۔

”ارے کوئی بات نہیں اور جس قدر تم ایکسائینڈ ہو رہی ہو، یہی حال کچھ یہاں بھی ہے۔“ ثمرن نے اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے ڈالے اور حرا کی طرف اشارہ کیا تھا، جس پر وہ دونوں وانیہ کو مسکرا کر دیکھنے لگیں۔

”آج بہت ٹھنڈ ہے، آپ سب لوگ اندر آ جائیں۔“ ریحان شیخ کے ہمراہ وہ سب اندر آئے تھے۔

”آپ لوگ لمبے سفر سے آئے ہیں تھک گئے ہوں گے کچھ دیر آرام کر لیں، میں اتنے میں آپ لوگوں کے لیے مزید آرکھانا بناتی ہوں اور ساتھ بڑھو بھی۔“ وانیہ اس قدر خوش ہو رہی تھی کہ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ لوگ پہلی بار ان کے گھر آئے ہیں، وہ جو کچھ دونوں سے ڈینی خلتشار کا شکار تھی، ڈینی وجسمانی اذیت میں مبتلا تھی، اس وقت کچھ بھی یاد نہیں تھا وہ سب بھول کر خوش ہونا چاہتی تھی، ان لوگوں کے ساتھ پل پل کو انجوائے کرنا چاہتی تھی، یہ خوشیاں مٹی میں قید کرنا چاہتی تھی۔

”اصل میں بابا نے بتایا ہی ابھی کچھ گھنٹے پہلے ہے کہ آپ لوگ آرہے ہیں، اگر صبح سے پتہ چلتا تو میں بہت کچھ اچھا سا مزید آرکھانا بنا کر رکھتی۔“

”ویسے بہت اچھا کیا جو انکل نے نہیں بتایا، ورنہ تمہارے چہرے پر یہ اچانک سے پھوٹی خوشی کیسے دیکھ سکتے تھے؟“ عارفین نے بھی ریحان شیخ کی بات کی تھی۔

”اور آپ وانیہ! اتنا پریشان بھی مت ہوئیے، کیونکہ ہم کوئی مہمان وغیرہ نہیں ہیں۔“ ڈالے نے بھی جھٹ کہا تھا۔

”جی ہاں وانیہ! یہ مہمان نہیں بلکہ وہاں جان ہیں۔“ عارفین نے ہلکے سے ہنستے ہوئے کہا۔

”اللہ عارفین بھائی! ایسا مت بولیں۔“ وانیہ نے فوراً کہا مبادا وہ برائے مان جائے، کیونکہ ڈالے بری طرح عارفین کو گھور رہی تھی۔

”آئی سوئیر ڈالے! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”ارے وانیہ! آپ پریشان مت ہوئیے یہ تو عارفین بھائی کی عادت ہی ایسی ہے جب تک مجھے تنگ نہ کر لیں، انھیں پانی بھی پتھم نہیں ہوتا۔“ ڈالے نے عارفین کو گھورنے کے بعد پریشان سی وانیہ کو دیکھا تھا۔

”عارفین بھائی! بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے، وہ بے چاری ویسے ہی پریشان ہو رہی ہے آپ اپنی فضول گفتگو سے مزید پریشان کر رہے ہیں، وانیہ! آپ کو پریشان ہونے کی فطری کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر کھانا کا مسئلہ ہے تو ہم سب مل کر بنائیں گے۔“ ڈالے اٹھ کر وانیہ کے پاس آئی تھی، جس پر عارفین کی نہ ختم ہونے والی کھانسی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

”اب آپ یہ بھی بتا دیں کہ ہم سب میں کون کون شامل ہے، کیونکہ جہاں تک میرے علم میں ہے آپ کو تو اٹھ تک ابلانا نہیں آتا۔“ حرا نے چٹکا چھوڑا۔

”کیوں نہیں، جی! ہم سب میں تم موثرن بھائی، مقوم بھائی اور ابھی وانیہ نے کہا وہ ایک اچھی کوک ہیں۔“

”عارفین! وہ اسی ڈھٹائی سے کونش بجالائی جیسے اس کی تعریف کی گئی ہو۔“

”ایڈ بائے داوے ہماری ڈالے بی بی کیا کام سرانجام دیں گی اس دوران؟“ عارفین نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”میں ظاہری بات ہے اپنے بیٹے رضا کو سنبھالوں گی۔“

”ٹھیک ہے کام نہ کرنا ہو تو بچہ سنبھال لو۔“

”ارے تو آپ یہ ٹپ مقوم بھائی کو دیں۔“ ڈالے نے منہ بھاڑ کے مشورہ دیا تھا۔ مقوم تو بری طرح شینٹا کر رہ گئی، عارفین اس کے چہرے کی لالی سے محظوظ ہوا، مسکرا کر رہ گیا، جبکہ حرا اور ثمرن نے بری طرح اس کو گھورا تھا۔

”ذرا شرم نہیں ہے اس لڑکی میں، کم از کم دیکھ تو لیا کرے، انکل بھی کیا سوچتے ہوں گے۔“ نہایت دھیمی سرگوشی میں حرا نے ثمرن سے کہا تھا، اس کی دھیمی سرگوشی اس ماحول کی خاموشی میں سب نے سنی تھی، ڈالے کو احساس ہوا تھا اپنے کہے گئے جملوں کا، وہ بے دھڑک ہر بات کہہ جاتی تھی، زبان دانوں میں دبائے سر جھکا گئی۔ ریحان شیخ مسکرا دیئے بہت خوشی ہوئی تھی انھیں ان لوگوں سے مل کر، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسی گھر کا حصہ ہیں۔

”ویری گڈ! مجھے بہت خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر، میں اور وانیہ تو خواہ مخواہ ہی اتنا گھبرا رہے تھے، کہ جانے آپ سب یہاں ایڈ جسٹ کر پاؤ گے بھی یا نہیں۔“ اور ڈالے کے سر پر درست شفقت سے ہاتھ دھر رہا تھا۔

”اب ایسا ہے کہ بچن میں بیکانے کی ہر شے موجود ہے، فروٹس بھی ہیں، ڈرائی فروٹس بھی ہیں جو دل چاہے کھائیں اور پکائیں اور کھلائیں جی چونکہ میں کھانا کھا چکا ہوں، مگر ڈالے جو بنائیں گی میں صرف وہ کھاؤں گا، حالانکہ بھوک بالکل نہیں ہے، مگر ڈالے بیٹا! آپ کچھ بھی بیکانے کے اپنے انکل کو کھلائیں میں تیار ہوں۔“

”انکل! آپ بھی...! ڈالے کا چہرہ فق ہو کر رہ گیا تھا۔

”وہ کیا ہے ناں مائی سوئٹ چائلڈ! کہ سب ایک طرف تو میں نے سوچا میں اکیلا رہ کر کیا کروں گا، میں بھی ان کا ساتھ دوں، وہ مثال ہے ناں کہ گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو۔“ ریحان شیخ بہت عرصے بعد آج اچھے موڈ میں تھے، جبکہ عارفین زور سے ہنسا تھا۔

”بابا! وہ ہماری گیسٹ ہیں اس طرح مت بولیں، وہ مائنڈ کر جائیں گی۔“ وانیہ نے دھیرے سے کہا مگر پھر بھی سب نے سن لیا تھا۔

”ارے نہیں وانیہ! مجھے بالکل برا نہیں لگ رہا، ریحان انکل میرے پاپا کی طرح ہیں مجھے ان کی کوئی بات ناگوار نہیں لگے گی۔“ ڈالے نے وانیہ کا ہاتھ پکڑا اور یقین دلانے والے انداز میں اسے دیکھا۔

”دیکھا میں نے آپ لوگوں سے کہا تھا ناں کہ ہماری ڈالے نے ڈھٹائی کے سارے ریکارڈ توڑے ہیں۔“ حرا فوراً بول پڑی۔

”جی ہاں، میں نے ڈھٹائی کے ریکارڈ توڑے ہیں تم ڈھٹیوں کی سردار ذرا خود اپنی تعریف بھی کر لو۔“ ڈالے کہاں چپ رہنے والوں میں سے تھی، ساری فاریٹی ایک طرف کیے میدان میں کود پڑی۔

”تعریف اس خدا کی جس نے مجھ جیسا حسین مجسمہ شاہکار بنایا۔“

رداؤ انجسٹ 23 اپریل 2014ء

رداؤ انجسٹ 22 اپریل 2014ء

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

”او کے کرلیا میں نے یقین، اب اس کے کو چھوڑیے اور ہمارے شہر اسلام آباد کا پر کرکھائیے اور بتائیے کیا ہے؟“ اس نے بات کا رخ ہی بدل دیا تھا، شاید کچھ ایسا تھا جو وہ اس سے شیزہ نہ کرنا چاہتی تھی، مقوم نے اس کا چہرہ دیکھا اس کی براؤن آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا ہے۔

”کھائیے...!“ عارفین نے مسکرا کر ٹرے کی سمت اشارہ کیا، مقوم نے برگر اٹھایا اور ایک بانٹ لیا۔

”کیا ہے؟“

”ہوں... لذیذ!“ وہ نظروں کا رخ ہی پھیر گئی تھی، دل اندر سے مرجھا کے رہ گیا تھا کسی منظر کی شے میں اب دل ہی نہیں لگ رہا تھا اور عارفین یہ نوٹ کر چکا تھا، پھر سب اپنے اپنے رومز میں چلے گئے تھے، اگلے دن سب نے شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا۔

☆.....☆.....☆

عارفین نے ڈالے، وانیہ اور نوری کو مال کے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔

”او کے تم جاؤ اور جلدی آنے کی کوشش کرنا، بلکہ ڈالے ایوں کرنا مجھے کال کر لینا، میں تم لوگوں کو خود لینے آ جاؤں گا۔“

”نہیں عارفین بھائی! ہم آ جائیں گے اور کون سا دور ہے یہ دو قدم پر ہی تو ہے۔“ وانیہ نے سہولت سے انکار کیا تھا۔

”او کے مگر پلینز جلدی!“

”اور ایک ریکویسٹ اور کہ ٹائم زیادہ مت لگانا مجھے امید تو نہیں ہے کیونکہ شاپنگ کی ایک اور شوقین وانیہ تمہارے ساتھ ہے مگر پھر بھی کہوں گی جلد از جلد شاپنگ کر لینا کیونکہ آج ٹھنڈ بھی بہت ہے گھر جلدی چلیں گے رات کا کھانا گھر ہی کھائیں گے۔“ ثمرن نے دونوں کو باری باری دیکھا تھا۔

”جو حکم سرکار!“ ڈالے کو نشہ بجالاتی تھی۔

”ثمرن بھائی! اس کے حکم سرکار کہنے اور عمل کرنے میں بہت تضاد ہے۔“ مقوم نے بھی ڈالے کو پیار سے دیکھا تھا۔

”بہت خوب... ہماری مقوم بھائی تو بہت سمجھدار ہیں، بلکہ یوں کریئے آپ بھی ہمارے ساتھ ہی چلیئے۔“

”ناں بابائیں، قطعی نہیں۔“ اس نے تو کان ہی پکڑ لیے۔

”تو یوں کہیے ناں کہ میاں کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتیں کہیں کسی حسین دوشیزہ کے حسن میں نہ الجھ جائیں۔“ انداز سوسفید ستانے والا تھا۔

”عارفین بھائی! گاڑی اشارت کریں کیونکہ اگر یہ اشارت ہوگئی تو چپ کرانا مشکل ہو جائے گا۔“ حرا نے مزید اسے آگے کچھ بولنے سے پہلے نوک دیا وہ ایسی ہی ہوگئی تھی، بے باک سی، زبان پر تو جیسے خندق تھا جو منہ میں آتا بول دیتی۔

”او کے بابا! ہم ہی جا رہے ہیں۔“ ڈالے مال کی سمت بڑھ گئی اور عارفین نے اپنی گاڑی بالکل برابر میں لگی پھولوں کی ایکریشن کے قریب روک دی تھی۔ کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا ہوگا ان لوگوں کو گھومتے گھومتے، مگر ابھی تک دونوں کو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

”وانیہ یہ کلر دیکھو!“ ڈی پرلکا شہنیل کا ہائل گرین اینڈ گولڈن امتزاج کا سوٹ بہت حسین لگ رہا تھا اس

”خوش نہیں کی بھی ہوتا ہے۔“ ڈالے نے حرا کے بازو پر ایک چٹنی بھری۔

”اچھا مگر عارفین بھائی نے تو کبھی نہیں بتایا۔“ وہ گرین کالج میں حیرانگی ساتے ہوئے بولی۔

”ارے کیا نہیں بتایا میں نے؟“ عارفین ایک ٹرے ہاتھ میں لیے چلا آیا جس میں دو برگر ساتھ فنگر چیس، مایونیز، کچپ رکھا تھا۔

”یہی کہ مقوم بھائی کی زیادہ تر زندگی لندن میں گزری ہے۔“ اس نے عارفین کے ہاتھ سے ٹرے لی تھی۔

”ریٹل... مجھے بھی آج اس وقت پتہ چلا ہے کہ مقوم لندن میں رہتی تھیں۔“ عارفین کی آنکھوں میں حیرانگی در آئی تھی۔

”زیادہ بھولے بننے کی ضرورت نہیں ہے، آپ ایک نمبر کے چپے رستم ہیں، جیسی میں سوچوں انما یک برنس کے بہانے سے لندن کیوں بھاگے جاتے تھے؟“ اس نے ایک برگر اٹھایا اس میں مایونیز و کچپ ڈال کے فنگر چیس اٹھائی اور ٹرے مقوم کے ہاتھ میں تھما دی، اس نے ایک بانٹ کھایا۔

”مگر میری ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جس دن آپ لندن گئے تھے اتفاق سے اسی دن رابعہ پھپھو نے بتایا تھا کہ وہ آپ کے لیے ایک خوبصورت سی لڑکی پارٹی میں دیکھ کر آئی ہیں، یا رابعہ کیا قصہ ہے بھی؟“ اس نے فنگر چیس منہ میں ڈالی تھی۔

”اف... تمہاری میموری پاور تو کمال کی ہے اب ایک کام کرو، اسے اٹلے سیدھے کاموں میں ضائع مت کرو، ثمرن بھائی تمہیں ملارہی ہیں، رضا رو رہا ہے جا کر اسے دیکھو۔“ عارفین نے جان بوجھ کر اسے وہاں سے ہٹایا تھا، مگر دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی داد دیئے بغیر بھی نہ رہ سکا تھا، مگر اس وقت اس کی ذہانت کسی کے لیے مسئلہ پیدا کر سکتی تھی، کیونکہ وہ مقوم کا سپید پڑتا چہرہ دیکھ رہا تھا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ ہی گھبراہٹ تھی۔

”اوہ وہ عارفین بھائی! اتنی باتیں بتائیں یہ نہیں بتایا کہ رضا رو رہا ہے۔“ وہ رضا کا سن کر بوکھلا کر رہ گئی، الٹا اسے الزام دھرتی تیزی سے آگے بڑھی تھی، اس کے جانے کے بعد عارفین نے مقوم کا چہرہ بغور دیکھا تھا جہاں اس وقت بھی ایک لمبیر سایہ سا تھا۔

”مقوم! آریو آل رائٹ؟“ عارفین نے بے ساختہ اس کے نازک شانے پر اپنی مضبوط پتیلی دھری تھی، بمشکل وہ سیاہ آنکھیں اوپر کو اٹھیں جہاں ایک گہرا سناٹا تھا۔

”مقوم! مجھے لگتا ہے آپ کو کوئی پریشانی ہے کوئی بات ہے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے، پلینز اپنے اس دوست کو نہیں بتائیں گی؟“ مقوم نے خود کو ریلیکس کیا پھر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”نن... نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ نگاہیں چرانے لگی۔

”شیور...؟“ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا اس کا نظریں چرانا اسے شک میں ڈال گیا تھا، اس کے لب و لہجے کی لڑکھراہٹ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔

”جی...!“

”مقوم! اگر کوئی ایسی بات ہے تو مجھ سے شیزہ کر لیجیے کیا پتہ میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔“

”آ... آپ... آپ کو یقین کیوں نہیں آ رہا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ ٹھوڑا زچ ہوگئی تھی، عارفین نے بغور اس کا چہرہ جانچا تھا۔

کے گلے اور آستین پر نہایت حسین و نازک کام کیا گیا تھا، جبکہ گولڈن دوپٹے کے چاروں طرف شہیل کی چوڑی پنّی کے ساتھ کڑھائی کی گئی تھی۔

”زبردست یارا“ وانیہ کو بھی بہت پسند آیا تھا۔

”ایک کام کرتے ہیں ہم دونوں ایک جیسا ہی سوٹ لے لیتے ہیں چلو آؤ اندر چلیں“۔ وہ تینوں اندر شاپ میں آ گئی تھیں۔

”سوری میم! یہ بوتیک ڈیزائن ہے تو ہم ایک ہیں بنواتے ہیں“۔ دوکاندار نے معذرت کی۔

”تو آپ ارنج نہیں کر سکتے کہیں سے؟“ ڈالے کو اتنی مشکل سے وہ ایک سوٹ پسند آیا تو وہ بھی ایک ہی پنّیں تھا۔

”نہیں سوری میم! مگر ہاں اگر آپ آرڈر پہ بنوائیں تو پاسیبل ہے۔“

”نہیں ہمیں تو ابھی چاہیے تھا“۔ ڈالے کا چہرہ اتر گیا۔

”ڈالے! تمہیں پسند آ رہا ہے تم لے لو یہ سوٹ“۔ وانیہ سے اس کی اداسی دیکھی نہیں گئی۔

”کیوں تمہیں پسند نہیں آ رہا کیا؟“

”نہیں مجھے بھی بہت پسند آ رہا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے ہو گیا فیصلہ، لیکن گے تو دونوں ایک جیسا رہنے نہیں۔“

”اچھا آپ ایک منٹ رکھیے!“ دوکاندار ایک شاپرے لے کر آیا اور اس میں سے ایک سوٹ نکالا تھا بالکل اس جیسا ہی تھا صرف کلر رائل بلیو اور کڑھائی میں تھوڑا جینچ تھا۔

”یہ دیکھیے یہ ایک کیمپل کے طور پر آیا تھا، مگر آپ کو کتنا پسند آیا کہ مجھے آپ کو یہ سوٹ نکال کے دکھانا پڑا۔“ دوکاندار نے وہ سوٹ ان دونوں کی طرف بڑھایا تھا۔

”وانیہ! یہ بھی بہت خوبصورت لگ رہا ہے اب تم مجھے بتاؤ تم ان دونوں میں سے کون سا لوگو؟“

”تمہیں کون سا اچھا لگ رہا ہے؟“

”مجھے تو دونوں پسند آ رہے ہیں؟“

”تو پھر ٹھیک ہے میں بلیو لے لیتی ہوں تم گرین لے لو“۔ وانیہ نے مسکرا کر کہا۔

”اوکے ڈن!“ وہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

”آپ ان دونوں سوٹوں کو بیک کر دیں“۔ ڈالے نے وہ دونوں سوٹ پیک کر والے اور شاپرے نوری کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اسی طرح گھومتے ہوئے ایک گھنٹہ اور صرف ہو گیا اس دوران دونوں نے کچھ جیولری پر فیوز وغیرہ لیے بلکہ وانیہ نے اپنی طرف سے سب کو دینے کے لیے گفٹ خریدے وہ کچھ شو پیسز وغیرہ دیکھ رہی تھیں کہ وانیہ کا فون بجائے اس نے ریسیو کیا تھا۔

”السلام علیکم بابا!“

”جیتتی رہو، کہاں ہو آپ لوگ؟“ دوسری طرف ریحان شیخ تھے۔

”بابا! میں اور ڈالے تو شاپنگ مال میں ہیں جبکہ عارفین بھائی ان لوگوں کو لے کر پاس ہی پھولوں کی ایگزیشن میں لے کر گئے ہیں۔“

”اوکے میں وہیں مال میں آ رہا ہوں، آج آفس میں کام سے جلدی فارغ ہو گیا تھا تو سوچا آپ لوگوں کے

ساتھ ڈنر پار کیا جائے۔“

”اوکے بابا! آپ یہاں آ جائیے۔“ اس نے خوش دلی سے آفر کی۔

”اوکے بیٹا! اللہ حافظ!“ انھوں نے موبائل آف کر دیا تھا۔

”کیا ہوا کس کا فون تھا؟“ برابر میں کھڑی ڈالے شو پیس ہاتھ میں لیے بولی۔

”بابا کا فون تھا، وہ ہمیں جوائن کر رہے ہیں، تھوڑی سی دیر میں۔“

”ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے مزہ آئے گا۔“ وہ بھی بہت خوش ہوئی تھی، ریحان شیخ پر نئی طور پر اسے بہت پسند آئے تھے، بالکل اپنے بابا اور بڑے بابا کی طرح۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر ریحان شیخ ابھی تک نہیں آئے تھے، وہ دونوں انتظار کر رہی تھیں۔

”وانیہ! تم تھک گئی ہوگی ناں، پتہ ہے ہمیں گھومتے گھومتے تین گھنٹے گزر گئے ہیں، شاپنگ میں اور باتوں میں کب وقت گزرا پتہ ہی نہیں چلا، اب ایک کام کرتے ہیں، چلتے ہیں۔“ ڈالے کو بہت شدت سے وانیہ کی تھکن کا احساس ہوا تھا وہ بے چاری بیساکھی کے سہارے کتنا پیدل چلی تھی، کیا پتہ وہ مردت میں کچھ نہ کہہ رہی ہو مگر مجھے تو احساس کرنا چاہیے تھا۔

”ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ چہرے پر واضح تھکن کے آثار تھے جنہیں وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”بس اب ہم چلتے ہیں، ریحان انکل کو فون کر دیتے ہیں کہ وہ پھولوں کے فیشیول میں آ جائیں۔“ اتنا کہا ہی تھا کہ نگاہ اچانک اوپر اٹھی۔

”ارے وہ دیکھو ریحان انکل... وہ ہمیں اوپر ڈھونڈ رہے ہیں، وانیہ! تم ایک کام کرو تم نوری کے ساتھ جاؤ میں ریحان انکل کے ساتھ آتی ہوں۔“

”چلو ٹھیک ہے میں واقعی بہت تھک گئی ہوں، بیڑھیاں چڑھنے کی تو بالکل ہمت نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور نوری کو لیے مال سے باہر جانے والے راستے کی سمت بڑھ گئی، ڈالے اوپر ریحان شیخ کی طرف بڑھی تھی۔

وانیہ، نوری کے ہمراہ مال سے باہر نکل گئی تھی، ڈالے نے انھیں ایک نظر دیکھا، اور اوپر کی سمت قدم بڑھا دیئے تھے۔

وہ دونوں پانچ منٹ کے اندر ہی پھولوں کے فیشیول تک آ گئی تھیں، عارفین ان لوگوں کو لے کر باہر آ گیا تھا، پہلی نظر وانیہ پر ہی پڑی تھی۔

”اوہ... شکر ہے آج کی تاریخ میں تم لوگوں کی شاپنگ مکمل ہوئی۔“ حرا نے شکرانہ پڑھتے ہوئے متلاشی نگاہ ادھر ادھر دوڑائی تھی۔

”وانیہ! ڈالے کہاں ہے؟“

”وہ اصل میں بابا بھی وہیں آ گئے تھے تو وہ ان کے ساتھ آ رہی ہے، ہم واپس آ گئے۔“ اچانک سے اسے زور کا چکر آیا تھا اس نے سہارے کے لیے گاڑی پر ہاتھ رکھا تھا، ٹھن تیزی سے آگے بڑھی تھی۔

”وانیہ! تم ٹھیک ہو؟“ اس نے رضا کو حرا کو دیا اور وانیہ کو تھاما تھا، عارفین نے بھی فکر مندی سے اسے دیکھا تھا۔

”جی ٹھن بھابی! میں ٹھیک ہوں شاید تھک گئی ہوں۔“

ہاں تو ظاہر ہے 4/3 شے شاپنگ کے لیے اتنا چلی ہو تو کھولی ہی اور اس لڑکی کو دیکھوا بھی تک دل نہیں صرا اس کا شاپنگ سے، مجھے یقین ہے اب وہ انکل کو بھی خوب گھمائے گی۔ شرن نے برہمی سے کہا۔
اسی دوران اتنی زوردار دھماکے کی آواز گونجی تھی ہی دیر تک کان جیسے سن ہو کر رہ گئے ہوں، دل تھم سا گیا تھا، کچھ بھی نہیں آیا یہ ہوا کیا تھا، سب آس پاس کے لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، گویا چند ہی سیکنڈ میں ایک پلچلی سی گج گئی تھی، وہاں ایک کھرام سا رہا ہو گیا تھا، عارفین کے دماغ نے تیزی سے کام کیا تھا۔
”یہاں بم بلاسٹ ہوا ہے جلدی کرو، گاڑی میں بیٹھو۔“ عارفین نے ان لوگوں کو جلدی جلدی گاڑی میں بٹھایا تھا اور گاڑی کے دروازے اچھی طرح لاکڈ کر دیے۔

”عارفین! ڈالے۔“ شرن ہی نہیں حرا اور مقوم کو بھی ڈالنے کی فکر ستانے لگی۔
”وانیہ تو بول رہی ہے وہ ریحان انکل کے ساتھ آ رہی ہے، وانیہ! تم نے دیکھا تھا ناں ڈالے کو ریحان انکل کے ساتھ؟“ عارفین نے پیچھے پلٹ کر جلدی سے وانیہ سے پوچھا۔
”جی عارفین بھائی! وہ میرے سامنے بابا کے پاس گئی تھی۔“

”پھر ٹھیک ہے ریحان انکل بہت ذمے دار ہیں، وہ سمجھ گئے ہوں گے اس نوعیت کو اور شاید وہ تو اب تک نکل بھی چکے ہوں گے۔“ عارفین نے گاڑی اشارت کی۔
”عارفین! مجھے تسلی نہیں ہو رہی تم فون کرو۔“ شرن کا دل بہت بے چین ہو گیا تھا، دل بیٹھا جا رہا تھا، وہ ڈالے کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھنا چاہتی تھی۔ عارفین نے گاڑی چلاتے ہوئے اپنا موبائل نکالا مگر بد قسمتی کہ موبائل سروس آف جا رہی تھیں۔

”اوہ شٹ۔۔۔ نیٹ ورک کام نہیں کر رہا۔“ اس نے تیزی سے اسٹیمزنگ کو گھمایا۔
”وانیہ! تم نے دیکھا تھا ناں ڈالے ریحان انکل کے ساتھ تھی ناں؟“ حرا ایک بار پھر اپنی تسلی چاہ رہی تھی۔
”جی حرا! وہ میرے سامنے بابا کے پاس اوپر جا رہی تھی۔“ اس کا خود کا دل بھی بری طرح گھبرا رہا تھا وہ خود گھٹی فیل کر رہی تھی وہ خود کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھی یا تو وہ ڈالے کو زبردستی اپنے ساتھ لے کر آتی یا پھر اسی کے ساتھ ہی رہتی۔

”پتہ نہیں میرا دل کیوں اس قدر گھبرا رہا ہے، ڈالے بہت بے وقوف ہے اتنی دیر لگانے کی کیا ضرورت تھی، آجائے یہ میرے سامنے آج، اس کی اچھی طرح کلاس لیتی ہوں۔“ لب و لہجہ میں فکروم کے ساتھ غصے کا عنصر بھی شامل تھا۔

”میں تم لوگوں کو گھر چھوڑ دوں پھر دوبارہ یہاں واپس آ جاؤں گا۔“ عارفین کو ان لوگوں کی بھی فکر بہت ہو رہی تھی اور سب سے زیادہ رضا کی جو اس زوردار دھماکے کی آواز سے بری طرح زور رہا تھا۔
”پاگل ہوئے ہو کیا، حالات دیکھ رہے ہو کس قدر خراب ہو گئے ہیں، میں نہیں واپس نہیں آنے دوں گی اور کیا پتہ وہ ریحان انکل کے ساتھ اب تک گھر بھی پہنچ چکی ہو؟“ شرن نے اسے گھر کا اور پھر روتے ہوئے رضا کو چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔

دھماکا تازہ زوردار تھا کہ شاپنگ مال کی کالچ کی دیواریں ٹوٹ گئی تھیں، شاہس کا سامان ادھر سے ادھر بکھرا گیا تھا، وہ اس اچانک بگڑتی رفتار پر بری طرح گھبرا کر رہ گئی تھی، لوگ چیخ چلا کے ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے بھاگ رہے تھے، ہر کوئی اپنی جان بچانے کے در پے تھا کیونکہ بم بلاسٹ یہیں شاپنگ مال کے اندر ہوا تھا، لوگوں کا جم غیر اوپر سے

آگ پھیل چلی جا رہی تھی، وہ تو رونے والی ہو گئی تھی آج اس کا شاپنگ کا شوق اسے بہت مہنگا پڑا تھا، آج اپنے اس شوق سے اسے حد درجہ نفرت ہوئی تھی، کیا کرے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ بے سمت راستے کی جانب بڑھنے کی کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، ریحان انکل بھی جانے کہاں کھو گئے تھے وہ تو اب باقاعدہ رونے ہی لگی تھی۔
”ڈالے۔۔۔!“ جانی بیچانی کھیر آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور اپنی قسمت پر جتنا ماتم کرتی کم تھا، مگر یہ وقت نہ تو ماتم کرنے کا تھا نہ کچھ سوچنے سمجھنے کا وہ تیزی سے اس شناسا چہرے کی طرف بڑھی اور اس کے سینے سے لگی تھی۔
”زر میل۔۔۔!“ اور زر میل کے پاس بھی بالکل وقت نہیں تھا کہ اسے چپ کروائے یا کچھ پوچھے کیونکہ اس وقت حالات کی بگڑتی نوعیت اس بات کی قطعی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

”نکلو جلدی یہاں سے۔“ وہ تیزی سے اسے لیے دوسرے راستے سے باہر نکلا اور گاڑی میں اسے بٹھا کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی چند ہی منٹ میں وہ فل اسپید ڈرائیونگ کرتا ہوا اس امریہ سے باہر نکلا اور اسے اپنے ساتھ اس ہوٹل میں لے گیا جہاں وہ خود رہا تھا اس دوران وہ مستقل رونے میں ہی مصروف رہی تھی، وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت ڈر و خوف کے زیر اثر ہے۔

اسے بندر آرام سے بٹھا کے فریج سے اورنج جوس کا گلاس نکال کے اسے پلایا، آدھے گھنٹے میں وہ تھوڑا سیٹ ہو گئی تھی، مگر گرین کالچ میں ابھی بھی نمی زینت بنی ہوئی تھی۔
”کیا کر رہی تھیں تم وہاں اکیلی؟“ وہ چیئر اس کے پاس لایا اور اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔
”شاپنگ کرنے آئی تھی۔“

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ شاپنگ مال میں شاپنگ ہی کی جاتی ہے، مگر تم وہاں اکیلی تھیں اور عارفین وغیرہ سب کہاں تھے؟“ وہ شرن، حرا کے بارے میں پوچھ رہا تھا تو اس نے آرام آرام سے ساری داستان اس کے گوش گزار کر دی تھی۔

”اف۔۔۔! تم تو ہو ہی بے وقوف، مگر عارفین اور شرن سے مجھے اتنی بے وقوفی کی امید ہرگز نہیں تھی۔“ اس کے لب و لہجہ میں تھوڑی سی سختی در آئی تھی، بہت مشکل سے وہ اپنے بھڑکتے جاہ و جلال والے غصے کو کنٹرول میں کیے ہوئے تھا۔

”مجھے وہاں چھوڑ دیں وہ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”ظاہر کی بات ہے تمہاری اس حد درجہ بے وقوفی پر پریشان ہی ہو رہے ہوں گے نا کہ جشن منا رہے ہوں گے۔“ تیز نظروں سے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھتے ہوئے طے کیا تھا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً اپنی اس توہن بر زر میل کو ٹھک ٹھاک سناتی، مگر سب سے بڑھ کر وہ غلطی پر تھی اور اپنوں سے دور اس کرے میں اس کے رحم و کرم پر تھی، وہ اگر غلطی پر بھی ہوتی تو بھی سنا دیتی، مگر اکیلی ہونے کی وجہ سے چپ کر گئی اور پھر زر میل کے غیض و غضب والے غصے سے بھی تو اچھی طرح واقف تھی، جو اس وقت اس کے چہرے پر تھا، جس کا اندازہ وہ اس کے دماغ کی تپتی رگوں سے یاخو بی لگا سکتی تھی، وہ سب لوگ گھر آ چکے تھے ٹھیک اسی وقت عارفین کی گاڑی کے پیچھے ریحان سچ کی گاڑی رکی تھی، عارفین نے پیچھے پلٹ کے دیکھا تو جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، وہ اکیلے تھے، ڈالے ان کے ساتھ نہیں تھی، وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا۔

(جاری ہے۔۔۔)

☆.....☆.....☆

مکمل ناول

دلہن کا دل کر چھوڑا

”اس طرح میں کبھی تمہاری بات نہیں مانوں گی، تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟“ ظارم نے انتہائی سرد لہجے میں اپنی بات کو شروع کرتے ہوئے غصہ کیا۔ اشعر انصاری نے اس کو غصے سے دیکھا اور نہایت ہی بے رحمی کا سلوک



اتاتے ہوئے اسے اپنی بات کے جواب میں اشعر نے وارننگ کے انداز میں گھورا اور کہا۔
”یہ سب تو میں تم سے کروا کر رہوں گا اور تمہاری ماں کو خود تمہارے منہ سے یہ اطلاع دلاؤں گا کہ تمہارے ساتھ دھوکا کیا ہے میں نے، اور تم کیا مجھے اتنا بے وقوف سمجھتی ہو، اس عورت سے میں اپنا بدلہ لے کر چھوڑوں گا، انہوں نے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے؟ اتنا باگلی نہیں ہوں میں۔“ اشعر انصاری غصے سے اسے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ رونے لگی اور سوچوں کے دریا میں بھٹک گئی کہ اس کو اب آگے کالائج عمل کیسے تیار کرنا ہے؟

☆.....☆.....☆

”کاشنہ! میری بات سنو!“

”مئی! میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گی، خدا را! ابھی میری اسٹڈی کو کمپلیٹ ہونے دیں، پھر میں شادی کروں گی، وہ بھی اپنی پسند سے، آپ کو اب تو میری بات سمجھنی چاہیے۔“ اس نے ہٹ دھرمی دکھائی اور تاراضی کا اظہار کر کے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ کاشنہ کی والدہ عالیہ بخاری اس کے اٹل فیصلے پر اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔



نمودی لائبریری اینڈ فرینڈنگ پوائنٹ
ساؤتھ سٹریٹ، لاہور
دوہ نیشنل

”بہت زیادہ ہی تم نے سر پر چڑھ لیا ہے، آج ہی کوئی رشتہ دیکھو، میں فارغ ہو جاتی ہوں۔“ آج تو عالیہ بیگم کو بہت غصہ تھا جو کہ سعد پر اتر رہا تھا، اور باہر کھڑی کاشنہ بھی ٹھیک ٹھاک پریشان ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

زین کو رات کو اس کے بابا جان نے بتایا تھا۔
”ہم نے تو تمہارا رشتہ وٹے سٹے میں طے کیا ہوا ہے اور تم کو معلوم ہے، جب ہم زبان کر دیتے ہیں تو اپنے وعدے سے پھر تے نہیں ہیں اور میں اب ذکیہ کے جاؤں گا شادی کی بات کرنے، اس کے دونوں بچے بہت اچھے اور لائق ہیں، تم بھی ملو گے تو بہت خوش ہو گے، کہو تو یہاں بلا لیتے ہیں، میری ایک بی بہن ہے، جس کو میں بہت چاہتا ہوں اور آخری سانس تک چاہتا رہوں گا، بیٹا! یہ جو محبت ہوتی ہے ناں، بہن کو بھائی سے اور بھائی کو بہن سے، یہ بہت ہی انمول ہوتی ہے اور سچی بھی، اس میں کھرا کھوٹا کچھ نہیں دیکھا جاتا ہے، میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے جس نے اپنی بہن کو خوش نہیں رکھا اس میں دنیا میں کسی بھی رشتے کو خوش رکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، یہ جو بہن کا رشتہ ہوتا ہے ناں، ہر چیز سے پاک ہوتا ہے، بہن تو ایسی نازک شے کا نام ہے جو بھائی کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتی ہے، بہنوں کا دل بہت ہی نازک کاغذ کا بنا ہوتا ہے اور میں سچی اپنی بہن سے محبت کرتا ہوں اتنی ہی تم بھی اپنی بہن سے کرو، امید کرتا ہوں تم مجھ کو کبھی شکایت کا موقع فراہم نہیں کرو گے، جاؤ اب جا کر سو جاؤ، پھر صبح ہی سب ل کر چلیں گے، تمہاری پھوپھو جان تم کو بہت یاد کرتی ہیں۔“

زین صبح ہی نماز فجر کے بعد فارغ ہو کر ناشتہ کر رہا تھا، آج زین، بابا جان، بی جان اور میری سب ذکیہ پھوپھو سے ملنے جا رہے تھے، ناشتہ کرنے کے فوراً بعد نکلتا تھا، ساری تیاری مکمل تھی، ان کو لاہور جانا تھا جو کہ ایک لمبا سفر تھا، زین کل سے چپ تھا، اس کو کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس دورا ہے پر آ گیا ہے، ایک طرف اس کی محبت بھی تو دوسری طرف اس کی بہن اور ماں باپ، جن کا درجہ تو بہت بلند تھا، وہ بالکل کوئی فیصلہ نہیں کر پار تھا کہ کیا کرے؟ اس نے اپنے ماں باپ کو خوشی دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کاشنہ بہت پریشان تھی کہ آخر کیا وجہ ہے جو زین کا نمبر بند ہے اور اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہو رہا ہے؟ اس کی مٹی اس پر بہت دباؤ ڈال رہی تھی، اس کا بہت ہی اچھا رشتہ آیا ہوا تھا، لڑکا ڈاکٹر تھا اور کاشنہ کو پسند کر لیا تھا، ڈاکٹر سبحان شاہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کے ماں باپ سعودی عرب میں رہتے تھے، بہت زیادہ بڑا خاندان نہیں تھا، سعد بخاری کے توسط سے یہ رشتہ آیا تھا۔ کاشنہ کی صورت بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھی، وہ اپنی مٹی کو کوئی شے کرنے کی بہت کوشش کر رہی تھی، لیکن اس کے پاس زین نے کوئی آپشن بھی تو نہیں چھوڑا تھا، وہ بہت ہی ہرٹ ہوئی تھی، جب اس کو زین سے کوئیٹک ہونے کا کوئی سرا سمجھ نہیں آ رہا تھا، اس کی مٹی سب جانتی تھی اور انہوں نے اس کو ایک ہفتے کا نام بھی دیا تھا، لیکن آج ایک ہفتے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا، زین کا کچھ معلوم نہیں چل رہا تھا، اس کے جتنے بھی نمبرز تھے سب آف تھے، وہ بڑی پھنسی تھی۔

”کاشنہ! آخر تم جانتی کیا ہو؟ اس کی محبت کو گلے لگانا چاہتی ہو، جو تم کو کچھ راستے میں تنہا چھوڑ گیا، تم باتو بہت معصوم ہو، باپھر سمجھ کے بھی نہیں سمجھ رہی ہو، اس دھوکے باز کو، جو تم کو کوئی مقام تک نہ دلا سکا، اس سے آگے کی کیا امید رہی جاسکتی ہے؟ کوشش کرو بھول جاؤ اُسے، اور تمہاری اطلاع کے لئے عرض کرتی چلوں، زین علی خان نے اپنی کزن سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے، وہ اس کی پھوپھو ذکیہ کی بیٹی ہے، ہمارے خاندان کے ان سے تھوڑے بہت

عالیہ بخاری کے 2 ہی بچے تھے، ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور انہوں نے نہایت ہی اچھی تربیت کے ساتھ کاشنہ اور سعد بخاری کو تعلیم دلوائی، سعد کی شادی تو وہ اپنی پسند سے کر چکی تھیں حراسے، وہ ان کے جانے والوں میں سے تھی، جبکہ وہ چاہتی تھیں کہ اس کا بھی رشتہ ان کی زندگی میں ہی طے پا جائے، لیکن یہ اوٹ کسی بھی کروٹ نہیں بیٹھ رہا تھا، جس کی وجہ سے عالیہ بخاری بہت پریشان تھیں، ان کی مٹی کسی جاننے والی نے کاشنہ کا رشتہ بتایا تھا، جو کہ بے حد اچھا تھا، انہوں نے سعد سے بات کرنے کی ٹھان لی اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئیں۔

☆.....☆.....☆

زین علی خان اور کاشنہ ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، اور دونوں ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے، ساتھ رہنے کے بہت سے وعدے بھی کیے تھے، دونوں M.B.A کر رہے تھے، زین کا تعلق حویلی کے ماحول سے تھا، ان کے ہاں باہر شادی نہیں کی جاتی تھی، یہ بات اس نے کاشنہ سے چھپائی تھی، اور اس کو اس بات کی بھٹک تک پڑنے نہیں دی تھی، وہ سمجھتا تھا جس دن وہ اپنے بابا جان اور بی جان کے پاس جائے گا، ان کو منالے گا، لیکن اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ وقت اس کے ساتھ کیا کھیل کھیل جائے گا، اسی لئے وہ مکمل طور پر اپنی تعلیم پر توجہ دے رہا تھا، اس کو یقین تھا کہ وہ اپنی محبت کو جیت لے گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے اس کو اپنے والدین پر پورا بھروسہ تھا۔

زین اور کاشنہ نے ایک ساتھ ہی M.B.A کیا اور دونوں ہی تعلیم سے فراغت کے بعد بے صبری سے رزلٹ کا انتظار کر رہے تھے، زین نے کاشنہ کو بتا دیا کہ اس نے اپنا بزنس سیٹ کر لیا ہے، اور بہت جلد اس کا رشتہ لے کر جائے گا اپنے ماں باپ کے ساتھ، زین آخری ملاقات کر کے اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بی جان کے تو آنسو ہی نہیں رُک رہے تھے زین کو دیکھ کر اور میری بھی بھائی سے نہایت ہی محبت کے ساتھ ملی تھی، میری، زین کی اکلوتی چھوٹی بہن تھی، جس نے MSc کیا ہوا تھا، یہ مکمل طور پر انجو کیڑا گھرا تھا، بابا جان بھی زین سے مل کر کہنے لگے۔

”اب میں تم کو نہیں جانے دوں گا، تمہاری تعلیم مکمل ہو گئی ہے، یہیں رہ کر سب دیکھ بھال کرو، میں بوڑھا ہو گیا ہوں، اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ بی جان اور میری نے بھی مسکرا کر ہاں میں ہاں ملائی تھی، جس پر زین صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

”اور میں اپنے بیٹے کی دلہن بھی لاؤں گی، بہت عرصہ انتظار کر لیا، اب میں اپنے دونوں بچوں کی شادی کر کے رُج کی ادائیگی پر جاؤں گی اور زین کی بالکل نہیں سنوں گی۔“ بی جان نہایت ہی جوش و خروش سے سب کہہ رہی تھیں۔

”ہاں، ہاں اب جو تم کہو گی وہی ہوگا، پہلے میرے بیٹے کو کھانا کھلاؤ، اتنی دور سے آیا ہوا ہے، تم لوگوں کو فکر ہی نہیں، جاو میری بیٹی! کھانا کا انتظام کرو۔“ بابا جان کی بھی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔

☆.....☆.....☆

عالیہ بخاری نے سعد سے بات کر لی تھی کہ اب کچھ بھی ہو جائے میں کاشنہ کی شادی کر کے رہوں گی اور اب اس کی ”ناں“ بالکل بھی نہیں سنوں گی۔

فیملی ٹرم ہیں، کہو تو میں تمہاری اس کی پھپھو سے بات کروادوں کیا؟“ جراثو کہ اپنی نند کو بہت چاہتی تھی، اس کے سامنے زین کا پردہ بھی فاش کر چکی تھی۔

”بھائی آپ کیا کہہ رہی ہیں، کہہ دیں کہ جھوٹ ہے یہ سب، میں بالکل بھی برداشت نہ کر پاؤں گی، اتنا بڑا دھوکا بھی کوئی کسی کو دیتا ہے؟ آپ خدار! مجھ پر رحم کریں، آپ زین سے میری ملاقات کروادیں پلیز!“ وہ جراثو کے آگے ہاتھ باندھ کر رو رہی تھی، بڑی طرح آج وہ بکھر گئی تھی، بالکل ٹوٹ چکی تھی، جراثو نے آگے بڑھ کر اس کو گلے لگایا اور تسلی دی۔

☆.....☆.....☆

جراثو زین کی پھپھو کو جانتی تھی، ان کی بیٹی جو کہ کبھی جراثو کے ساتھ لاہور میں پڑھتی تھی، اسی سے اس کی شادی کی معلومات اس نے حاصل کی تھیں اور جب کاشنہ کے پاس زین کی کچھ دیکھی، تو وہ چونک گئی تھی، اسی لیے جراثو نے رطابہ سے سب معلومات حاصل کیں، لیکن اس نے اس کو یہ نہیں بتایا تھا کہ زین اور کاشنہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، اور رطابہ کی شادی میں شرکت سے بھی انکار کر دیا تھا، کہہ دیا تھا کہ میری نند کی شادی ہے۔

☆.....☆.....☆

زین علی خان نے فرض اور محبت میں سے ایک کو چن لیا تھا، اس نے اپنی بہن کی آنکھوں میں احسن کے خواب سجے دیکھ لیے تھے، اس نے فرض کو چننا تھا، جس کی بدولت وہ جنت میں جاسکتا تھا، ماں باپ کی محبت اور خدمت حاصل کر کے وہ ہر جگہ کامیابی و کامرانی کے ساتھ زندگی گزار سکتا تھا، اسی وجہ سے اس نے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا اور اپنے بابا جان کو شادی کی تاریخ بکس کرنے کا کہہ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پھپھو ان سب کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں، رطابہ بھی زین کو دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔

”بھئی! جلدی جلدی انتظام کرو، آج تو اتنے سالوں کے بعد میرا بھائی آیا ہے۔“ بابا جان نے ذکیہ پھپھو کو اپنے سینے سے نہایت احترام سے گلے لگایا تھا، رطابہ دوڑ کر اپنی ممانی اور یسری سے ملی تھی، اور یسری کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا، جس پر یسری شرم کر رہ گئی۔

”جاؤ رطابہ! کچھ ٹھنڈا لے کر آؤ، دیکھو تو خوب بہترین کھانے کا انتظام کروانا، آج تو میری بیٹی آئی ہے۔“

پھپھو نے یسری کو محبت سے دیکھا اور مسکرا کر رہ گئیں۔

”بالکل ماما جان! میں ابھی منٹوں میں سب لے کر حاضر ہوتی ہوں۔“ رطابہ نے یسری کو بھی اپنے ساتھ کھینچا تھا۔

سب بڑے ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور ان دونوں کی اپنی باتیں تھیں جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں، دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ بھی تیزی سے چلا رہی تھیں کہ چاکا چاکا دونوں ہی کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسی تھیں، احسن جو کسی کام سے رطابہ کے پاس آ رہا تھا، بچن کے دروازے پر ہی رک کر یسری کے ہنسنے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا، یسری کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی تو وہ رطابہ کے پیچھے چھپ گئی۔ احسن اندر داخل ہو چکا تھا، رطابہ سے کہا۔

”کیا ان کے ہاں سلام دعا کا رواج نہیں ہے؟“ احسن نے آگے بڑھ کر خود ہی یسری کو سلام کیا، جس پر رطابہ ہنسنے لگی، یسری نے اس کو گھورا اور احسن کی طرف دیکھنے سے اجتناب کیا۔

”رطابہ! ذرا دیکھنا، شاید تم کو ماما بھاری ہیں، مجھے آواز آرہی ہے۔“ اس نے اپنی بہن کو آنکھ کے اشارے سے کچن سے باہر جانے کو کہا تھا اور خانساں تو ٹیبل لگا چکا تھا، بس ان تینوں کو جانا تھا وہاں۔ رطابہ باہر کی طرف جانے لگی تو یسری بھی اس کے پیچھے چل دی تھی، لیکن احسن نے اس کی کلائی کو تھام کر اسے جانے نہیں دیا تھا۔ یسری نے منہ موڑ کر حیرانی سے اس کو دیکھا۔

”پلیز! مجھے جانے دیں۔“ احسن اس کی کیفیت سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ذرا ہم سے بھی دو گھنٹی ملاقات کرو، حالانکہ آنا تو تمہیں میرے ہی پاس ہے۔“ احسن نے اس کے کان کی طرف منہ کر کے سرگوشی کی۔ یسری بالکل جپ تھی، اس کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی، بس اس کو صرف سن رہی تھی اور اپنی کلائی کو مستقل کھینچ رہی تھی، جس کو احسن پھوڑنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

”کیا بات ہے، آج تو چپ شاہ کا روزہ رکھا ہے، کچھ کہو گی نہیں کیا؟ میرے سلام کا بھی جواب نہیں دیا، جب تک تم میرے سلام کا جواب نہیں دو گی، جانے تو بالکل نہیں دوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ اس کا لہجہ اٹل تھا۔

”ارے پھپھو جان! آپ آئیے، میں بس آ رہی تھی۔“ یسری کا بس دروازے کو دیکھ کر اتنا ہی کہنا تھا کہ احسن نے کلائی پھوڑ دی اور وہ تیزی سے بچن کے دروازے پر جا کر رُک کر احسن سے کہا۔

”بولو کیسے چھڑوانی کلائی؟“ اور ہنسی ہوئی بھاگ لی۔

”پھوڑوں گا نہیں تم کو، دوبارہ ہاتھ لگ جاؤ ذرا میرے۔“ وہ بھی ہنستا ہوا ٹیبل تک پہنچا اور کرسی کھینچ کر یسری کے سامنے ہی بیٹھ گیا تھا۔

”کیوں بھی برخودارا! کہاں تھے؟ یہاں سب تمہارا انتظار کر رہے تھے کہ آؤ تو کھانا شروع کیا جائے۔“ ماموں نے اس کے کان کھینچتے ہوئے شرارتی نظروں سے دیکھا تھا۔ احسن نے شیشا کر یسری کو اور پھر ماموں کو دیکھا اور کہا۔

”میں اپنے روم میں کام کر رہا تھا کچھ۔“

نہایت ہی بڑے سکون ماحول میں کھانا کھایا گیا، احسن کی نظریں مستقل یسری پر تھیں، جس کو زین نے دیکھا تھا اور دل میں مزید فیصلہ پکا کر لیا تھا کہ وہ ہر حال میں اپنی بہن کی خوشی پوری کرے گا، اس کو رطابہ بھی ٹھیک لگی تھی، اس نے اسی سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بی جان، بابا جان اور پھپھو نے ل کر ان چاروں کی شادی کی بات کر لی تھی، پھپھو نے کہا۔

”مجھے صرف میری بیٹی دے دو، اور کچھ نہیں چاہیے، میں نے ساری تیاری کی ہوئی ہے، اگر بھائی اور بھائی جان نہ اٹاں مانو تو میں کچھ کہنے کی اجازت مانگ رہی ہوں؟“ ذکیہ بیگم نے نہایت ہی التجائیہ لہجے میں بھائی کو دیکھا تھا۔

”آج سے پہلے تم کو کسی بات کا انکار کیا ہے جو تم مجھ سے اور اپنی بھائی سے اجازت طلب کر رہی ہو؟ کہو جو کہنا چاہتی ہو، تم کو ہم اپنی جان سے بھی بڑھ کر چاہتے ہیں۔“ بھائی جان نے ان کی طرف دیکھ کر اپنی بیوی کو دیکھا اور اجازت دی۔

”میں چاہتی ہوں کہ جب آپ لوگ اتنی دور سے آہی گئے ہیں تو احسن اور یسریٰ کا نکاح نہیں پر کروں اور باقی کی رسم میں اپنے گاؤں آ کر کروں گی۔“ انہوں نے عقیدت مندانہ لہجے میں اپنے بھائی اور بھابی کی طرف دیکھا تھا۔

”ارے اگر ایسا تم چاہتی ہو تو دیر کس بات کی؟ کل کرو، پھر ہم تو 4 یا 6 دن کے لئے آئے ہیں۔“

”لیکن اتنی جلدی ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو تیاری سے نہیں آئی، میری بھی تو اکلوتی اولاد ہے، یسریٰ سے بھی پوچھو۔“ ماں تھیں ناں، دل تو ہول گیا، بیٹی کے نکاح کا سن کر ہی، وہ فوراً اپنی تند اور شوہر کی شکل دیکھنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

ادھر کاشنہ کو بالکل بھی زین کے اس دھوکے کا ابھی تک یقین نہیں تھا، لیکن جب جرابھائی کے پاس ذکیہ بیگم کا فون آیا کہ وہ احسن کا نکاح یسریٰ سے اور رطابہ کا زین سے کریں گی اور جرابھائی دعوت دی تھی، تو اس نے بہانہ بنا کر انکار کر دیا تھا، یہ فون کال بھی کاشنہ کے سامنے آئی تھی، جس پر ابھی مہر لگ گئی تھی کہ واقعی میں زین نے اس کو دھوکا دیا تھا، اور سنہرے خواب دکھائے تھے، اس کا دل بڑی طرح سے ٹوٹ چکا تھا، اس نے اپنی بھابی اور بھائی کے ذریعے مہمان سے کہا کہ ایک سال تک شادی کے لئے اصرار نہ کریں، وہ انہی لوگوں کی پسند سے شادی کرے گی، لیکن اس کو سنبھلنے کے لئے کچھ وقت دیا جائے۔

اس کی ان تمام باتوں کو عالیہ بخاری نے ماننے سے انکار کر دیا تھا اور وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہو گئی تھی، پہلے وہ ایک بار زین سے بات کر چکی، اس سے پوچھتی کہ اس نے کیوں ایسے دھوکا دیا؟ لیکن اس سب کا فائدہ اس کو اب نظر نہیں آتا تھا، وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کر رہی تھی، ماں سے بھی اس نے یہی باتیں کہیں اور روئے گی، سب سے اس نے ایک سال تک کا ٹائم مانگا تھا، جس پر کوئی بھی راضی نہیں تھا، ماں نے تو صرف 6 ماہ کا ٹائم دے دیا تھا اور ڈاکٹر سبحان اور ان کے ماں باپ کو انہوں نے انوائٹ کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آج ڈاکٹر سبحان اپنی والدہ اور والد کے ساتھ کاشنہ بخاری کو دیکھنے آئے تھے، ان کے والدین کو وہ بہت پسند تھی اور ان کو بھی وہ پسند آتی تھی، جس کا انہوں نے اپنی مدر سے برلا اظہار کر دیا۔ کھانے کا جرانے بہترین انتظام کیا تھا۔ سب کھانے سے فراغت کے بعد ڈرائنگ روم میں ٹھنڈی کولڈڈرینک اور آسکریم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر سبحان کی نظریں مستقل کاشنہ پر اٹھ رہی تھیں، کاشنہ نے سی گرین کلر کی فرائم پہنی ہوئی تھی، جس پر وائٹ گولڈ بھاری سا کام تھا، ڈاکٹر سبحان کا پسندیدہ مگر تھا، جس میں کاشنہ بخاری بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔

کاشنہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس پر ڈاکٹر سبحان کی نظروں کا حصار مستقل ہے، اس کی برداشت جواب دے چکی تھی، اس نے بھی ڈاکٹر سبحان کو گھور کر اپنا رخ جرابھائی کی طرف ہونہہ کر کے کر لیا تھا۔ اس کی اس ادراڑ ڈاکٹر سبحان مسکرا کر رہ گئے تھے، ڈاکٹر سبحان کی والدہ نے اپنے پرس سے رنگ اور پیسے نکال کر کاشنہ کے ہاتھ کو پکڑ کر اچانک پہنادی اور اجازت طلب نظروں سے عالیہ کو دیکھا تھا۔

”مجھ سے اب اور صبر نہیں ہو سکتا عالیہ! جب یہ میری بیٹی ہے، تو میں کیوں دیر کروں؟ تیاری کر لو، ہم بہت جلد ہی رخصت کروائیں گے، میں 6 ماہ سے پہلے ہی اس کی اپنے گھر میں رخصتی لوں گی، اور تم منع نہیں کرو گی، میرا تو اکلوتا بیٹا ہے، دھوم دھام سے شادی کروں گی، اور ہر رسم کروں گی۔“ ڈاکٹر سبحان کی والدہ کا بس نہیں چل رہا تھا

کہ وہ کاشنہ کو ابھی اپنے گھر لے کر چلی جائیں۔

”ارے آئی! ہماری بھی اکلوتی بہن ہے، ہم بھی اس میں بھرپور شرکت کریں گے۔“ جرابھابی بولیں۔ ان سب باتوں کے درمیان کاشنہ اچانک ہی ایکسکلیوڈ کر کے چلی گئی، جس پر سب کی نظریں اسی پر تھیں۔

”شرما گئی ہے میری بیٹی۔“ عالیہ بخاری نے بات بنائی تھی۔ پھر وہ لوگ اپنے گھر لوٹ گئے۔

☆.....☆.....☆

”جب یسریٰ اور احسن کا نکاح ہو ہی رہا ہے تو میں چاہتا ہوں، تم بھی راضی ہو جاؤ، ہم رطابہ کا بھی تمہارے ساتھ نکاح کر لیتے ہیں اور رطابہ کو رخصت کروا کر لے جاتے ہیں، اس طرح ہم تم دونوں کے فرض سے فارغ ہو جائیں گے، ایک ہی دفعہ سارا کام منٹ جائے گا تو بہت ہی اچھا ہوگا۔“ بی جان اور بابا جان نے اپنا فیصلہ زین کو سنایا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ سناٹے میں آ گیا، لیکن اس نے بابا جان سے ایک شرط بھی رکھی تھی کہ اگر وہ شادی کرے گا تو گاؤں نہیں جائے گا اور بی جان اور بابا جان کو یہیں شہر میں رہنا ہوگا، کیونکہ زین اپنا بزنس اسٹارٹ کر چکا تھا اور اس کو بھرپور توجہ دینا چاہتا تھا، ان سب کاموں سے فارغ ہو کر، اس کا ارادہ لاہور میں رہنے کا نہیں تھا، کراچی میں وہ سب کچھ سیٹ کر چکا تھا، اپنے دوستوں کی مدد سے۔ ان دونوں نے اس کی کسی بات کو رد نہیں کیا تھا اور آسانی سے کراچی میں شفٹ ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ گاؤں کا سب کچھ بیچ کر اس نے احسن کے ساتھ مل کر سارا کام مکمل کر لیا تھا اور کراچی شفٹ ہونے سے پہلے ہی رطابہ کے ساتھ شادی کا ارادہ کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پچھو کے گھر میں آج رطابہ اور زین کے نکاح کے ساتھ ہی رخصتی کا بھی ارادہ بن چکا تھا، احسن کا یسریٰ کے ساتھ صرف نکاح تھا، رخصتی زین نے اپنے دل سے پردے کا کہا تھا جس پر سب راضی تھے۔ بی جان اور بابا جان تو بہت خوش تھے، تمام کام خوش اسلوبی سے ہو گئے تھے، زین نے رخصتی کے وقت پچھو اور احسن سے نکلے ملتے ہوئے اجازت چاہی تھی۔ احسن کی نظریں بھی یسریٰ پر تھیں، جس پر اس نے احسن کو دیکھا اور مسکرا کر رطابہ سے باتوں میں لگ گئی تھی، ان سب کو ایئر پورٹ چھوڑنے احسن اور پچھو آئے تھے، 2 گھنٹے میں یہ لوگ اپنے شہر کراچی میں آ چکے تھے، یہاں پر تمام نوکروں نے تیاری کر کے رکھی تھی، زین علی خان بہت سنجیدہ تھا، جس کو بی جان نوٹ کر چکی تھیں، مگر کہا کچھ بھی نہیں، سب رسمیں کر کے انہوں نے یسریٰ کو زین کے بیڈ روم میں لے جانے کو کہا تھا، یسریٰ نے رطابہ کو بیڈ پر بٹھا کر باہر کی طرف قدم بڑھائے اور دروازہ بند کر کے زین کا وید کر رہی تھی، جو بالکل سامنے سے آہستہ روی سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔

”بھائی! جلدی جلدی آ جائیں، آج کے دن بھی اتنی سلو چال چل کر آ رہے ہیں۔“ یسریٰ نے وہیں سب کے سامنے ہانک لگائی تھی، جس پر زین نے جھینپ کر اس کو دیکھا تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے مجھے دوڑتے ہوئے آنا چاہیے کیا؟“ اس کی بات پر سب کے چہروں پر ہنسی دوڑ گئی تھی۔

”اگر آپ ایسا بھی کر لیں تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، جلیں جلدی سے ہم سب کو ٹیگ دیں اور دوڑ کر تو آپ کو کمرے میں جاتا ہے۔“

”یہ میں نے کب کہہ دیا کہ میں تم کو مزید پیسے ان سب کے ساتھ مل کر دوں گا؟ ہوسا منے سے اور جا کر

زین جیسے ہی روم میں گیا مستقل صوفے پر بیٹھ کر کچھ دیر سوچتا رہا، اس کو بیٹھے ہوئے 15 منٹ سے بھی زیادہ ہو گئے تھے، بالکل چپ تھا وہ، پھر بیڈ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”السلام علیکم وعلیکم رحمۃ اللہ علیہ! مجھے امید ہے کہ تم میرا پر قدم پر ساتھ دو گی، میں بھی پوری کوشش کروں گا، لیکن اگر کوئی کوتاہی ہو جائے تو معاف کر دیتا مجھے، میں ہر طرح سے تمہارا خیال رکھوں گا۔“ اس نے یہ سب کہہ کر الماری کی طرف قدم بڑھائے اور طایہ کو ایک رنگ دی، اس تمام عرصے میں اس کے جذبات نہایت سرد تھے، جس کو طایہ نے نوٹ کر لیا تھا۔ ان دونوں کی زندگی میں آنے والا دن کچھ زیادہ اچھا ثابت ہوتا ہے کہ نہیں یہ سارا منظر چاند اپنی پوری روانی پر آسمان سے دیکھ رہا تھا اور رات دھیرے دھیرے بیت کمرج کا اُجالا لے کر آگئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہاں ڈاکٹر سبحان شاہ سے کاشنہ کی بہت دھوم دھام سے شادی ہو چکی تھی اور ڈاکٹر سبحان کا ارادہ اس کو اپنے ساتھ باہر لے کر جانے کا تھا، کیونکہ وہ پوری فیملی ہی باہر رہتی تھی، اور وہ تو تھے ہی اگلوتے اپنے ماں باپ کے، لاہور سے رخصت کروا کر وہ اس کو کراچی لے کر آ گئے تھے، وہ بہت ہی محبت سے اس کے ساتھ پیش آنے تھے، حالانکہ اس کا تو ابھی تک رونا ہی ختم نہیں ہوا تھا، صرف اس بات کو لے کر پریشان تھی کہ میں باہر اپنی ماں، بھابی اور بھائی کو چھوڑ کر کیسے رہوں گی؟ وہ اس کے حق میں نہیں تھی اور ڈاکٹر سبحان کے والدین نے اس کو بہت سمجھایا تھا، پھر کچھ ماہ کے لئے ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور اس کو لاہور بھیج دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہیے کا فنکشن سب نشا کر زین کی روٹین لائف شروع ہو چکی تھی، وہ کراچی میں بہت ہی بہتر طریقے سے اپنے بزنس کو شروع کر چکا تھا، بی جان اور بابا جان ذکیہ پھپھو کے ساتھ جی کی سعادت کو جا رہے تھے، ادھر سارے انتظام مکمل تھے۔ احسن سے ساری بات ہو چکی تھی، وہ بھی یسری اور پھپھو کو لے کر کراچی آنے کا کہہ رہا تھا کہ یسری کچھ دن رک جائے گی، حالانکہ وہ راضی نہیں تھا اس کو وہاں چھوڑنے کو، پھپھو نے جب ڈانٹا تو وہ نیم رضامند ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ان سب کو کاشنہ کے آنے کی بے حد خوشی تھی، عالیہ بخاری سے فون پر ڈاکٹر سبحان کی تفصیلی بات ہو چکی تھی اور انہوں نے اپنی مصروفیات کے بارے میں بتا بھی دیا تھا، جمعی کاشنہ کو اکیلے بھیج دیا تھا، امی کے ہاں لاہور۔

”تم کیوں نہیں جانا چاہتی ہو، دیکھو بیٹا! جب لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے تو اس کی کسی قسم کی بھی نہیں سنی جاتی ہے، جب تمہارا شوہر وہاں ہے تو تم یہاں اکیلی کس کے پاس رہو گی؟ بھی تو خود سے بھی سمجھ جایا کرو، ہر بات میں بے جا ضد مت کیا کرو، یہی دن ہیں عیش کرو، ملنے آئی رہا کرنا ہر سال۔“ عالیہ بخاری نے اس کو بہت مشکل سے راضی کیا تھا۔ کاشنہ نے بہت دن لاہور میں انجوائے کیے تھے، اب اس کو کراچی میں بلایا جا رہا تھا اور اس نے اپنے ساس، سر کے لئے بہت شاپنگ کی تھی، پھر جانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ان کی آج فلائٹ تھی، وہ سب انہیں چھوڑنے آئے ہوئے تھے، یسری تو بہت ہی رورہی تھی، بی جان گلے لگا کر تسلی بھی دے رہی تھیں، لیکن اس کا دل عجیب سا ہو رہا تھا، زین نے اس کو گلے لگا کر کہا۔

”اب بس کرو، مت تنگ کرو، ورنہ وہاں پر بھی یہ دونوں پریشان رہیں گے۔“ احسن بھی اس کا بچوں کی طرح

آرام کرو، کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم تم کو اس کے بدلے ایک جیتا جاگتا انسان احسن کی شکل میں دے رہے ہیں، چلو اب چلتی پھرتی نظر ڈالو اور اپنا یہاں سے بوریا بستر میٹھی نظر آؤ، جمعی تو میں نے اپنی شادی کے ساتھ تمہارے کو بھی یہاں سے بھگانے کا بالکل پکا انتظام کیا ہے۔ اس کی باتوں پر وہاں پر کھڑے تمام لوگوں نے دل کھول کر قہقہے لگائے تھے، بی جان اور بابا جان بھی بیٹے کی باتوں پر مسکرا رہے تھے۔ یسری کی آنکھوں سے آنسوؤں کی شکل میں پورے چہرے پر پھیلنے لگے، زین کی باتوں پر وہ روتے ہوئے اپنے ماں باپ کی شکل دیکھنے لگی تھی، بی جان نے آگے بڑھ کر یسری کو گلے سے لگایا اور زین کو گھر کا تھا۔

”اس طرح کوئی بہن کو کہتے ہیں؟ رب سے شکر کرو کہ رب نے تم کو ایک ہی بہن دی ہے، اور اس کے فرض سے جلدی فارغ ہو چکے ہو۔“ بابا جان نے زین کو کہتے ہوئے یسری کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”ارے میری پیاری سی بہن! میں تو مذاق کر رہا تھا، بھلا میں تم کو اس طرح سے کہہ سکتا ہوں؟ چلو اب میں تم کو تمہارا من مانا ٹانگ دینے کو تیار ہوں اور آئندہ بھی تمہاری آنکھ میں آنسو نہ آئے، یہ سب میں نے تمہاری خوشی کے لیے تو کیا ہے۔“ زین نے نہایت ہی آہستگی سے ذومعنی بات اپنے آپ سے کی اور جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی تھی کہ یسری نے فوراً اس کے ہاتھوں سے اچک لی اور سب کو چھوڑ کر اپنے روم کے دروازے پر زک کر زین کو منہ چڑایا۔

”میں تو مذاق کر رہی تھی بھابی! میں کون سا سیریس ہو کر رورہی تھی، پاگل بنا رہی تھی میں آپ کو۔“ زین اس کی طرف فوراً بڑھا تھا، لیکن یسری منہ چڑا کر اپنے روم میں بند ہو گئی۔ بی جان اور بابا جان نے بھی اپنے اپنے راتے چہرے سے زین کو دیکھا اور وہ سب پر نظر ڈالتا ہوا اپنے روم میں اتر ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جرا بھابی نے کاشنہ کو بہت مشکل سے راضی کر لیا تھا، بلکہ اس کو زین اور طایہ کی شادی کا کارڈ دکھایا تھا، جس کو دیکھ کر کاشنہ بہت روئی تھی، اور زین کو دھوکے باز جیسے لفظ سے نواز کر ڈاکٹر سبحان سے شادی کے لیے راضی ہو گئی تھی، ادھر بھی خوب زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں، حالانکہ کاشنہ کے بے حد روئے کی وجہ سے اس کا چہرہ سو جا ہوا اور ریڈ ہو رہا تھا، عالیہ بخاری نے اس کو بہت سمجھایا تھا، لیکن اس کو اپنے ماں اور بھابی بھابی سے دوری بہت بڑی لگ رہی تھی، اس کا زخم تازہ تھا جس پر حیرانے بہت ہی جلدی چائی تھی شادی کی۔

☆.....☆.....☆

جرا شاپنگ کر کے ابھی لوٹی ہی تھی کہ احسن کا فون آ گیا تھا۔

”السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ بالکل غلط بات ہے کسی دوست تھیں جو شادی میں بھی شرکت نہیں کی اور مجھے تو پوری امید ہے کہ آپ میری شادی میں بھی نہیں آئیں گی۔“ احسن نے بہت ہی جلد باز انداز میں جرا کو لٹا دیا تھا۔

”علیکم السلام! ذرا دم تو لو، تم تو ایسے شروع ہوئے کہ بولنے کا موقع بھی نہیں دے رہے ہو، بھابی! میری نند کی شادی ہے یہاں پر، اور طایہ کو بھی بہت مبارک باد دینا میری طرف سے، موقع لگا تو آؤں گی تمہاری طرف، آئی کو بہت سلام کہتا میرا اور تم کو بھی بہت مبارک ہو، میں بہت جلدی میں ہوں پھر بات کریں گے۔“ جرا نے کال ڈراپ کرنے کے بعد ہال میں نظر ڈالی، لیکن وہاں کاشنہ نہیں تھی، اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ کال کس کی ہے، جرا سارے شاپنگ بیگز اٹھا کر عالیہ کے روم میں چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

یونادیکھ رہا تھا اور ہنس رہا تھا، جبکہ وہ اس کو صرف گھور کر رہ گئی تھی۔ یہ تمام لوگ ایئر پورٹ سے باہر نکل گئے تھے، تبھی زین کی ایک ایئر جیسی کال آگئی تھی، جس پر اس کو کراچی کے جناح ٹرمینل پر اپنے ایک دوست کو ریسیو کرنے جانا تھا۔

”احسن! بہت ضروری جانا ہے، کیا خیال ہے ان سب کو گھر چھوڑ کر پھر چلیں کیا؟ اب اتنی دور آگئے، گھر جانے کے بجائے ایئر پورٹ پر چلتے ہیں، تم کو خواہ مخواہ مسئلہ ہوگا، ان دونوں کو بھی لے کر چلتے ہیں، کیا خیال ہے آپ دونوں کا؟ عقل سے پیدل خواتین صاحبہ!“ احسن کی بات پر زین نے مسکراتے ہوئے سر میں سے دونوں کو دیکھا تھا، جس پر رطابہ نے اس کو بھی ہنستے ہوئے دیکھ لیا تھا اور رخ موڑ کر اپنے بھائی کو دیکھا تھا۔

”یہ خواتین کس کو کہا ہے؟ لگتا ہے گرمی نے کچھ زیادہ ہی آپ دونوں پر اثر کیا ہوا ہے۔“ یسریٰ نے اپنے شوہر اور بھائی کو گھورتے ہوئے، رطابہ کو بھی گھورا۔

”اور آپ بھی خاموش ہیں یہ لوگ ہم دونوں کو ہی کہہ رہے ہیں، کم از کم اپنے شوہر کو ہی کچھ کہہ دیجئے، اب اتنی بھی کیا فرما کر داری، آپ دونوں سے تو ہم دونوں بہت ہی چھوٹے ہیں اور خدا! آج کے بعد اگر ہم کو خواتین کہا تو ہم دونوں مل کر آپ دونوں کو نہیں چھوڑیں گے، اگر ابھی ہم آپ دونوں کے ساتھ اتنی گرمی میں ایئر پورٹ نہیں جا سکتے تو آپ دونوں کیا کر لیں گے؟ ذرا ملاحظہ تو فرمائیں اور مان گئے آپ جیسی چپ شاہ کا روزہ رکھنے والی منہ پلٹیں بھائی کو۔“ اس نے تینوں کو مل کر لڑا تھا۔

”زین کس قدر تیز ہے تمہاری بہن، ابھی کس قدر رو رہی تھی اور اب زبان دیکھو، کیسے چل رہی ہے، اور یہ تم دھمکی کی اور کو دینا کہ تم نہیں جاؤ گی، ہم تو لے کر جا سکتے ہیں، اب زین اتنا بھی تمہارا کہتا نہیں مانے گا، میری پارٹی کا ہے وہ، آئی سمجھ کر نہیں؟“ احسن نے نہایت ہنسی مضطرب کر کے اس کی طرف منہ موڑ کر کہا اور راستہ بھی تمام ہوا تھا۔

”آج پتا چل گیا خواتین کتابولتی ہیں۔“ زین علی خان نے احسن انصاری کی بات پر دل کھول کر قہقہہ لگایا تھا۔

”بھائی! آپ کو تو گھر جا کر بھابی دیکھیں گی اور احسن آپ کو تو میں دیکھوں گی۔“

”ارے جاؤ یہاں سے، یہ وقت بتائے گا۔“ ان دونوں کو وہیں کھڑے ہو کر اندر بیٹھنے کو کہہ کر زین، احسن کے ساتھ اندر کی طرف چل دیا تھا۔

آج کا شہر بھی ایئر پورٹ پر کھڑی تھی، کافی دیر سے ڈرائیور کا پریشانی میں ویٹ کر رہی تھی، اس کا آدھا سامان بھی اندر تھا اور ابھی تک وہاں کے عملے نے اس کے حوالے نہیں کیا تھا، کہہ رہے تھے کہ ایک بیک کم ہو گیا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبحان کو بار بار کال کر رہی تھی، لیکن ان کا سیل فون آف جا رہا تھا، اچانک ہی احسن کی اس پر نظر پڑی اور وہ بھاگتا ہوا گیا تھا۔

”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ احسن انصاری نے نہایت ہی شائستگی کے ساتھ کہا۔ کاشنہ نے چونک کر اپنا نام لینے والے کی شکل حیرانگی سے دیکھی تھی۔

سوری میں آپ کو نہیں جانتی اور آپ نے میرا نام بھی لیا، کون ہیں آپ؟“ اس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

”ارے آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں..... چلیں آپ یہ بتائیں، آپ سعد بھائی کی بہن ہیں ناں؟ اور جرا کی نندہ اور میں ان کا رشتہ دار ہوں، احسن انصاری، اب تو پہچان لیا؟ اور میرا خیال ہے آپ مجھے نہیں جانتی

ہوں گی، کیونکہ آپ سے پہلی مرتبہ ملاقات جو ہو رہی ہے، آپ کا زیادہ تر وقت یونیورسٹی میں جو گزارا ہے، لیکن میں آپ کو بہت اچھے سے جانتا ہوں، آپ بے فکر رہیں آپ کو میں صرف پریشان دیکھ کر آیا ہوں، کیا اتنا تعارف کافی ہے یا اور کوانا پڑے گا؟“ احسن نے ہنستے ہوئے اس کی پریشان سی شکل دیکھی تھی۔

”نہیں سوری، آپ کو زحمت ہوگی، میں خود دیکھ لوں گی، آپ سے معذرت بھی کرنی ہوں کہ آپ کو پہچانا کیوں نہیں؟ وہ انچوٹلی میرا ایک بیک یہاں کا عملہ دے نہیں رہا ہے، آپ کو تو ایئر پورٹ کے حالات کا علم ہوگا، لیکن میں بھی کچھ زیادہ کراچی نہیں آئی اور اب تو مستقل یہی نصیب بن گیا ہے کہ آنا جانا لگا رہتا ہے، کراچی میں میرا سسرال ہے اور ڈرائیور بھی نہیں آیا، تو میں پریشان ہو گئی تھی۔“ اس نے بھی تفصیل سے جواب دیا تھا۔

”ارے کوئی بات نہیں، یہاں ہم بھی اپنے ایک فریڈ کو لینے آئے تھے اور ہمارے ساتھ بھی ہمارے فیملی ممبرز ہیں، میری وائف اور بہن، بہنوئی، آپ مجھے ایڈریس بتائیں، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“ کاشنہ کے دل میں ایک دم ہلکی سی چھین ہوئی، اس کے بہنوئی کے نام پر۔

”پلیز! آپ زحمت مت کیجئے، میرا ڈرائیور راستے میں ہے، آتا ہی ہوگا، آپ کا بے حد شکریہ جو آپ نے مجھ سے پوچھ لیا، ورنہ میں معلوم نہیں کتنا خوار ہوتی۔“ وہ اس سے جلد از جلد پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اتنے میں اس کو زین نے آواز دی، کیونکہ وہ بھی کافی دیر سے دیکھ رہا تھا، اس کو کسی لڑکی سے بات کرتے دیکھ کر وہ بھی آگے بڑھا اور ایک لمحے کے لئے سکتے کی کیفیت میں چلا گیا تھا۔ زین کا دوست بھی ایک لمحے رُک کر اسے دیکھنے کے بعد زین کو دیکھنے لگا تھا۔

”آؤ بھئی، زین! یہ دیکھو اور ان سے ملو، یہ سعد بھائی کی بہن ہیں اور ہماری کزن کی نند ہیں۔“ احسن انصاری نے اس کا تھوڑا سا تعارف کر دیا تھا۔

”اور یہ میرے بہنوئی اور یہ ان کے فریڈ ہیں۔“

”السلام وعلیکم! کیسی ہیں آپ؟“ ارشد نے ہی اخلاق نبھایا تھا اور زین کو اشاروں میں اس کی پوزیشن کا احساس دلایا۔

”علیکم السلام! میں ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے، ورنہ لوگ تو زندہ رہنے کا سارا سامان اپنے ساتھ لے گئے تھے، پلیز مجھے اجازت دیں، مجھے دیر ہو رہی ہے، میرا ڈرائیور بھی آ گیا ہے، اور میرے شوہر بھی پریشان ہو جا سکتے ہیں۔“ اس نے ان تینوں سے اجازت لے کر اور کوئی بھی بات کیے بغیر اجازت لینی چاہی تھی، لیکن احسن انصاری نے پھر سوال کر لیا تھا جس کا اس نے سہولت سے جواب دیا تھا، اور زین کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر اپنے باہر جانے کا بھی بتا دیا تھا۔

”جہاں اتنی دیر آپ رُک رہے ہیں پلیز! میری سسٹر اور مسر سے بھی مل لیجئے، بس تھوڑی دور ہیں وہ لوگ گاڑی میں بیٹھی ہیں۔“ احسن کے اصرار پر اس نے اپنے ڈرائیور کو سامان گاڑی میں رکھنے کا کہہ کر احسن کے ساتھ قدم بڑھائے تھے۔ احسن نے نوٹ کر لیا تھا، زین اور ارشد ان کے پیچھے نہیں آرہے ہیں، اس نے رخ موڑ کر ان دونوں کو اشارے سے آنے کو کہا۔

”چلو زین! تماشہ مت، خواہ کہ احسن کو شک ہو جائے، جو ہونا تھا ہو چکا، چلو میرے ساتھ۔“ ارشد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر احسن کی طرف قدم بڑھائے۔

”طابی! ان سے ملو، یہ ہم جرا کی نندان کی شادی ہو گئی ہے، یہ کراچی ہی آئی ہیں رخصت ہو کر۔“ احسن نے

رطابہ کو باہر نکلوا کر بتایا تھا، اور اپنی مسر سے بھی ملوایا تھا۔ ان تینوں میں سلام دعا ہوئی تھی اور کاشنہ کی جلد بازی کو زین علی خان دیکھ رہا تھا، وہ بہت ہی جلدی وہاں سے جانا چاہ رہی تھی۔
 ”پلیز! آپ ہمارے گھر ضرور آئیے گا۔“ رطابہ نے اس کو فوراً دعوت دے ڈالی۔
 ”ہمارے ہاں لاہور میں بھی ضرور آئیے گا۔“ یسری نے بھی فوراً بول دیا تھا، جس پر احسن اس کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
 ”میں وعدہ نہیں کرتی اور میں یہاں اور کتنے دن تک ہوں معلوم نہیں، اگر زندگی رہی تو ضرور کوشش کروں گی۔“ ان کے خلوص پر جواب دیا اور آخر میں اجازت لیتے ہوئے فی بھری آنکھوں سے زین کی طرف دیکھ کر اپنے ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی۔

”چلیں زین! اب گھر چل بھی پڑیں، اور کتنا انتظار کرواؤ گے ان خواتین کو؟ جن کی اسکن سے میک اپ مکمل طور پر اتر چکا ہے۔“ احسن نے ان دونوں کو چھیڑتے ہوئے ارشد کو بھی دیکھا تھا جو ان دونوں کو گھورتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور مسکرا کر زین کو متوجہ کیا۔
 ”ہاں احسن! یہ لو چاہی، تم ڈرائیور کو، مجھ سے اب گاڑی نہیں چلے گی۔“ زین کی خاموشی کو سب نے نوٹ کیا تھا، خاص کر رطابہ نے اس کو بڑی ہی عجیب نظروں سے دیکھا تھا، زین، طابی اور یسری پیچھے بیٹھ گئے تھے اور ارشد کو اس کے گھر چھوڑ کر اپنے گھر روانہ ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

جیسے ہی کاشنہ گھر پہنچی تھی، تو گھر میں کوئی نہیں تھا، وہ سیدھی اپنے روم میں جا کر بیٹھ گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، دل ہی دل میں زین علی خان کو مخاطب کر کے کہا۔
 ”زین! تم میرے ساتھ اس سے برا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔“ اور روتے ہوئے سوچتی گئی تھی۔ ڈاکٹر سبحان جیسے ہی روم میں انتر ہوئے اس کو سوتا ہوا دیکھ کر حیران ہوئے اور فریض ہونے چلے گئے تھے۔ وہ ڈرائیونگ کے آگے کھڑے ہو کر بال سیٹ کر رہے تھے، کھڑ پڑکی آواز سے کاشنہ کی آنکھ کھل گئی، وہ اچانک سبحان کو دیکھ کر چونک گئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”بہت ہی دن لگا دیئے محترمہ! آپ نے تو آنے میں، میں تو سمجھا کہ اب ہم کو اکیلے ہی باہر شفٹ ہونا پڑے گا، اور آپ کا تو کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا آنے کا، کیا بات ہے، کیا چپ شاہ کار و زہ رکھا ہوا ہے؟“
 ”نہیں، ایسی بات نہیں ہے، میں تھک گئی تھی اور مجھے بہت انتظار کرنا پڑا تھا اپنے سامان اور ڈرائیور کا، آپ تو آئے ہی نہیں تھے، کال بھی پک نہیں کر رہے تھے، میں حقیقت میں پریشان ہو گئی تھی۔“ اپنی بات مکمل کر کے اس نے ڈاکٹر سبحان کو دیکھا تھا جو اس کی توجہ سے سن رہے تھے۔

”ارے نہیں میری جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں ایک آپریشن میں بڑی تھا، جس کی وجہ سے مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا، اور آج آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں، آئندہ مجھے بھی یہ آنسو نہیں دکھائی دینے چاہئیں، آئی سمجھ؟“ انہوں نے اس کی ناک کو دباتے ہوئے کہا۔

”کیا آج جانے نہیں ملے گی؟ اتنی دیر سے آیا ہوا ہوں، آپ نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔“
 ”ارے نہیں بھئی، بس میں 2 منٹ میں فریض ہو کر آئی ہوں، آپ کو چاہئے پلوانی ہوں۔“ اس نے بھی مسکرا کر پیروں کو بیڈ سے نیچے رکھا تھا۔

”2 منٹ کا مطلب سمجھتی ہوں، اگر اس سے زیادہ ہوئے تو پھر کیا ہوگا؟ جلدی اپنی سزا منتخب کرو۔“ انہوں نے بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے سے روکا۔
 ”آپ تو بس پتا نہیں کیسی باتیں کرتے ہیں، چھوڑیں میرا ہاتھ، اگر دیر ہوگی تو آپ کی ہی وجہ سے ہو رہی ہے، اگر آپ جانے دیں گے بھی تو میں جا کر جلدی آؤں گی، اب آپ بتائیں سزا کے لٹنی چاہیے، مجھے یا آپ کو؟“ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب میں سوال کر لیا تھا۔
 ”یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا ہے، آئی سمجھ؟ ابھی تو مجبوری ہے، جانے دے رہا ہوں، بعد میں پوچھوں گا آپ سے۔“ اس نے بھی مسکرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔

☆.....☆.....☆

زین علی خان آتے ہی اپنے روم میں آرام کی غرض سے چلے گئے تھے، انہوں نے رطابہ کو ڈسٹرب کرنے کو منع کیا تھا کہ وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتے ہیں۔ آج ان کے دل کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے تھے، انہوں نے بہت ہی مشکل سے اپنے اوپر کنٹرول کیا ہوا تھا، لیکن آج پھر کاشنہ کو دیکھ کر سب یاد آ گیا تھا، وہ بھی کیا کرتے؟ اپنی بہن کی محبت اور رشتوں کو جوڑ کر رکھنے پر مجبور تھے، انہوں نے اپنی نہیں، اپنی بہن، ماں باپ کی خوشی کو دیکھا تھا، انہوں نے دل میں کاشنہ کو مخاطب کر کے آئی ایم سوری! کہا تھا اور دل کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا۔
 ادھر کاشنہ بھی ملک سے باہر کے سفر پر روانہ ہو گئی تھی، پاکستان کو خیر باد کہہ چکی تھی، اپنے ماں، باپ، بھائی اور بھابی سے مل کر اپنی ساس، سرور شوہر کے ہمراہ وہ شارجہ چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہاں یہ لوگ ذکیہ پھو اور بی جان، بابا جان بھی حج کر کے آگئے تھے، احسن اور یسری کے ہاں خوبصورت سا بیٹا پیدا ہوا تھا، جس کی سب کو خوشی تھی اور وہ لاہور میں تھی، اور زین کے تو انتہائی سرد جذبات تھے، دل کرتا تو بات کر لیتا تھا، ورنہ زیادہ تر اپنے کام میں بڑی رہتا، جس کا رطابہ کو بہت ملال تھا، اس کو لاہور بھی لے کر نہیں گیا تھا، وہ بی جان اور بابا جان کے ساتھ ہی لاہور جاتی تھی، لیکن آج کل اس کی کنڈیشن ٹھیک نہیں تھی، جس کی وجہ سے وہ اپنے بھتیجے کو دیکھنے نہیں گئی تھی، یسری نے اس کو کہہ دیا تھا کہ میں خود آپ سے ملنے آؤں گی۔

☆.....☆.....☆

وقت کا پیرہ آگے سرکنا گیا، زین علی خان کے 2 بچے تھے، اسفند علی خان اور ارزل علی خان، جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑے ہو چکے تھے، بڑا بیٹا تو ڈاکٹر تھا جبکہ ارزل خان M.B.A کرنے کے بعد زین کے ساتھ آفس میں ہوتا تھا، بی جان کا انتقال ہو چکا تھا، جبکہ بابا جان اور ذکیہ پھو اپنے پوتے اور نواسہ، نواسی کے ساتھ بے حد خوش تھے، ان سب کا آنا جانا گارہتا تھا، زین کے کہنے پر ہی احسن انصاری نے اس کے ساتھ ہی بزنس کیا اور خوب ترقی بھی کی اور کراچی میں دونوں ایک ہی جگہ رہتے تھے۔

احسن انصاری کے 3 بچے تھے، اشعر، عثم اور چھوٹی بیٹی جو سب کی لاڈلی تھی عریشہ انصاری، جس کا نام زین علی خان نے رکھا تھا، ان کو عریشہ سے بے حد محبت تھی اور وہ اس کو اپنے بیٹے ارزل کی دہن بنانے کا خواب بھی دیکھ چکے تھے، لیکن ابھی وہ پڑھ رہی تھی اور چھوٹی بھی بہت تھی، انٹر کے فائنل پیپرز دے کر فارغ تھی، وہ اپنے بڑے بھائی سے تھوڑی بہت ڈرتی تھی، کیونکہ اشعر غصے کا بے حد تیز تھا، جس کی آج تک کسی کو کچھ نہیں آئی تھی کہ وہ ایسا کیوں ہے؟ حالانکہ ان کے خاندان میں کوئی بھی غصے کا تیز نہیں تھا۔

کاشنہ اور ڈاکٹر سبحان کے بھی 2 بچے تھے، اور دونوں بیٹیاں تھیں جو نہایت ہی خوبصورت اور ذہین تھیں، ان میں سے ایک طارم بھی اور دوسری ڈاکٹر نبیلا بھی، طارم نے میڈیکل لائن نہیں جو ان کی تھی، نبیلا نے M.B.B.S کمپلٹ کر لیا تھا اور آج کل ان دونوں کی پاکستان میں مستقل شفٹ ہونے کے لیے اپنے مال باپ سے ضد و مباہلہ کی جنگ چل رہی تھی، ان کا کہنا تھا۔

اپنا ملک اپنا ہوتا ہے، وہاں جا کر بھی کام کیا جاسکتا ہے، اور سب سے بڑھ کر تانی جان سے ملنا تھا اور ڈاکٹر سبحان کے والدین کا بھی یہی کہنا تھا کہ اب عمر کا آخری حصہ وہ لوگ پاکستان میں گزارنا چاہتے ہیں جبکہ کاشنہ تو صرف اپنے شوہر کی ہر بات مانتی چلی آئی تھیں، ان کا ہمیشہ ہر فیصلہ ان کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا اور بیٹیوں پر تو ان کا اثر بھی نہیں پڑا تھا، وہ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، طارم نے تو انجینئرنگ کی لائن اپنی مرضی سے سلیکٹ کی تھی اور طارم کے بعد نبیلا کو بچپن سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ ایک کامیاب ہارٹ اسپیشلسٹ تھی، وہ دل میں ٹھان چکی تھی کہ طارم کے ساتھ، دادا، دادی کے ساتھ مل کر ماما، پاپا کو راضی کر لے گی، ڈاکٹر سبحان نے ان دونوں کی ضد کو دیکھتے ہوئے پاکستان کے شہر کراچی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اور پوری تیاری مکمل کر کے اپنے آنے کی اطلاع سعد بخاری کو دے چکے تھے۔

سعد بخاری کے 4 بچے تھے، بڑا بیٹا کامیاب برنس مین تھا جس کا نام برنس ورلڈ میں بہت ہی فیس تھا، فہد بخاری، غیرہ بخاری، احمد بخاری اور چھوٹی بیٹی سیکہ بخاری تھی جس کی شرارتیں ہی بھی ختم نہیں ہوتی تھیں۔

عالیہ بخاری ان سب کو اپنے گھر دیکھ کر بے حد خوش تھیں، بیٹی کو سامنے پا کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور رونے لگی تھیں، جڑ اور سعد بخاری نے بھی اس کو گلے سے لگا کر محسوس کیا تھا، آج وہ لوگ بھی اس کو بہت عرصے بعد دیکھ رہے تھے، 25 سال اس کی شادی کو ہو گئے تھے اور وہ آج بھی ویسی کی ویسی ہی دھنکی تھی، ماں اور بھائی بھانج کو وہ آج بھی اپنی اولاد کی طرح عزیز تھی، فہد تو اس کی شکل دیکھ کر حیران تھا کہ اس کی پھوپھی ایسی ہی دھنکی ہیں جیسی وہ بچپن میں دیکھتا تھا بلکہ وہ تو مذاق اڑا رہا تھا۔

”آپ ابھی تک بڑی نہیں ہوئیں، وہی بچوں کی طرح روتی ہیں؟“ جس پر سب کا قہقہہ لگا تھا اور وہ اپنے چھپا جان سے مخاطب ہوا۔

”کیا چھپا جان! آپ نے تو ان کی کوئی بھی عادت نہیں بدلی، یہ تو آج بھی اسی طرح روتی شکل والی ہیں، میں تو سمجھا تھا کہ تھوڑی بڑی ہو گئی ہوں گی، میں نے آج سے پہلے بھی آفس سے آف نہیں کیا، لیکن کاشنہ کی وجہ سے آف پر ہوں، کیوں کاشی! ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟“ پیار بھری نظر اور نام لے کر اس کو مخاطب کیا تھا۔

”بہت بُری بات ہے یہ بیٹا! آپ بڑے ہو گئے ہو اور کاشی کا نام لے رہے ہو، ٹھیک جا رہے ہو آپ۔“ سعد بخاری نے فوراً سے فہد بخاری کو ٹوکا تھا۔

”سوری بابا جان! اگر یہ مجھ سے کچھ سال عمر میں بڑی ہیں اور میرے بڑی دھنکیں تو میں ان کو پھوپھو کہتا، لیکن یہ دیکھیں اور آپ خود فیصلہ کریں، کیا یہ مجھ سے بڑی اور میری پھوپھو دھنکی ہیں؟“ فہد بخاری نے آگے بڑھ کر کاشنہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنے برابر میں کھڑا کر دیا تھا، جس پر پوری محفل زعفران زار بن گئی تھی، اور کاشی نے نہایت ہی گھور کر اسے دیکھا تھا۔

”او کے سوری کاشی! معاف کرو، کوشش کروں گا کہ پھوپھو نہ کہوں آپ کو۔“ پھر کاشنہ کو گلے سے لگا کر ماتھے پر نہایت ہی عقیدت سے بوسہ دیا تھا اور اپنے ساتھ لے کر بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں بھئی، باقی لڑکیاں اپنا تعارف کروائیں گی بھی یا نہیں؟ یا پھر اپنی ماما کی طرح ہی چپ رہتی ہیں؟ ذرا جلدی جلدی تعارف کرواؤ تم دونوں بھی۔“ فہد نے اب ان دونوں کو دیکھا تھا جو عالیہ بخاری کے دائیں اور بائیں بیٹھی بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔

”بالکل بیٹا! اگر آپ نے کسی کو بھی بولنے کا موقع دیا ہوتا، تو وہ ضرور اپنا تعارف کروا تیں، شکر ہے ان سے پوچھ لیا، ورنہ وہ دونوں تو شکل سے ہی کتنی سیدھی لگ رہی ہیں۔“ سعد بخاری نے اس کی طرف دیکھ کر فوراً اپنی چھانچوں کی شکل دیکھی تھی، اور وہ دونوں شکل سے ہی شرارتی لگ رہی تھیں اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

”بابا جان! غلطی معاف، لیکن اب ان کو اپنے تعارف کروانے کا موقع دیا جاتا ہے، یہ اب بتا سکتی ہیں کہ یہ کیا کرتی ہیں؟“ فہد نے مسکرا کر پھر کاشی اور اپنی کزنوں کو دیکھا تھا۔

”بالکل جناب! ہم کیوں نہیں بتائیں گے کہ ہم کون ہیں، کیا کرتے ہیں؟ شکر ہے آپ نے ہم کو موقع تو دیا بولنے کا، ورنہ تو آج تک لیڈ بڑی کو کہا جاتا ہے کہ وہ بہت بولتی ہیں، لیکن آپ کو دیکھ کر تو ایسا نہیں لگتا کہ اب لڑکے بھی کم بولتے ہیں۔“ طارم نے بھی دو دو جواب دیا اور اپنا تعارف کروایا، نبیلا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”کاشی! کیا واقعی میں یہ تمہاری بیٹیاں ہیں؟“ فہد نے کاشی کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔

”بہتیز! یہ بھی بالکل تمہاری طرح ہیں، چٹکے چھوڑتی ہیں، مجھ پر نہیں گنیں اور تم کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ تمہارے اوپر چلی گئی ہیں، کیوں ڈاکٹر صاحب! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟“ اس نے ڈاکٹر سبحان کو مخاطب کیا تھا جو کاشنہ کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے اور مسکرا کر سر بھی اٹھاتے میں ہلا دیا تھا۔

”چلو بھئی بچو! فریش ہو جاؤ، ابھی وہ تینوں بھی آنے والے ہیں، جو تم سے بھی بڑھ کر ہیں، میں نے کھانے کا انتظام مکمل کر لیا ہے۔“ جرات نے اپنے بیٹے سے کہا تھا، جس پر وہ مسکرا کر ”جو حکم دام!“ کر کے رہ گیا تھا اور کاشی کو مسکرا کر محبت بھری نظر سے دیکھنے لگا تھا۔

ادھر زین علی خان آج کل کچھ تھکاوٹ فیل کر رہے تھے اور ارزل سے ان کی بحث بھی چل رہی تھی کہ وہ کچھ عرصہ ریٹ کریں، وہ اور احسن انکل برنس دیکھ لیں گے اور عشم بھی اشعر کے ساتھ ہی برنس کو دیکھ رہا تھا اور اگر کوئی مسئلہ ہوگا تو وہ ان کو ضرور بتائیں گے، جس پر زین بالکل بھی راضی نہیں ہو رہے تھے، لیکن جب بابا جان نے ان کو کہا تو وہ چپ ہو گئے تھے۔

”ہاں زین! اب آپ کچھ دن ریٹ کر لو تو زیادہ اچھا ہے، اتنا بھی مشین مت بناؤ اپنے آپ کو۔“ ذکیہ پھوپھو نے بھی ان کو پیار بھری نرمی سے ڈانٹا تھا۔

”او کے، جیسے آپ لوگوں کی مرضی، لیکن مجھے روز کار و کار ضرور بتانا۔“ انہوں نے احسن کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

”ارے میرے یار! فکر مت کرو، جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ماں باپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

تم بے فکر ہو جاؤ اور کسی ڈاکٹر کو بھی دکھاؤ۔“ احسن نے مخلصانہ مشورہ بھی دیا تھا۔
 ”کیا ہو گیا ہے؟ میں کوئی بیمار نہیں ہوں، آئی سمجھ؟ عریشہ کہاں ہے، آج آئی نہیں وہ؟“ انہوں نے بات پلٹ کر عریشہ کی طرف کر دی تھی۔
 ”تم سے کوئی بھی نہیں جیت سکتا میرے بار! وہ گھر میں ہے، آج اشعر نے اس کو کام پر لگایا ہوا ہے، کہو تو بلو اودو؟“ انہوں نے سیل فون کان سے لگا کر بات مکمل کی اور یسری کا نمبر بھی ڈائل کر دیا تھا، جو کہ کال اشعر انصاری نے ریسیو کی تھی۔

”پلیز بیٹا! اگر آپ کوئی کام نہیں کر رہے ہو تو عریشہ کو بھیج دو۔“
 ”پاپا! میں تو کام سے جا رہا ہوں، آپ عریشہ کو عشم سے کہہ کر بلو لیں۔“
 ”بیٹا! عشم یہاں نہیں ہے، اچھا آپ جاؤ، میں ارڈل کو کہہ دیتا ہوں، ٹھیک ہے، اللہ حافظ!“ پھر احسن نے لائن ڈراپ کر کے ارڈل کو بھیج دیا تھا۔

”بھئی طابی! آج کچھ اچھا سا اپنے ہاتھ کا پکا کر کھلاؤ، کیونکہ آج میں نے بھی آفس نہیں جاتا ہے اور آج تو چھٹی بھی ہے، بہت دن ہو گئے ہیں تمہارے ہاتھ کا کچھ کھائے ہوئے، ذرا ہاتھ پیر چلاؤ، پتہ چلے رنگ نہ لگ جائے تم کو اس عمر میں، پھر زین کا کیا ہوگا؟ اس کو اس عمر میں تو کوئی دوسری بھی نہیں دے گا، لڑکی والے کہیں گے ان بڑے میاں کے اتنے بڑے بچے ہیں، ہم کو داماد چاہیے چچا نہیں۔“ زین نے اس کو گھورتے ہوئے اپنے بابا جان کو دیکھا تھا، جو مسکرا رہے تھے اور چھپوٹے بھی بیٹے کو گھر کا تھا۔

”دنیا بدل جائے گی، لیکن احسن انصاری سدھر جائے..... ناممکن بات ہے۔“ طابی بھی جب کرپکن میں چلی گئی تھی اور دروازے پر کھڑی یسری اور عریشہ مسکرا رہی تھیں اور اندر کی طرف قدم بڑھاتے تھے۔ یسری نے بھی مسکرا کر زین اور احسن کو دیکھا تھا اور پکن میں چلی گئی تھی، جبکہ عریشہ دوڑتی ہوئی زین کے برابر میں بیٹھ گئی تھی اور بچوں والے سوالات کر رہی تھی جس پر زین مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے، اس میں ان کو اپنی بیٹی کی شکل دھنکی تھی، اور وہ عریشہ کو دل و جان سے چاہتے تھے۔

”ناموں جان! کہیں گھونٹنے چلتے ہیں، بڑا مزہ آئے گا، صرف میں آپ اور نانا جان اور دادو، کیا خیال ہے؟ اور ان سب کو گھر میں چھوڑ جائیں گے۔“ وہ نہایت ہی رسلو آواز میں زین سے کہہ رہی تھی، یہ دیکھتے بغیر کے اس کی آواز احسن اور ان کے پیچھے صوفے کے عقب میں کھڑے ارڈل خان تک پہنچ رہی تھی۔ زین نے اس کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور آنکھوں میں اشارہ بھی کیا تھا جس کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔

”بہت خوب... تو یہاں یہ سب چل رہا ہے، ہم کو کہا جا رہا ہے کہ ہم سب گھر میں رہیں، دیکھ لیں دادا جی! آپ کی نواسی کی شر انگیزیاں، ہمارے ہی والد صاحب سے ہم کو بی کاٹنے کو کہا جا رہا ہے، اور بابا جان کو تو دیکھو، اس باؤلی کو اشارہ کر رہے ہیں کہ چپ ہو جاؤ، پیچھے میں کھڑا سب سن رہا ہوں، لیکن مجال ہے جو ہماری عریشہ بی بی کو پر یک لگ جائیں، کس قدر چالاک لڑکی ہے، آنے دو اشعر بھائی کو، پھر دیکھتا ہوں تم کیسے ہم کو چھوڑ کر ٹینک مناؤ گی، بندر یا کی شکل والی....!“ ارڈل خان نے اس کے بال پیچھ کر فوراً ہی احسن انصاری کے برابر میں جبکہ سنبھلی تھی۔

”تم خود ہو گے بندر کی شکل والے، بڑے آئے... اور ہمارے ساتھ بندر کا جانا ممنوع ہے، پاپا کا تو پھر بھی ہم سوچ سکتے ہیں کہ ان کو لے کر چلے جائیں، لیکن تمہارا تو بھی بھی نہیں، پہلے اپنی شکل تو دھو کر آؤ۔“ اس نے بھی

ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ احسن انصاری کے اپنی بیٹی کے مکالمات سن کر جو کان کھڑے ہوئے تو ہونے، لیکن یسری انصاری تو اس سے بھی زیادہ حیران تھیں۔
 ”بہت خوب بیٹا! اب آپ اپنے باپ کو لے کر جانے پر سوچو گی، شاباش ہے بھئی!“ انہوں نے تھوڑا سا جھک کر عریشہ کو دیکھا تھا جو فوراً ہی زین کے گلے لگ کر چھپ رہی تھی، کیونکہ اس کی نظر اپنی ماما پر پڑ چکی تھی۔
 ”اور کچھ رہ گیا ہو تو وہ بھی آپ کہہ دو، کچھ اور کس ربائی نہ رہ جائے، یہی تربیت کی ہے ناں ہم نے تمہاری کے اپنے سے بڑے بھائی کو نام سے پکارو، اور بندر کہہ کر مخاطب کرو؟ آپ کو شرم تو نہیں آتی ہے بالکل بھی۔“ یسری نے نہایت ہی غصے سے اس کو مخاطب کیا تھا۔

”اور آپ بھائی! اس کو سمجھانے کے بجائے بولنے دے رہے ہیں، آج تک آپ کی لوجک مجھے سمجھ نہیں آئی، معلوم نہیں یہ لڑکی کس پر چلی گئی، پورے گھر میں ایک اکلوتی ہے اور اس پر بھی یہ حال ہے، اور پائی داوے! آپ لوگ کہاں جانے کا پلان، کب بتا رہے ہیں؟ ذرا مجھے بھی تو معلوم ہو، بہت اچھی طرح کان کھول کر سن لو، آج کے بعد اگر ارڈل کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

”مما! پھر ارڈل کو بندر بھائی بولنے پر تو آپ کو اعتراض نہیں ہے ناں، آپ نے صرف نام کو کانگ کرنے کو منع کیا ہے ناں؟“ عریشہ نے دنیا جہاں کی مصیبت طاری کر کے ایک دفعہ پھر سے ارڈل کو ٹارگٹ کیا تھا اور مسکرا کر زین کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

”عریشہ...!“ ارڈل ایک دفعہ پھر اس پر چبھتا تھا۔
 ”تم کو چھوڑو گا نہیں میں۔“ وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ کمرے میں موجود تمام لوگ عریشہ کی حرکت پر مسکرا کر رہ گئے تھے۔

”ارے اب ایسا بھی کیا کہہ دیا بچی نے، جو تم اتنا برس رہے ہو؟ جاؤ کھانا لگاؤ، سب بیٹھے ہیں۔“ ذکیہ بیگم نے مسکراتی ہوئی نظر دوں سے پونی کو دیکھا اور سب کو منایا تھا۔

”معلوم نہیں کیا ہوگا اس لڑکی کا، کچھ بھی سمجھاؤ، سمجھ میں نہیں آتا اس کو، جیسی تو اشعر غصہ ہو جاتا ہے، یہ لڑکی جانے اور ان کے ماموں اور باپ، میری توبہ جو میں آج کے بعد اس کو کچھ سمجھاؤں۔“ یہ کہتے ہی وہ آگے بڑھی تھیں۔

”مما پھر بچی والی تو بہت کچھ گاتا کہ آپ کو بار بار نہ کرنی پڑے۔“ اس نے دوبارہ سے اپنی زبان کو زحمت دی، جس پر فوراً ہی اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا، یسری اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر اور ایک نظر احسن اور عریشہ کو گھور کر چلی گئیں۔

”بہت شرارتی ہو رہی ہو تم، اب اپنی ماما کی عدالت میں خود تو کھڑی ہو گی اور مجھ مظلوم کو بھی کھڑا کرواؤ گی، یارا زین سمجھاؤ اس کو کہ ہر وقت ارڈل سے نہیں لڑا کرے، ذرا جو آج کی نسل میں برداشت ہو، یہاں ہم اپنی بات کر رہے تھے اور ان لوگوں نے لڑنا شروع کر دیا، چلیں ارڈل بیٹا! ہم سب کھانا کھاتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ذکیہ بیگم اور بابا جان کے ساتھ چلے گئے۔

”بہت مزہ آیا ناں ماما جانی!“ عریشہ نے زین کے ہاتھوں کو تھام کر پیار سے کہا اور دروازے کی طرف دیکھا جہاں ارڈل کھڑا تھا، عریشہ نے اس کو منہ چڑایا اور زین کو مسکرا کر دیکھنے کی گئی۔

”چلیں بابا! کھانا کھالیں، اگر آپ کے مذاکرات ختم ہو گئے ہوں تو۔“ وہ تپ کر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”چلو بھئی، چلتے ہیں، باقی بعد میں شرارتیں کرنا، ورنہ ابھی آپ کی مہمانداری کی میٹنگ ختم ہونے کا نام نہیں لے گی۔“ ان دونوں نے ڈانٹنگ ٹیبل کی طرف قدم بڑھائے تھے جہاں خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آج اس کی سینئر ڈاکٹر کے ساتھ میٹنگ کا پہلا دن تھا اور فرسٹ ڈے ہی وہ لیٹ ہو رہی تھی، جس کا ڈاکٹر یہاں کافرٹوں سے بھرنا تھا، اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی، وہ جلدی جلدی کے چکر میں بیڑھیاں چڑھ رہی تھی، وہ فوراً میٹنگ روم میں داخل ہوئی تھی، جہاں پہلے ہی سے بہت سارے ڈاکٹر موجود تھے۔

”May i come in?“ اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے اجازت چاہی تھی، حالانکہ وہ اندر داخل ہو چکی تھی۔

”اگر آپ کے ہاں روم میں داخل ہونے کے بعد اجازت لیتے ہیں تو میں آپ کو نہیں روکوں گا اور صرف اتنا کہوں گا کہ Have a seat please۔“ ڈاکٹر اسفند نے اس کو مسکرا کر دیکھ کر کہا۔

”سوری سر! وہ مجھے دیر ہوگئی اور دھیان نہیں رہا۔“ اس نے گھبراہٹ میں کہا اور سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”It's ok۔“ ڈاکٹر اسفند نے اس کو دیکھ کر تمام ڈاکٹر کی طرف نظر کی تھی جو اس لڑکی کو نہایت حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔

”کیا خیال ہے اب ہم Introduction کی طرف بڑھیں؟“ انہوں نے پھر باری باری سب کا Introduction لیا اور آخر میں ڈاکٹر نے کہا کہ وہ اب اپنا تعارف کروائیں۔

”میرا نام ڈاکٹر یہاں ہے، میرے فادر ڈاکٹر سبحان ہیں اور ہم حال ہی میں شاہجہ سے آئے ہیں، میری ڈیوٹی اسی اسپتال میں لگی ہے، میں ہارٹ اسپیشلسٹ ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کروا کر سیٹ کی طرف قدم بڑھائے تھے، تمام ڈاکٹر اس سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے، ڈاکٹر سبحان کو تو سب ہی بہت اچھے طریقے سے جانتے تھے، کیونکہ ان میں سے کچھ ڈاکٹر انہوں نے ہی Teach کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دن اسی طرح آگے بڑھتے جا رہے تھے، ڈاکٹر یہاں کا اسٹائل بالکل اپنے فادر کے جیسا تھا، وہ بہت ہی زیادہ سختی تھی اور اس نے اپنے آپ کو منوایا بھی، اسپتال میں سب اس کو بہت احترام سے مخاطب کرتے تھے اور ہر کوئی اس سے بے حد خوش تھا۔

کاشن آج کل بہت چپ سی تھیں، ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ آج کل کن سوچوں میں ڈوبی ہوئی رہتی ہیں، ان کو صرف اپنی دونوں بیٹیوں کی فکر تھی اور وہ بہت مرتبہ ڈاکٹر سبحان سے ذکر کر چکی تھیں، لیکن وہ کبھی دے دیتے اور کبھی فکرت کروا بھی انہوں نے یہی ذکر کیا تھا جس کو جراثیمی نے سن لیا تھا۔

”کاشی! تم اتنی فکر پال کر بیٹھی ہو، میرا بھی خیال نہیں کیا کہ اپنی پریشانی کا ذکر مجھ سے کرو، اور سب سے بڑی بات، جب گھر میں لڑکے موجود ہیں تو تم کیوں سوچ رہی ہو! نانا سیدھا؟ کیا میری محبت میں کوئی کمی دیکھی ہے تم نے، جب میں تم کو اتنا چاہتی ہوں تو تمہاری اولاد کو کتنا چاہوں گی، یہ نہیں سوچا تم نے ایک دفعہ بھی؟ پاگل ابھی ہم ہیں ناں، وہ تو آج میرا ادھر آنا ہو گیا تو سن لیا ورنہ تم تو بتاتی بھی نہیں۔“ انہوں نے اس کو ناراضی سے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ میں....؟“ ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی ہو آپ محترمہ! اور تمہارا خون ہے، میرا کوئی اتنا بڑا میکہ تھوڑی ہے اور میں فہد کے لئے ہی تمہاری بیٹی کو لوں گی، تم اپنے آپ کو اتنا پریشان نہیں کرو، جیسے تمہاری بیٹیاں ہیں ویسے ہی میری بھی بیٹیاں ہیں وہ اور بے فکر ہو کچھ بھی برا مت سوچو، آئی سمجھ؟ چلو میرے ساتھ گھر چلو تم۔“ جرات نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔

”جی بھائی! آؤں گی، شام تک آؤں گی، جب تک بچے اور سبحان بھی آجائیں گے۔“

”ارے چلو میرے ساتھ، سب کو میں کال کر کے گھر بلاؤں گی، چلو لاک کرو گھر اور چلتے ہیں۔“ جرات نے اس کی ایک بھی نہیں سنی تھی اور اسے ساتھ گھر لے کر آگئی تھیں۔ گھر جا کر فہد کو کال کر دی تھی کہ طارم اور یہاں کو پک کر کے گھر لے کر آ جاؤ، اور ڈاکٹر سبحان کو بھی نہیں آنے کا کہہ دیا تھا۔ غیرہ تو آتے ہی فوراً کاشن کے گلے لگ گئی تھی اور کہنے لگی۔

”اللہ تعالیٰ نے پچھو پچھو دی تو وہ بھی ایک، اور پچھو پچھو بھی وہ جو اتنی مغرور ہیں، ہم سے ملنا ہی پسند نہیں کرتی ہیں۔“ یہ غیرہ کے تار خیالات تھے، جن کا اثر لے کر اس کے ساتھ ہی احاد اور سب کا نے بھی ہاں میں ہاں کی تھی۔

”سن رہی ہیں مئی! اپنی پوتی اور پوتے کے خیالات دیکھیں ذرا، یہ لوگ میرے بارے میں کتنا برا سوچتے ہیں۔“ کاشن نے روٹھائی سی شکل بنا کر اپنی مٹی کو مخاطب کیا تھا۔

”ان سب کو تو عادت ہے ایسے ہی فالٹو بولنے کی، یہ بتاؤ تم لوگوں کے بابا کب تک آئیں گے؟ 4 تو بج ہی گئے ہیں، کال کرو غیرہ! اور معلوم کرو، اور ہاں فہد سے بھی کہو دونوں بیٹیوں کو جلدی لے کر آ جائے۔“ اتنا کہہ کر وہ کچن میں چلی گئیں۔

”السلام وعلیکم پاپا! ماما کہہ رہی ہیں آپ کو گھر آنے میں کتنا تاخیر لگے گا؟“ غیرہ نے مسکرا کر سعد بخاری سے پوچھا تھا۔

”بس بیٹا! راستے میں ہوں، پہنچ رہا ہوں اور طارم میرے ساتھ ہیں فہد، یہاں کو لینے گیا ہوا ہے، ٹھیک ہے؟“۔ ان کی بات مکمل ہونے تک غیرہ نے خدا حافظ کر کے لائن ڈراپ کی اور اپنی مٹی کو بتانے چلی گئی تھی۔

”ڈاکٹر یہاں کو بھیج دیجئے کہہ دیں ان سے باہر ان کے گھر سے کوئی ان کو لینے آیا ہے۔“ یہاں کا سیل مسلسل آف جا رہا تھا، ابھی سعد کو Reception پر آنا پڑا تھا۔

”اوکے، آپ انتظار کریں، میں آپ کو تھوڑی دیر میں انفارم کرتی ہوں۔“ نیچے سے Receptionist نے کال اوپر کی تھی اور ان کو کہا گیا تھا کہ آ رہی ہیں وہ، اس نے فوراً ہی فہد کو انفارم کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے فہد بخاری تھوڑی دیر کے لیے اور بیٹھ گئے تھے کہ اتنے میں وہ لفٹ کے ذریعے سامنے سے آئی ہوئی دکھائی دے گئی تھی۔

”السلام وعلیکم! کیسے ہیں آپ؟ میں معذرت چاہتی ہوں آپ کو میرا انتظار کرنا پڑا۔“ ڈاکٹر یہاں نے شرمندہ ہوتے ہوئے فہد بخاری سے کہا تھا۔

”علیکم السلام! اور ایسی کوئی بات نہیں ہے، چلیں جلدی کیجئے، گھر پر ماما اور سب لوگ کھانے پر انتظار کر رہے ہیں، صرف میں اور آپ رہ گئے ہیں۔“ فہد نے جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

”لیکن سنیں! پہلے آپ مجھے گھر ڈراپ کر دیجئے، میں فریش ہونے کے بعد گھر آ جاؤں گی۔“

”ایسا کوئی میرا ارادہ نہیں ہے، مئی کا حکم ہے کہ کاشی گھر رہی ہیں اور طارم بھی بابا کے ساتھ پہنچ چکی ہے، تو رہ گئے آپ اور میں، آپ گھر چلیں وہیں پر فریش ہو جائیے گا۔“ اس نے یہاں کا ہاتھ پکڑ کر پارکنگ کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

”اوکے..... چلیں آپ گھر ہی لے چلیں۔“ اس نے بھی زیادہ بحث نہیں کی تھی، حالانکہ آج وہ بہت تھک چکی تھی اور وہ صرف چائے پی کر سونے کے موڈ میں تھی، لیکن فہد بخاری جو پیچھے پڑ گیا تھا، اس کی وجہ سے وہ اس کے گھر جانے کو راضی ہو گئی تھی۔ فرنٹ ڈور اوپن کر کے فہد نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا، ڈاکٹر یہاں نے کمر سیدھی کرنے کے لیے بیک سیٹ سے ٹیک لگائی تھی اور آنکھیں موند لی تھیں، فہد بخاری نے نہایت ہی محبت بھری نظروں سے اس کو دیکھا تھا اور دور سے یہ سارا منظر ڈاکٹر اسفند نے دیکھا اور اسپتال کے اندر چلے گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر سبحان جب پہنچ چکے تو وہ بھی ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے، یہ دونوں اندر جیسے ہی آئے تو کاشنہ کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی تھی کہ ان دونوں کی جوڑی ایسے ہی برقرار رہے، ڈاکٹر سبحان نے کاشنہ کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا، وہ بھی ان کا اشارہ سمجھ چکے تھے، سب کو سلام کر کے یہاں نے اپنی ماما کو اشارہ کیا تھا کہ وہ پہلے فریش ہوگی۔ عیبرہ نے اس کا اشارہ دیکھ لیا تھا اور وہ یہاں کو لے کر اپنے روم میں چلی گئی تھی۔

”یہاں! تم یہاں پر بیٹھو، میں تم کو اپنا کوئی سوٹ دیتی ہوں، فریش ہو جانا۔“ اس نے اس کو اپنا نیا سوٹ دیا تھا، جس کو پہن کر وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی، فریش ہو کر ڈائٹنگ ٹیبل تک گئی تھی اور اپنی ماما کے برابر بیٹھ کر ان کو بالکل رسلو آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔

”ماما جانی پلیز! میں یہ سب کچھ نہیں کھا سکتی ہوں، آپ صرف چائے کا کہہ دیں، میں وہ پی کر سو جاؤں گی، تو پھر کھانا کھاؤں، آپ کو تو معلوم ہے ناں؟“ اس کے برابر والی چیئر پر بیٹھا فہد بخاری بخوبی اس کی آواز سن رہا تھا، اور وہ مستقل اپنی ماما سے چائے کی فرمائش کر رہی تھی۔

”بیٹا! آپ تو کچھ بھی نہیں لے رہی ہو، یہ لو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں اتنے کھانے اور تم لے ہی نہیں رہی ہو، کیا کچھ اور کھاؤ گی تو بتاؤ، میں بنوادیتی ہوں؟“ بڑا ماما نے پریشان سی اس کی شکل دیکھی تھی۔

”نہیں ماما! میں یہ سب..... میرا مطلب ہے نہیں لوں گی، میں صرف.....!“

”ماما! بوا سے کہہ دیجئے ذرا چائے تو لے کر آ جائیں وہ۔“ اس کے بولنے سے پہلے ہی فہد نے چائے منگوائی تھی اور کاشی نے تھوڑا آمک کر اس کو مسکرا کر دیکھا تھا۔

”بیٹا! ابھی کھانا کھاؤ، پھر چائے آئے گی۔“ ماما نے اس کو گھر کا تھا۔

”نہیں ماما! آپ پلیز 2 کپ منگوائیں تو۔“ اس نے بھی ضد کی تھی۔

”اوکے، بوا! ذرا چائے لا دیں ان کو۔“

”اس کو آپ کاشی کی طرح اپنا گھر سمجھ لیں اور یہ تکلف مت کیا کریں، آئی سمجھ ڈاکٹر صاحبہ! کیوں کاشی! ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟ جیسی خود ہو کاشی! ویسی ہی آپ کی اولاد بھی۔“ اس نے اس وقت بھی اپنی دوسروں کو چیخنے والی طبیعت کو کسی خاطر میں نہیں لانے دیا۔

”تم کو تو فہد کے بچے! بعد میں دیکھوں گی، چلو یہاں چائے پیو اور جا کر لیٹ جاؤ۔“ اس کو لتاڑنے کے

ساتھ یہاں کو بھی ہدایت دی تھی۔

”کاشی! انہم سے یقین کرو، میری تو ابھی تک شادی نہیں ہوئی، اور یہ بچوں کا بھی ذکر کر دیا، کیوں بدنام کر رہی ہو؟“ بات کا رخ اس نے اس طرح سے موڑا تھا کہ کاشی کے ساتھ ساتھ یہاں نے بھی حیرانگی سے اس کو دیکھا تھا، اس نے زندگی سے بھر پور تہقیر لگایا تھا، ان دونوں کو بے وقوف بنانے میں۔

”بھائی! خدارا..... کھانا کھاؤ اور پھوٹو بھی کھانے دیں، آپ نے دیکھا نہیں کہ ماما آپ کو کس طرح دیکھ رہی ہیں؟“ عیبرہ نے فہد کو ٹوکے ہوئے حرا کی طرف توجہ دلائی۔

”اوکے، اوکے..... ماما! آئی ایم سوری!“ اس نے فوراً سر کو پلیٹ کی طرف جھکا دیا اور کھانا کھانے لگا۔

☆.....☆.....☆

ارڈل خان نے اپنی ماں پر طابہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ شادی عریضہ سے کرے گا، یہی وجہ تھی کہ رطابہ نے لیسری کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی اور وہ سب بے حد خوش تھے، اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا جس کو خوشی نہ ہو، سوائے اشعر انصاری کے اس نے سختی سے لیسری کو منع کر دیا تھا کہ وہ اس کے حق میں نہیں ہے، اس کی بہن بہت چھوٹی ہے، اور اس کی بڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی ہے، اس کا سختی فیصلہ تھا، جس پر سب ہی ہونٹ تھے۔

”آخر بیٹا! آپ کو کیوں اعتراض ہے؟ ہم منگنی کر دیں گے اور شادی بعد میں کریں گے۔“ دادی نے بھی سمجھایا تھا، اور لیسری نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ بابا جان نے زین کو کہہ دیا تھا کہ وہ بھی عریضہ کو ارڈل کے لیے لیں گے۔

☆.....☆.....☆

”کاشی! اگر میں آپ سے کہوں کہ میں آپ کی بہت ہی قیمتی چیز مانگوں گا، یا پھر آپ مجھے اپنی فرزندگی میں لے لیجئے تو کیا آپ سے میں یہ امید رکھوں کہ آپ میری بات کا جواب ہاں میں دیں گی؟“ فہد بخاری نے اس کا سب سے پہلے اظہار کاشنہ سے کر دیا تھا، آج وہ کاشی سے ملنے اکیلے آیا تھا اور اپنے دل کی بات بھی کر دی تھی۔ کاشنہ بہت ہی حیران اور خوش ہو کر اپنے سامنے بیٹھے فہد کو دیکھ رہی تھیں، ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی دعا اتنی جلدی پوری ہو جائے گی، ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

”ارے یہ کیا..... کیا میں اتنا بڑا ہوں جو آپ رونے لگیں؟ لیکن میں تو آپ کے پاس بہت امید لے کر آیا ہوں، پلیز! میری درخواست پر غور ضرور کریں کاشی!“ اس نے بھی بات کو گھما کر شرارتی انداز میں کہا تھا۔

”بہنیز! لڑکے! تم بہت تیز اور شرارتی ہو، بھروسہ تم کو میں بتاتی ہوں۔“ اور کاشنہ نے اس کو کٹھن کھینچ کر مارا تھا اور ہنسنے لگی تھیں۔

”یہ بتاؤ، کیا کھاؤ گے؟ ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے اکل بھی آنے والے ہیں، تم بتاؤ، میں کچھ کچا دیتی ہوں۔“ اس نے بھی بات کو پلیٹ دیا تھا۔

”کچھ نہیں کھاؤں گا میں، بس آپ میری اور ڈاکٹر یہاں کی شادی کروادیں۔“ اور وہ اس کی بات پر مسکراتی ہوئی وضو کرنے چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

”یہ تو بہت اچھی بات ہے ماما! کہ آپ نے پوری بات بتا دی، زین علی خان صاحب آپ کو تو میں بتاؤں گا، اپنی بھینچو کے ساتھ کیا جانے والا دھوکا، میں سب کے سامنے لاؤں گا، اس کا بدلہ تو میں آپ سے لوں گا، آپ کیا

سمجھتے ہیں اپنے آپ کو؟ سب انجان ہیں، مگر میں نہیں ہوں، بس مجھے اس عورت تک پہنچ جانے دیں، سلیس تباہ کر دوں گا، میرا نام بھی اشعر انصاری ہے، اور اپنی بہن کی شادی تو میں کبھی بھی ارذل خان سے نہیں ہونے دوں گا، یہ تو آپ بھول ہی جائیں کہ میرا انکار قرار میں نہیں بدلے گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، اشعر انصاری نام ہے میرا بھی۔“

☆.....☆.....☆

سعد بخاری کا بھی بزنس میں نام تھا اور وہ بہت ہی مشہور تھے، ان کے بارے میں احسن انصاری بھی بخوبی واقف تھے اور آج کل ان کی بہن آگئی تھیں مستقل طور پر، تو احسن نے یسری سے ذکر کیا تھا، اور یہی ان کی تمام باتیں اشعر نے سن لی تھیں، ایک دفعہ یسری نے رطابہ سے پوچھا بھی تھا کہ وہ حرا بھائی آپ کا بہت پوچھتی ہیں، اب جب رطابہ کراچی میں تھی، تو حرا لوگ بھی یہیں شفٹ ہو چکے تھے، ان تمام باتوں کی کڑی کہیں نہ کہیں زین سے لٹی تھی، جس کا کوئی بھی برملا اظہار نہ کرتا تھا۔

”آخر آپ لوگوں کو میری بات سمجھ کیوں نہیں آتی ہے؟ جب انکار ہی کرتا ہے تو ابھی کیوں نہیں؟ اور آپ لوگ مجھ کو فورس مت کریں، کیونکہ میری ناں، ہاں میں نہیں بدلے گی۔“ دو ٹوک لہجے میں بات ختم کر کے وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

”پچھو! دیکھ رہی ہیں آپ اس کی ہٹ دھرمی، زین بھائی نے کتنی محبت سے اس کا ہاتھ مانگا ہے، وہ عریشہ کے بغیر بالکل بھی نہیں رہ سکتے ہیں، ان کو بہت محبت ہے اس سے اور آپ کو معلوم ہے ناں کہ آج تک ان کی کسی بات پر آپ لوگوں نے اعتراض نہیں کیا ہے، آپ ہی یا پھر احسن ہی اس کو سمجھائیے، میری تو سمجھ سے یہ بندہ باہر ہے، معلوم نہیں کس پر چلا گیا ہے، آپ ہی کچھ سمجھیں کیونکہ میں زیادہ دن تک زین بھائی کو ناں میں جواب نہیں دوں گی، بلکہ وہ تو نکاح کا کہہ رہے تھے، یہ بات تو میں نے اشعر کے سامنے ہی نہیں ہے اور پچھو! میرا ہتھیجا بہت لائق ہے، میری تو اکلونی بیٹی ہے، آپ ہی کچھ سمجھیں، نہیں تو میں احسن سے خود بات کروں گی۔“ اس نے بھی اپنا فیصلہ دو ٹوک انداز میں سنایا تھا، یہ دیکھتے بغیر کے اشعر انصاری دروازے پر کھڑا پوری بات سن چکا ہے۔

”تم فکر نہیں کرو، جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔“ انہوں نے یسری کو تسلی دی۔

☆.....☆.....☆

گھر میں عجیرہ کا رشتہ طے ہو چکا تھا اور وہ لوگ شادی کی جلدی کر رہے تھے، اسی وجہ سے رطابہ نے عالیہ بخاری سے کہا کہ وہ کا شہزاد اور سبحان سے یہاں کو فہد کے لئے مانگ لیں اور شادی جلدی کریں، سب کچھ خوش اسلوبی سے طے پا چکا تھا اور شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں، اور تقریباً مکمل بھی ہو چکی تھیں، پہلے فہد کی دہن کو رخصت کروا کر رطابہ لے کر آگئی تھیں اور ویسے کے دن عجیرہ کی رخصتی تھی۔

آج ولیعہد تھا اور ڈاکٹر سبحان نے سب کو انوائٹ کیا تھا، تو ڈاکٹر اسفند بھی آئے تھے اور ان کو دہاں پر طارم بہت پسند آتی تھی، جس کا انہوں نے اظہار اشعر انصاری سے کر دیا تھا، اشعر، عجیرہ کے شوہر کا فریڈ تھا، اور اس کو بھی طارم ہی پسند آتی تھی، لیکن اسفند کے منہ سے سن کر چپ ہو گیا تھا، رطابہ کو بھی انوائٹ کیا گیا تھا، لیکن وہ زین کے ساتھ ملک سے باہر گئی تھیں، صرف احسن اور ذکیہ پچھو اور یسری، عریشہ آگئی تھیں اور اشعر کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کی پوری فیملی انوائٹ ہے، وہاں پر سب ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران ہو گئے تھے اور یہاں اشعر کو کا شہزاد پتا چلا تھا اور وہ ان کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا، اور طارم کا بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ان کی بیٹی ہے، اب آگے اس کو

روڈ انجسٹ [52] اپریل 2014ء

سمجھا کر تھا اس کا اس نے سوچ لیا تھا، اس نے بہت غور سے طارم کو دیکھا تھا اور دل میں کہا۔

”اب آپ کو خمیازہ بھگتنا ہے سارا، اور میں رعایت دینے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”مما! ادھر آئیں ذرا، مجھے آپ سے کچھ بات کہنی ہے۔“ اس نے یسری کو آواز دے کر ہال سے باہر جانے کے لئے جیسے ہی قدم بڑھائے تھے، طارم سے اس کی ٹکر ہو گئی تھی۔

”ارے، دیکھ کر نہیں چل سکتے کیا آپ؟ یہ آنکھیں استعمال کرنا سیکھیں۔“ اور بھی نامعلوم وہ کیا بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ یسری نے اس کو طارم سے اُلجھتے ہوئے دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے اشعر! اتنی جھاڑ پڑنے کے باوجود بھی مسکرایا جا رہا ہے؟ ویسے غلطی آپ کی تھی بیٹا! میں دیکھ چکی ہوں۔“

”ٹھیک ہے ممما! اگر میری غلطی ہے تو کیا خیال ہے، اس کو گھر نہ لے آؤں سدھارنے کے لیے؟ اور آپ کو بھی شکایت نہیں رہے گی کہ میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں مگر اب تک شادی نہیں کی، کیا خیال ہے، پسند ہے آپ کو تو بات کی سمجھیں، کیونکہ میں بھی اس لڑکی سے جلد از جلد شادی کرنا چاہتا ہوں، ٹھیک ہے؟“ اس نے طارم کو پھر غور سے دیکھا تھا جو کاشنہ سے کسی بات پر ہنس کر کچھ کہہ رہی تھی۔

”مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میرا بیٹا اتنی جلد بازی دکھائے گا، ٹھیک ہے، ہم آپ کی داد دے کہیں گے کہ وہ کسی دن آکر بات کریں، ویسے مجھے بھی بہت پسند ہے یہ لڑکی، اور ان کی مدر تو شاید مجھے بھول گئی ہیں، کافی سالوں پہلے ہماری ایئر پورٹ پر ملاقات ہوئی تھی، آپ کے قادر سے ان کی بھائی کے نیپلی ٹرم ہیں کچھ، لیکن میں نے ان لوگوں کو آج تک نہیں دیکھا تھا، کسی بھی خاندان کی شادی بیاہ وغیرہ میں، اور یہاں آکر پتا چلا کہ یہ لوگ باہر سے یہاں شفٹ ہو چکے ہیں، چلو دیکھتے ہیں جو آپ کی قسمت میں ہوگا، میں بات کروں گی۔“

”نو... نو، ممما! بات نہیں، کوشش بھی نہیں، آپ کو یہ کام کرنا ہے، وہ بھی جلد از جلد، میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا اور نہ کر سکتا ہوں، آپ کچھ بھی سمجھیں گا، بہو تو اس کو آپ کی بی بیٹا کر چھوڑوں گا۔“ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی نکل رہی تھیں کہ جیسے اگر ابھی اس کے بس میں ہو تو وہ اس کو رخصت کروا کر لے جائے اور اپنے دل میں لگی آگ کو بجھا ڈالے۔

”کیا ہو گیا ہے بیٹا! آپ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کبھی کبھی تو مجھے آپ سے بے حد خوف آتا ہے۔“

”ارے ایسے کیا کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں دونوں ماں بیٹے میں؟ میں پورے ہال میں ڈھونڈ چکا ہوں آپ کو۔“ احسن نے یسری سے کہا کہ اشعر کو دیکھا تھا جس نے اپنا رخ موڑ کر انہیں مسکرا کر دیکھا تھا۔

”ارے کچھ نہیں، میری اور ان کی آپس کی بات ہے۔“ یسری نے اتنا کہہ کر احسن کے ساتھ اندر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

”اچھا رطابہ کو ضرور کال کر کے کہہ دینا احسن! کہ اس نے نہ آکر ٹھیک نہیں کیا، اور کاشی کو تو تم جانتے ہو ناں؟“ انہوں نے اپنے برابر میں کھڑی کاشی کو دیکھ کر کہا تھا۔

”جی ہاں، میں ان سے مل چکا ہوں۔“ احسن نے بھی احترام سے کہا۔

”اور ہاں، ان سے تو تعارف کرواؤ، یہ کیوں ہیں؟“ یسری نے خود ہی طارم کے بارے میں پوچھ لیا۔

”ارے، یہ میری پیاری بیٹی طارم ہے۔“ سعد بخاری جو وہیں کھڑے تھے، انہوں نے طارم کو گلے سے لگا کر محبت سے دیکھا تھا۔ احسن اور یسری کے پیچھے ہی ڈاکٹر اسفند بھی مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے اور ان کی

روڈ انجسٹ [53] اپریل 2014ء

آنکھوں میں پسندیدگی کو صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ طارم نے بھی مسکرا کر سعد بخاری کو دیکھا تھا۔
 ”ارے کاشی! کیا سوچ رہی ہو بھی، اور اتنی چپ چاپ کیوں ہو؟“ جرانے اس کی توجہ ماحول پر دلانی چاہتی تھی۔

”کچھ نہیں بھائی! کچھ بھی تو نہیں سوچ رہی ہوں۔“ انہوں نے سعد بخاری کی طرف دیکھ کر پھر طارم کو دیکھا تھا۔

”چلو عیرہ کی رخصتی کا ٹائم ہو گیا ہے، آپ سب تو بالکل ہی فارغ کھڑی ہو جاتی ہو۔“ عالیہ بخاری نے وہاں آ کر ان دونوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کا کہا تھا۔

اتنے میں سب اپنے گھر چلے گئے تھے، لیکن سیرٹی نے کاشنہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر آنے پر بے حد اصرار کیا تھا، جس پر وہ کچھ نہیں کہہ سکی تھیں۔

”چلیں ماما! بابا آپ کو بلا رہے ہیں، آپ تو کھو ہی جاتی ہیں۔“ اتنے میں اشعر انصاری وہاں آ گیا تھا اور طارم اور کاشنہ کو مسکرا کر دیکھنے لگا تھا۔

”اوکے آئی! اللہ حافظ! پھر ملیں گے بہت جلد۔“ اس نے طارم کی طرف دیکھ کر ذمہ داری کی بات کی تھی اور چلا گیا تھا۔

”بالکل ہے بالکل ہی۔“ طارم نے کاشنہ کو دیکھ کر کہا تھا۔
 ”بڑی بات بیٹا! ایسے نہیں بولتے، آپ کو معلوم ہے جراثم بھائی کے رشتہ دار ہیں یہ لوگ، چلو چلتے ہیں اب بہت ٹائم ہو گیا ہے۔“ پھر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔

☆.....☆.....☆
 ”احسن! آپ کو ایک بات بتانی تھی مجھے، سن رہے ہیں نا؟“ سیرٹی نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا۔

”ہاں کو بھیجی، کانوں سے سنتا ہوں میں، آج تک یہ بات ہی نہیں معلوم ہوئی کہ ہمیشہ سے تمہاری طرف ہی متوجہ ہوں، ابھی موقع ہی نہیں ملا تمہارے علاوہ کسی اور کو دیکھنے کا۔“ احسن نے اس کو دیکھ کر ہنسنے ہوئے کہا۔

”اگر آپ سیریس ہو کر نہیں سنیں گے تو میں آپ سے بات نہیں کر رہی۔“
 ”ارے میں مذاق کر رہا تھا، کو کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“

”وہ اشعر صاحب کو شادی کرنی ہے، لڑکی بھی پسند کر لی ہے، وہ مجھے بھی پسند ہے، آپ کو بھی بہت پسند آئے گی، جب آپ اس کا نام سنیں گے تو۔“ سیرٹی نے جلدی سے بات مکمل کی کہ کہیں احسن پھر ان کو بچ میں نہ روکیں۔

”ارے اتنا کچھ ہو گیا اور آپ اب بتا رہی ہیں، کیا ضرورت تھی اب بھی بتانے کی؟ جب رخصت کروا کر لے آئیں تب مجھے بتا دیتیں۔“ احسن نے بھی طنز سے بھر پور لہجے میں کہا تھا۔

”ارے احسن! ایسی بھی بات نہیں ہے، آپ کا بیٹا ہی جلدی کر رہا ہے، ورنہ میں تو آرام سے ہی آپ کو بتاتی۔“

”اوکے اس کا نام تو بتا دو، اب اگر ان کا کوئی نام ہے تو؟“
 ”ارے طارم بھان شاہ ہے، جراثم کی مندی بیٹی۔“

☆.....☆.....☆
 احسن کو جب سے جراثم نے انکار کہلوا دیا تھا تو وہ چپ ہو گئے تھے، انہوں نے خود ذمہ داری سیرٹی کے سامنے اشعر سے بات کی تھی، جس کو سن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اقرار میں جواب ہوا انکار میں نہیں، آپ کو شش کریں

”کیا...؟ وہ لڑکی میرے دل میں بھی اسی کا خیال تھا کہ میں جراثم سے کہوں گا کہ وہ مجھے اس کا گھر بتائیں، میں ڈائریکٹ ان کے گھر ہی جاؤں گا، مجھے بھی بے حد پسند آئی تھی، سعد بھائی کے ساتھ ہی نظر آتی ہے وہ مجھے زیادہ تر۔“

”ہاں آپ کاشنہ شاہ کو کہہ دیجئے گا، آپ ان کو پہلے ہمارے گھر بلوائیں بس، جو کرنا ہے جلدی کریں، مجھے لگتا ہے اشعر سے زیادہ انتظار نہیں ہوگا، وہ تو پچھلی پر سوس جمانے کی بات کر رہے ہیں محترم۔“

”اوکے، اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا، میں جراثم سے بات کروں گا۔“
 ☆.....☆.....☆

جراثم سے احسن اور ذمہ داری سیرٹی نے بات کی تھی، لیکن انہوں نے کاشنہ پر ساری بات ڈال دی تھی۔ کاشنہ اور جراثم آپس میں باتیں ہی کر رہی تھیں کہ اچانک طارم وہاں آ گئی تھی اور اس نے ساری باتیں سن لی تھیں اور کہہ بھی دیا تھا۔

گستاخی معاف، ممانی جان! میں کبھی بھی اشعر انصاری سے شادی نہیں کروں گی، مجھے وہ بالکل بھی پسند نہیں ہیں، نجانے کیا بات ہے ان میں، مجھے ان سے بے حد ڈر سا لگتا ہے اور آپ پہلی فرصت میں ان کو انکار کر دیں، یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے۔ وہ کہہ کر رڑکی نہیں اور سیدی اپنے روم میں چلی گئی تھی۔

”بھائی! کیا ہو گیا ہے، میں کس طرح ایسے کر سکتی ہوں، آپ کو تو سب معلوم ہے، آپ ان کو انکار کر دیں، اگر طارم نے انکار کر دیا ہے تو اس کے بعد باقی کیا رہ جاتا ہے؟ مجھے طارم نے اس شخص کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کس طرح سے اسے تنگ کر رہا تھا، مجھے بھی وہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔“

”اوکے کاشی! جیسے تم چاہو گی ویسے ہی ہوگا، میں کوئی زبردستی توڑی کر رہی ہوں، اجداد چھوٹا ہے طارم سے، ورنہ میں اس کو بھی لے لیتی تاکہ تمہارے سر سے یہ ٹینشن بھی دور ہو جاتی۔“ جراثم نے کہا۔

”ڈاکٹر بھان سے کہو وہ کوئی اور لڑکا طارم کے لیے دیکھیں، ہم اس کی بھی جلدی شادی کریں گے۔“ وہ جلدی سے بولیں۔

”میں کہوں گی، آپ فکر نہ کریں۔“
 ”احسن نے تو اپنے دونوں بیٹوں کی بات کی تھی، عشم کے لیے سبیکہ کا کہہ رہے ہیں وہ، اور کہا ہے کہ انکار مت کیجئے گا۔ احسن نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔“

”چھوڑ دیں بھائی خود دیکھ لیں گے، آپ انکار کریں اور یہ بتائیں فہد اور نیہاں کب تک آئیں گے؟ ایک مہینہ ہو گیا ہے ان کو، آپ ان سے کہیں کہ بس اب آ جائیں یا پھر آج میں خود کال کروں گی۔“

”اوکے، تم کر کے دیکھ لیتا، میں اب گھر جاؤں گی، امی اکیلی ہوں گی اور میرا انتظار کر رہی ہوں گی، تم آنا، چکر لگایا کرو کبھی وہاں کا بھی۔“

”ہاں، آؤں گی، اوکے خدا حافظ!“ جراثم نے بھی فی امان اللہ کہا اور گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔

☆.....☆.....☆
 احسن کو جب سے جراثم نے انکار کہلوا دیا تھا تو وہ چپ ہو گئے تھے، انہوں نے خود ذمہ داری سیرٹی کے سامنے اشعر سے بات کی تھی، جس کو سن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اقرار میں جواب ہوا انکار میں نہیں، آپ کو شش کریں

☆.....☆.....☆
 احسن کو جب سے جراثم نے انکار کہلوا دیا تھا تو وہ چپ ہو گئے تھے، انہوں نے خود ذمہ داری سیرٹی کے سامنے اشعر سے بات کی تھی، جس کو سن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اقرار میں جواب ہوا انکار میں نہیں، آپ کو شش کریں

کہ وہ خود ہی ہاں کر دیں، ورنہ پھر میں اپنے طریقے سے اقرار بھی اور سختی بھی کروا کر لے آؤں گا، پھر مجھے نہ کہیے گا آپ لوگ کہ بدنامی کروادی، ایک دفعہ پھر بات کیجئے ان سے، نہیں تو میں خود چلا جاؤں گا۔“ اس نے بھی بھرپور ہٹ دھرمی دکھائی تھی۔

”ایسا کیا کرو گے تم ہاں؟ شرم نہیں آتی کسی کی عزت سے اس طرح کھینچے ہوئے، اور کس جاہلانہ لہجے میں تم بات کر رہے ہو؟ ساری میز کھوتے جا رہے ہو، یہ تربیت کی ہے کیا ہم نے تمہاری، اور اگر تم نے آج کے بعد ایسی کوئی بھی بات منہ سے نکالی تو میں تم کو چھوڑ دوں گا نہیں، تم نے بھی تو اپنی بہن کا رشتہ دینے پر اڈل خان کو انکار کیا ہے، اس میں کیا خرابی تھی؟ مجھے بھی بتاؤ، اگر میں چپ ہوں تو اسے میری سادگی سمجھو، ورنہ آج جس طرح تم نے بات کی ہے، آج تک ہمارے ہاں کسی نے اس طرح بات نہیں کی اور جرات سے ہماری رشتہ داری ہے، اس کی نند سے نہیں، یہ ان کا مسئلہ ہے کہ وہ ہم کو دیں یا نہیں دیں، ٹھیک کہہ رہی تھی جرات، تم نے شادی والے دن یقیناً کوئی ایسی بات طارم سے کی ہوگی، جیسی اس بچی نے انکار کھلویا ہے، انکار لڑکی کی طرف سے ہے، ماں باپ نے تو کچھ کہا ہی نہیں، تم اپنے طرز عمل اور روئے پر غور کیا کرو، کسی لڑکی سے کس طرح بات کی جاتی ہے، اس کا اندازہ ہے نہیں؟“ احسن انصاری نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ غصہ کیا تھا اور وہ بھی اتنا بھرپور کہ سب ہی حیران رہ گئے تھے۔

”باباجان! آپ کچھ بھی کہیں، میں شادی اسی سے کروں گا۔“ اشعر نے ضدی لہجے میں پھر کہا تھا۔
 ”پھر آپ مجھے بھی طریقہ بتا دو کہ وہ کس طریقے سے آپ کرو گے؟ اگر ہمارے خاندان کی عزت پر آج بھی آئی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا، آئی سمجھ؟“ وہ اشعر کو گھورتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔
 ”بیٹا! کوئی اس طرح سے بات کرتا ہے اپنے بڑوں سے، اور آپ کب سے اتنے گستاخ ہو گئے، جو آپ آج اپنے باپ سے منہ زوری کر رہے ہو؟ آنے دو اپنی طابی پھپھو کو، ان کی توجہ راہیانی بیٹہ فریڈ ہیں، وہ بات کریں گی اور آپ کے لیے لڑکیوں کی تو نہیں ہے ناں، آپ تو اچھے خاصے بڑھے لکھے اور سمجھدار ہو، پھر یہ کس طرح کی بحث کر رہے ہو؟ اتنا کوئی کسی لڑکی والے کو فورس نہیں کر سکتا ہے، ان کی مرضی ہے میری جان! سمجھنے کی کوشش کرو۔“ یسری کو اس نے پیار بھرے انداز میں غور سے دیکھا تھا۔

”مما! آپ تو مجھے سمجھیں اور رطابہ پھپھو کے آنے سے پہلے ہی یہ کام ہو جائے تو بہتر ہے، آپ ان کو اس معاملے میں Involve نہیں کریں تو زیادہ بہتر ہے، وہ خود کون سا اپنی میرج لائف میں خوش ہیں؟ آپ کے بھائی نے ان کو کبھی بھی خوش نہیں رکھا ہے۔“ اس نے اتنی آ، سخی سے یہ سب کہا تھا کہ تھوڑا سا پیسہ میری سمجھ سکی تھیں۔

”آپ کیا کہہ رہے ہو میری جان! کیسے خوش نہیں رکھا ہے؟“
 ”مما! بس آپ اب کچھ نہیں بولیں گی، میں جانوں اور میرا کام، طارم کو آپ کی بہو بنا کر ہی چھوڑ دوں گا، اتنا تو آپ لکھ کر لے لیجئے مجھ سے۔“

”بیٹا! ایسا کچھ مت کرنا کہ بعد میں آپ کو بھی شرمندگی ہو۔“ ذکیہ بیگم نے بھی اس کو سمجھایا تھا۔
 ”اب آپ دونوں کچھ نہیں سوچیں، بانی سب میں خود دیکھ لوں گا، اور بابا کو کہیں پریشان نہیں ہوں، جو ہوگا سب کے سامنے ہوگا۔“

آج طارم کو آفس میں دیر ہو گئی تھی، اس نے سعد بخاری کو بتا دیا تھا کہ اس کی آج ایک میٹنگ ہے B.O.D کے ساتھ اور وہ اب ریسٹورنٹ میں بیٹھی ڈنر کر رہی تھی، میٹنگ کا میاب رسی تھی، اب وہ فارغ ہو کر نکل ہی رہی تھی کہ اشعر انصاری نے اس کا راستہ اچانک سے روک لیا تھا۔

”ہائے، ہیلو! کال فظ تو بہت چھوٹا ہے اور میں یہ کر کے ٹائم ضائع نہیں کرنا چاہتا ہوں، کوہکسی ہو؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم یہاں ہو، ورنہ میں بہت پہلے آ جاتا، اور ڈنر کی آفر کرتا، کینڈل لائٹ ڈنر کرتا اور تمہارے لئے یادگار بناتا۔“ اس نے بہت ہی طنزیہ سے لہجے میں طارم سجان شاہ کو مخاطب کیا تھا۔

”راستہ چھوڑیں میرا اور کیا عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں آپ، میز نہیں آپ کو کسی لیڈی سے کس طرح سے مخاطب ہوا جاتا ہے؟ ہر جگہ نازل ہو جاتے ہیں شیطانوں کی طرح، میرے ہی پیچھے کیوں پڑے ہیں، دنیا میں اور بھی خوبصورت لڑکیاں ہیں، میری تو سمجھ سے باہر ہیں آپ کی حرکتیں، مجھے جانے دیں، دیر ہو رہی ہے، میرا ڈرائیور بھی معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے؟“

”پہلے تو آپ میری بات غور سے سنیں، آپ کے سارے راستے مجھ ہی تک آتے ہیں اور میز مجھے آپ سکھائیں گی، وہ بھی شادی کے بعد اور نازل ہونے کا بھی خوب کہا تم نے، وہ تو سنا ہوگا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، اور تم سے کس نے کہا کہ تم خوبصورت ہو، یا میں تمہاری خوبصورتی پر مرنا ہوں؟ ان تمام خوش فہمیوں سے نکل آؤ، اور ہاں، مجھ سے شادی پر راضی ہو جاؤ، ایسا نہ ہو کہ مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانا پڑے، جس کا بعد میں تم کو افسوس ہو، بہتری اسی میں ہے راضی ہو جاؤ، سمجھ آئی یا پھر باہر سے آنے والی لڑکیوں کا سراپہ سے خالی ہوتا ہے؟“ اس نے بھی بات کرنے میں حد کر اس کر دی تھی۔

”اگر آپ کی میں اتنی دیر سے بکواس سن رہی ہوں تو آپ اس غلط فہمی کا بہت شکار ہیں کہ آپ بہت اچھی تقریر کرتے ہیں، اور آپ ہوں گے جراثیمی کے رشتہ دار، میرا یا میری فیملی کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اگر آپ سیدھے طریقے سے مجھ جائیں تو آپ کے حق میں بہتر ہے، ورنہ تو اپنا نقصان آپ خود اٹھائیں گے اور وہ بھی اکیلی۔“ اس نے نہایت ہی بھرم والے لہجے میں کہا تھا، اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔

”رشتہ بنانے میں کون سا نام لگتا ہے؟ کہو تو ابھی تم سے اتنا پیارا اور مضبوط رشتہ بنا لوں، جس کا تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو میڈم! اور مجھے صرف ایک کال کی ضرورت ہوگی، کہو تو کر کے دکھاؤں میں ایسا؟“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخاطب کیا تھا۔

”آپ اتنا برا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں، آپ کی اتنی ہمت؟ بہتری اسی میں ہے مجھے جانے دیں، مجھے دیر ہو رہی ہے، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ جیسے لوگ پاکستان میں میرے پیچھے لگ جائیں گے تو میں کبھی بھی باہر سے یہاں نہ آتی۔“ اس نے ہیکلی ہوئی آواز میں کہا اور آنکھوں سے آنسو موتیوں کی صورت میں بہنے لگے تھے۔

”ارے... ارے، یہ کیا؟ اتنا کامیاب ہتھیار آپ استعمال کر رہی ہیں، آپ کو معلوم تو ہوگا ناں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے، اور فی الحال آپ سے مجھے جنگ کرنی ہے، محبت تو بہت دور کی بات ہے، وہ مجھے کبھی تم سے نہیں ہو سکتی، مجھے صرف اپنا مطلب نکالنا ہے پھر...“ اس سے آگے وہ نہیں بول سکا تھا۔

طارم نے روٹی ہوئی آنکھوں سے اس کو دیکھا تھا اور کہا تھا۔

(جاری ہے.....)



سحر مبین

ناولٹ

کسی دھڑکی سے دل میرا

متعلق پوچھا جا رہا تھا، جس گروپ کے سارے جوابات ٹھیک ہو رہے تھے ان کی طرف اس نے ذرا غور سے دیکھا۔ ڈریس پینٹ اور شرٹ پہنے ڈینٹ سا اس گروپ کا ایک لڑکا اور ساتھ کھڑی سیولیس شرٹ پہنے لڑکی، بلاشبہ دونوں بلا کے ذہین تھے اور اسے ذہانت بڑی اثریکٹ کرتی تھی، لڑکی کا نام اسے یاد نہ رہا، مگر لڑکے کا نام علی تھا اور اس نے ایک دفعہ پھر دلچسپی سے زیر لب ”علی“ کہا اور نیوی پرنٹریں بجا دیں۔

☆.....☆.....☆
”اٹھو یا! اب تو پیریڈ فری ہے، چلتے ہیں۔“

باری مختلف موضوعات پر سوالات کیے جا رہے تھے، اس نے بلا ارادہ ہی ریوٹ میز پر رکھا اور دلچسپی سے محنتی باندھے اس پروگرام کو دیکھنے لگی۔ ایک گروپ کے سارے ہی جوابات درست ہوتے جا رہے تھے، اس کی اس گروپ میں دلچسپی بڑھی۔ سیاست، سیاحت، مصوری اور اس کے علاوہ بھی ہر موضوع کے متعلق سوالات پوچھے گئے۔

”مائیکل جیکسن کی ڈیٹھ ہوئے بھی عرصہ ہونے والا ہے، مگر ناں جی! بے چارے کی جان نہیں چھوڑنی۔“ وہ مسکراتے ہوئے خود سے بولی۔ دراصل اس وقت پروگرام میں مائیکل جیکسن کے

وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی بور سامنہ بنائے ریوٹ ہاتھ میں پکڑے چینل پر چینل بدل رہی تھی، کچھ دیر پہلے اس نے ابو کے ساتھ بہت سی نئی آنے والی فلموں پر زور و شور سے بحث کی تھی، دراصل ان میں سے اسے کوئی بھی پسند نہیں آئی تھی، ابو مسکراتے ہوئے کسی کام سے اٹھ کر چلے گئے تھے، ایک چینل پر کوئی پروگرام چل رہا تھا، جس میں مختلف کالج کے دو، دو اسٹوڈنٹس کا گروپ تھا اور سب سے باری

طوبی نے اپنے ارد گرد گھاس پر بیٹھے اپنے گروپ سے کہا، اس نے صورت اس قدر مسکین بنائی ہوئی تھی کہ سب کو اس پر ترس آ گیا۔

”کہاں جانا ہے؟“ مریم نے ہینڈ بیگ کھنگالتے ہوئے خواخواہ مصروف ہونے کا ٹانگ کرتے ہوئے کہا، یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس اس گھاس والے میدان میں بیٹھے اپنے آپ میں مگن تھے، کوئی تہیہ لگا رہا تھا تو کوئی سنجیدہ سا کتا تین پکڑے بیٹھا تھا، وہ سب بالکل غری بیٹھے ہوئے تھے اور ایسے میں طوبی انھیں سجان کے پاس لے جانے میں بے حد تھی۔

”ہزار دفعہ تو کہا ہے۔“ وہ بھڑک اٹھی، سب مسکرانے لگی، وہ چڑھ گئی، پھر خود کو نارمل کیا۔ آخر مطلب نکلوانا تھا، کوئی آسان بات نہیں تھی، وہ خواخواہ اسے تنگ کر رہے تھے۔

”پریم ڈیر!“ اس نے بجا جت سے علی کو بازو سے پکڑ کر اٹھا اور چلتے کا اشارہ کیا۔

”چلو اٹھو سب چلتے ہیں اس کے ساتھ، یہ بھی کیا یاد کرے گی۔“ علی نے شاہانہ انداز میں کہا اور سب مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

”طوبی یار! عجیب بات ہے لوگ کہتے ہیں کوئی کتاب میں ہڈی نہ ہو اور تم خود ہماری مٹیں کرتی ہوئی لے کر جا رہی ہو، سب حیرت ہے ناں؟“ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا مسکرانے لگا اور شرارت سے کہا، باقی سب بھی ہنسنے لگے، طوبی نے اسے گھور کر دیکھا۔

”کل سے سجان مجھ سے ناراض ہے، سو تم سب کو لے کر جا رہی ہوں۔“ طوبی نے مزے سے بتایا وہ سب حیران ہو کر چلتے چلتے رک گئے۔

”ہمارا کیا کام؟“ عدیل نے بونگے پن سے کہا۔

”بات یہ ہے ڈیر! کہ میں چاہتی ہوں تم لوگ

بھی ٹھیک سے مسلمان ہو جاؤ، اس سے دعا سلام ہوجائے گی تم لوگ ٹیکوں کے مالک ہو جاؤ گے۔“ وہ اس لہجے میں بولی کہ جیسے ٹیکیاں دلا کر احسان کرنے والی ہو۔ وہ سب چڑ گئے۔

”اچھا میں سمجھا یہ چاہتی ہے کہ ہم مل کر سجان کی دھلائی کر دیں، کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟“ علی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا اور آخر پر طوبی کی طرف دیکھ کر تائید چاہی۔

”تم...! گندے بچے۔“ وہ غصے سے بولی وہ سب زور زور سے ہنسنے لگے، اس نے خود کو نارمل کیا۔

”تم چلتے ہو میرے ساتھ کہ نہیں؟“ وہ خواخواہ لہجے میں بولی۔

”اوکے، اوکے ہم ریڈی ہیں۔“ وہ سب ہنس ہنس کر تھک گئے تھے، ردابولی۔

”تم سب لوگوں نے کوئی بونگی نہیں ماری ہے، انڈر اسٹینڈ؟ اور تم لوگوں کو اپنی فور میں لے کر جا رہی ہوں، اب منہ بند اور ایک دفعہ پھر کہہ رہی ہوں اچھے بچے بن کر رہنا ہے۔“ طوبی کو شاید ان پر یقین سنا نہیں تھا، شہادت کی انگلی سے وارن کرتے ہوئے بولی، ان سب کو تو گویا آگ لگ گئی۔

”دیکھا ہے تمہارے اس سجان کو بھی، سب سے بڑا بونگا تو وہ خود ہے۔“ علی سلگ کر بولا، طوبی کہہ کر پچھتائی۔

”اوہ... چھوڑو پریم ڈیر! ایک دفعہ میری اس سے صلح ہوجائے تم لوگوں کو زبردست ٹریٹ... اوکے؟“ سب کا موڈ نارمل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆
”یہ میری کزن ہے تھوڑے دن ہوئے اسے یہاں ایڈمیشن لیے ہوئے۔“ سجان کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا اور اب وہ پاس کھڑی اپنی کزن کا تعارف کروا رہا تھا، پیلا لشوار اور اونچی میٹس کے ساتھ اس

نے بالوں کی سیدھی چٹیا بنائی ہوئی تھی، باریک سا دوپٹہ اس کے گلے میں جھول رہا تھا، وہ ان سب سے منفرد لگی، سجان کے کہنے پر اس نے سامنے کی طرف دیکھا، صبح کے بعد سجان ابھی اسے ساتھ لایا تھا، وہ سامنے کھڑے علی اور طوبی کو دیکھ کر چونک گئی، اسے بے اختیار چند ماہ پہلے دیکھا ہوا پیلی برادرام یاد آ گیا، وہ گروپ جس کے سارے آنسر ٹھیک ہو رہے تھے، علی اور ہاں طوبی اس کے ساتھ تھی۔ اسے اس لڑکی کا نام یاد آیا۔

”اچھا تو وہ یہ ہیں دونوں۔“ اسے سوچ کر خوشگوار سی حیرت ہوئی، طوبی نے آج بھی کوئی سلیبس شرٹ پہنی ہوئی تھی جبکہ علی نے آج جنیز کے ساتھ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، ہمیشہ کی طرح آج بھی ڈیسنٹ اور پنڈم۔

”ہائے...!“ اس نے مسکراتے ہوئے سب سے کہا۔

”ہیلو اکیسی ہو؟“ طوبی نے چپک کر کہا، اسے یہ آداب نبھانے ہی تھے آخر وہ لڑکی سجان کی کزن تھی۔

”جی ٹھیک۔“ وہ کہہ کر مسکرائی اور خود پر جی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، علی اسے ہی دیکھ رہا تھا کنگلی باندھے اس کے دیکھنے پر زیر لب ”ہیر“ بولا۔ طوبی اس کے ساتھ جڑی کھڑی تھی اسے گھور کر دیکھا اور اس نے طوبی کو مسکرا کر دیکھا اور پھر سامنے کھڑی اس لڑکی کو، اس نے گھبرا کر نظریں جھکا دیں۔

”یہ ہماری کلاس فیلو ہے؟“ مریم خوشگواریت سے پوچھنے لگی۔

”نو... جونیئر ہے، ایک سال پیچھے، آئی تھنک۔“ عدیل نے خود ہی اندازہ لگا کر مریم کے کان میں کہا۔

”میں آپ کی کلاس فیلو ہی ہوں۔“ اس نے

مسکراتے ہوئے سب کو جواب دیا۔

☆ ☆ ☆
”کیسی لگی وہ ہیر؟“ ردانے ساتھ چلتے علی سے پوچھا جب سے انھیں طوبی کی زبانی اس کے ”ہیر“ کہنے کا علم ہوا تھا ان کے ہاتھ بالکل تروتازہ ٹاپک لگا ہوا تھا۔

”جیسی وہ ہے۔“ وہ شرمندہ ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔

”یقیناً اچھی لگی ہے۔“ طوبی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا، سب اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے علی کی طرف دیکھنے لگے وہ بھی مسکراتے ہوئے رک گیا۔

”نہیں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا، سب نے حیرت اور افسوس سے اسے دیکھا۔

”پھر ایویں گھوری جا رہے تھے اسے؟“ عدیل کو غصہ آیا۔

”کیونکہ اچھی نہیں بہت اچھی لگی ہے۔“ وہ ڈھٹائی سے مسکرایا، سب ہی اسے گھورتے ہوئے مسکرانے لگے۔

”میں بھی کہوں محترمہ کو ایک نظر دیکھتے ہی ”ہیر“ کا ٹائٹل دے دیا اور اچھی بھی نہیں لگی۔“ طوبی بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

”ویسے یار طوبی! اس کا نام کیا ہے؟“ مریم، طوبی کی طرف گردن موڑ کر اس سے پوچھنے لگی، سب کو یاد آیا کہ واقعی اس کے نام کا انھیں نہیں پتہ۔
”ہاں... وہ... پتہ نہیں... شاید!“ وہ سوچنے لگی۔

”چلو چھوڑو! پریم نے اسے دے ہی دیا ہے نام۔“ عدیل پھر شرارت کے موڈ میں آیا۔

”ہاں! اس کا نام آج سے ”ہیر“ بھی ہے اسی نام سے بلانا ہے، اوکے۔“ علی سنجیدگی سے بولا، وہ سب حیرتاً چل گئے۔

”یہ کیا بات ہوئی تمہیں پریم پند ہے سو تمہیں

اسی نام سے بلائیں، چلو مان لیا، ہم کو بھی پر یام پسند تھا، اور ہم نہیں اسی نام سے پکارتے تھے اور اب ان محترمہ کو بھی خوابی نام سے پکاریں ”ہیر صاحبہ“۔ عدیل نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے خواجواہ کہا، آیا کہ وہ واقعی بنجیدگی سے کہہ رہا ہے، علی نے بنجیدگی سے سب کی طرف دیکھا۔

”تم لوگوں کو آنکلیشن کیوں؟ حالانکہ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں“۔ وہ کندھے اچکا کر بولا، سب اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆.....☆.....☆

”ہمارے گھر میں بالکل سائلن نہیں ہے۔“ سبحان نے چکن میں داخل ہوتے ہوئے کہا، مطلب واضح تھا وہ سمجھ بھی گئی، سبحان کا اب اس کے ساتھ کھانے میں حصہ بنانے کا ارادہ تھا۔

”بھائی صاحب! میں نے کون سا آپ سے مانگا ہے؟ اور آپ جواب میں نہ ہونے کی وضاحت کر رہے ہیں“۔ وہ لہجے کو سادہ بناتے ہوئے بولی، جواب میں سبحان کا قبچہہ بلند ہوا، وہ اپنے اور سبحان کے لیے کھانا نکال کر ڈرائنگ روم میں لے گئی، دوپٹے کے کونے کو اوپر کر کے اور گلے میں سیٹ کر کے وہ ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

”طوبی بھابی تو کافی کیوٹ ہیں“۔ وہ پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے بولی۔

”ہاں یہ تو ہے“۔ سبحان نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”میں نے انھیں کافی دن پہلے دیکھا تھا ایک پروگرام میں، انٹیلی جنٹ بھی کافی ہیں“۔

”ہاں وہ کوئی موقع جانے نہیں دیتی، ہر جگہ انٹری ماری ہوئی ہے“۔ وہ محبت سے بولا۔

”ان کے ساتھ پروگرام میں وہ لڑکا بھی تھا جو آج ان کے ساتھ کھڑا تھا“۔ وہ (علی) کہتے رک گئی اور لہجے کو سرسری سا بنایا، سبحان ابھی تک کھانا

کھا رہا تھا، جبکہ اس نے کھالیا تھا۔

”ہاں وہ پر یام.... بڑی بچی ہے ان دونوں کی، یونیورسٹی میں مجھے چھوڑ ان کا کپل مشہور ہے“۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا، اس کے لہجے میں کسی قسم کا شک یا حسد نہیں تھا، اس نے رشک اور محبت سے سبحان کی طرف دیکھا، اس کا ذہن ”پر یام“ میں الجھ گیا۔

”بٹ آئی تھنک اس کا نیم تو علی تھا“۔ وہ پوچھ ہی بیٹھی۔ شاید اس نے اس دن غلط نام سنا تھا، یہ تو شاید کسی اور کا تھا، وہ ایویں اتنے دن علی نام کے بندے کی فین رہی۔

”ہاں! شاید اس کا پورا نام جو ہو، اس میں علی اور پر یام دونوں لفظ آتے ہوں“۔ اس نے خود کو مطمئن کیا، سبحان ایک دفعہ پھر ہنسنے لگا۔

”ہاں صحیح نیم اس کا علی ہی ہے مگر طوبی کہہ رہی تھی کہ اس کی مدر کو اور اسے پر یام پسند ہے سو...!“ اس نے وضاحت دی اور پلیٹ میں اور چاول نکالنے لگا۔

”تم کتنا کم کھاتی ہو“۔ سبحان نے افسوس سے اسے دیکھا، وہ کب کی فارغ بیٹھی تھی۔

”اور تم کتنا زیادہ کھاتے ہو“۔ اس نے جلدی سے حجاب برا کر لیا۔

”بھئی تو میں اتنا اسٹریوگ اور پیئڈم ہوں جبکہ تم“۔ وہ خوشی سے بولا اور پھر ایسے منہ بنایا جیسے بہت افسوس ہو رہا ہو۔

”اور تم اتنی دلی پتی... اف کتی کمزور ہو“۔ وہ آخر پر شرارت سے اسے دیکھنے لگا، اس نے گھور کر اسے جواب دیکھا اور پھر خوشی سے بولی۔

”دلی پتی نہیں جی! اسارٹ کیے“۔

☆.....☆.....☆

طوبی نے تو گویا روٹین کا حصہ ہی اس بات کو سمجھ لیا تھا، وہ سبحان صاحب کو سلامی پیش کرنے اور

کروانے کے لیے جلدی جلدی سب کو راضی کر رہی تھی، یہ عجیب بات تھی کہ وہ سبحان کی کلاس فیلو ہوتے ہوئے بھی کبھی اسے اپنے گروپ میں شامل نہیں کر سکی، دوست اور لور کا مقام الگ الگ ہے وہ اچھی طرح جانتی تھی، گوکہ سبحان کی اور اس کی اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی مگر وہ اس سے کبھی علی کی طرح فریڈ نہیں ہوتی تھی یا پھر دوسرے لفظوں میں اس سے کبھی فرینک ہوائی نہیں گیا تھا۔

”اب آ رہے ہو، اتالیٹ کیوں ہو گئے؟ پچھلے دوپیر یہ بھی مس کیے“۔ علی کی بانیک ان کے پاس آ کر کی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”یار! ماما کو کوئی کام تھا مجھ سے تم بتاؤ آج اتنی بے صبری سے انتظار کیوں؟“ وہ آخر پر شرارت سے طوبی کی طرف جھک کر بولا۔

”ہٹو بکواس نہیں، آؤ اب تم میرے ساتھ سبحان کے ڈپارٹمنٹ تک اور ویسے تم نے بھی تو اب بھی کرنا ہے“۔ اسے کچھ یاد آیا تو آخری فقرہ بھی ادا کیا۔

”وائے ناٹ“۔ وہ تار ہو گیا۔

”پر یام یار! بڑے مطلبی ہو“۔ طوبی دکھی ہونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

”کیوں؟“ وہ بڑے موڈ میں تھا۔

”اب خود اپنی ”ہیر“ کا دیدار کرنا ہے سو احسان کر رہے ہو، ویسے بچو آج سے میرے احسان تجھ پر شروع۔ ہاں! آج احسان کا بدلہ دیے کا وقت آ گیا ہے، جتنی دفعہ تم میرے ساتھ گئے اتنی دفعہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی“۔ طوبی نے ایویشنل ہونے کی کوشش کی، سب ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”کیوں مجھے اکیلے کو ڈر لگتا ہے؟“ اس نے اطمینان سے کہہ کر بانیک سے چابی نکالی اور بانیک سے اترا، طوبی کے جذباتی لہجے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا، طوبی سب کے ساتھ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔

”اب چلو ناں!“ اسے جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔

”چلو چلتے ہیں“۔ وہ اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا، ردانے مریم کو کبھی ماری اور وہ تینوں بھی اٹھ گئے۔

”ہم بھی چلتے ہیں“۔ وہ بیک زبان ہو کر بولے۔

”میرے کہنے پر تو ڈھیوں کو اثر نہیں ہو رہا تھا“۔ طوبی بڑبڑائی۔

”ہم تو آج پر یام کی خاطر جانے لگے ہیں“۔ عدیل نے پارٹی بدلی۔

”اور صرف تم لوگ آج ہی جاؤ گے میرے ساتھ، میں کوئی طوبی تھوڑی ہوں جو پوری بارات لے کر روز جاؤں“۔ وہ شرارت سے بولا۔

”واہ خوش فہمیاں... وہ آپ کی ”ہیر“ کو جانے آج ہی جانا ہمارے سمیت آپ کا اچھا لگے یا نہیں، روز روز... واہ... واہ!“ مریم دانت پیستے ہوئے بولی جبکہ باقی تینوں کو اس کے ابھی سے بدل جانے کا کافی گہرا صدمہ تھا۔

”کیوں اسے کیوں برا لگنے لگا، تمہارا بھائی لاکھوں میں ایک ہے“۔ وہ ردانے کو کان سے پکڑ کر شرارت سے بولا، کبھی ہنسنے لگے۔

☆.....☆.....☆

”ہیر“ سبحان کی کزن تھی اور طوبی کو ڈر تھا کہ شاید پر یام کے پر پوز کرنے پر وہ لوگ برا منائیں جبکہ باقی تینوں پر یام کی ہمت بندھانے پر لگے ہوئے تھے کہ جاتے ہی پھول پیش کر دینا، وہ ان کی خوشی پر دھیرے سے مسکرایا، بلاشبہ وہ تیفوڈ ہونے والوں میں سے نہیں تھا مگر ان تینوں کے نادر مشوروں کو فراخ دلی سے قبول کر رہا تھا۔ آخر انھوں نے مشورے دے کر اس پر اپنا شوق پورا نہیں کرنا تھا تو کس پر کرتے، دوست تو وہی تھا ان

کا۔ وہاں بھان اکیلا تھا، ان سب کو بڑا افسوس ہوا۔
 ”وہ ہیر کدھر ہے؟“ طوبی نے بھان سے پوچھا۔
 ”کون؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا، وہ جخل ہی ہو کر مسکرائی۔
 ”تمہاری کزن۔“
 ”اچھا...! وہ ہنسے لگا۔

”میں تھی ابھی“۔ وہ سڑھیاں اتر کر بھان کو ڈھونڈنے کے لیے دور تک دیکھنے لگی، پیلا شلوار اور اونچی قمیض پہنے وہ واقعی سب سے منفرد اور پیاری لگ رہی تھی، پنک سوٹ کے ساتھ کا پنک نرم اور باریک سا دوپٹہ اس کے گلے میں جھول رہا تھا، دائیں کندھے پر پنک جھول رہا تھا، قمیض کی آستینیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور نرم نرم بازو جھلک رہے تھے، اسے ہمیشہ ہی اسے اونچی قمیضیں اور پیلا شلواریں اچھی لگتی تھیں وہ انھیں پہنتی تھی چاہے شین ان ہو یا آؤٹ۔ مگر یہ نہیں تھا کہ اس کے سارے کپڑے اسی ڈیزائن کے ہوتے، ہر ڈیزائن کے ہوتے مگر وہ پھر بھی انھیں زیادہ تر اور اکثر پہنتی، بھان اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

”ہیلو ہیر! کیسی ہو؟“ اس نے اسے سڑھوں سے اترتے دیکھ لیا تھا اور اب اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا اور غور سے اس کے رد عمل کو جاننے کی کوشش کر رہا تھا، وہ دونوں اس وقت پھولوں کی کیاریوں کے پاس کھڑے تھے، وہ پہلے تو اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر خوشگواریت کا شکار ہو گئی تھی، مگر ہیر کے نام پر ساری خوشی اڑن چھو ہوئی، وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر اسی بات کی منتظر تھی کہ وہ ابھی اسے ہیر نہ سمجھ کر سوری کہتا ہوا چلا بنے گا مگر یہ کیا وہ تو کئی لمحے گزر جانے کے بعد بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا، اس نے سوچا کہ اس کی غلط فہمی دور کر دے۔
 ”سوری آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میرا نام ہیر

نہیں، میرا نام تو...!“ اس نے درمیان سے اس کی بات کاٹ دی۔
 ”آئی نو... تم ہیر نہیں ہو، بٹ آئی نو تم ہو۔“ وہ آخری فقرے پر زور دیتے ہوئے بولا، اس نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرایا۔
 ”جی نہیں! میں نہیں ہوں۔“ وہ الجھتے ہوئے بولی۔

”اچھا! مگر تم ہو۔“ اسے اب اس کو تنگ کرنے میں مزہ آنے لگا، علی نے جبکہ کر کیاری سے گلاب کا پھول توڑ لیا، مائی بابا وہیں کہیں تھے انھوں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا، علی بے چارگی سے دیکھتے ہوئے مسکرایا، وہ بھی سر جھٹک کر مسکرانے لگے۔

”مجھے ہیر نام پسند ہے اور یہ نام تم پر چلتا ہے، سو میں نے تمہیں کہا۔“ اس نے وضاحت کی۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا وہ بہت حساس تھی، ذرا سی بات پر خوش اور ذرا سی بات پر دکھی ہونے والی، اس نے چہرہ جھکا لیا اور خود کو نارمل کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

”او کے!“ وہ جلدی سے وہاں سے جانا چاہ رہی تھی۔

”تمہیں برا نہیں لگا۔“ اس کا ارادہ ابھی جانے کا نہیں تھا اور وہ دونوں ہاتھوں میں پھول گھماتے ہوئے بولا، وہ رک گئی اور جواب سوچنے لگی۔

”ہر کسی کے پاس یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کرے جو اچھا لگے یا جو برا لگے، انھیں جو کرنا ہے وہ کرے۔“ اس نے اپنی دانست میں بڑا فلسفہ مارا تھا یا پھر دوسرے لفظوں میں اس نے سوال سے جان چھڑائی تھی۔

”اچھا!“ وہ حیران ہوا۔
 ”دوسرے بندے کا بھی حق ہوتا ہے کہ وہ اپنا ری ایکشن شو کرے۔“ وہ اپنی بات پر زور دیتے

ہوئے بولا۔
 ”مگر تو دیا ہے۔“ اس کی زبان سے پھسلا۔

”اچھا!“ وہ مسکرایا۔
 ”اٹ میز تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے اندازہ لگایا، وہ خاموش رہی۔

”سنو ہیر! میں پھول ہر لڑکی کو پیش نہیں کرتا، تمہیں میں نے دیکھا اور تم مجھے پیاری لگیں اور بلاشبہ تم بہت پیاری ہو، اگر تم چاہو تو یہ پھول پکڑ لو، نہیں تو ایزو وٹس... مگر... سنو! تم واقعی مجھے اچھی لگی ہو۔“ وہ آہستہ آہستہ بولا اور پھول اس کی طرف بڑھایا، وہ چہرہ جھکا کر مسکراتے اور کانپتے ہونٹوں سے اسے سنے جا رہی تھی، اس نے گردن اٹھائی، وہ پھول ابھی تک علی کے ہاتھ میں تھا۔

وہ سب انھیں دیکھتے ہوئے وہاں آ گئے، وہ سب فقرے بازی اور جملے بازیوں سے انھیں تنگ کر رہے تھے، کئی لمحے گزر گئے پھول ابھی تک علی کے ہاتھ میں تھا۔ بھان کو شاید اس کا پھول پکڑنا اچھا نہ لگے، مگر کیوں اس کی زندگی وہ جیسے مرضی گرارے، اس نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کی۔

وہ اس خاندان سے تعلق رکھتی تھی جس میں اس کی کسی بھی ایسی حرکت کی گنجائش نہیں لگتی تھی تو پھر وہ کیسے پھول پکڑ لے؟ مگر یہ بھان بھی تو اس کے تائیا کا بیٹا تھا وہ بھی تو اپنی مرضی سے طوبی سے منگنی کرنے والا تھا، اس نے اس خیال کی بھی نفی کی۔

”ہاں! ابو کو شاید یہ سب پسند نہ ہو، مگر اب... اب کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے خود کو دلا س دیا۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا، اس نے ابھی تک پھول پکڑا ہوا تھا، اگر وہ نہ پکڑے تو پریم کا دل ٹوٹ جائے گا، اس تصور سے ہی اس کا دل کانپا اور اس کی نفی میں آئے کسی بھی خیال پر غور کرنے سے پہلے ہی پیچھے رنگ پڑے پریم کے ہاتھ سے کانپتے ہاتھوں سے پھول پکڑ لیا، اس کے چہرے کا رنگ

بھال ہوا اور سب کی شرارتیں پھر سے عروج پر پہنچ گئیں، مگر وہ جلدی سے وہاں سے کھٹک گئی۔

☆.....☆.....☆
 ”تم بھی کل ریڈ سوٹ پہنوگی۔“ وہ نرمی سے قریبی درخت سے ٹیک لگائے کھڑی ہیر سے پوچھنے لگا، کل 14 فروری کا دن تھا، بہت سے لڑکے، لڑکیوں نے ویلفائن کے بینڈ ماتھے اور کلائیوں پر لگائے ہوئے تھے۔

”میں نے بھی ویلفائن ڈے سیلبریٹ ہی نہیں کیا۔“ وہ معصومیت سے بولی۔ وہ اس کے معصوم سے لہجے پر مسکرانے لگا۔

”کد تمہیں کرنا بھی نہیں چاہیے تھا، مگر اب تو کرنا ہی ہوگا۔“ آخر پر جیسے اس نے اندازہ لگایا، وہ اس کے فقرے پر مسکرانے لگی اور مسکراتے مسکراتے سرخ ہو گئی، اسے خود ابھی پتہ چلا تھا کہ وہ کس قدر شیریلی ہے وہ ذرا ذرا سی بات پر سرخ ہو جایا کرتی تھی، پریم نے اس کے شرمیلے پن کو دل کھول کر انجوائے کیا۔

”پریم!“
 ”ہوں...؟“ اسے یہ نہیں محسوس ہوا تھا کہ آج سے پہلے کسی کے بھی منہ سے اسے اپنا نام اتنا پیارا اور اچھا نہیں لگا تھا، اسے تو اس سے بھی اچھا محسوس ہوا تھا، وہ اس کی آواز کے سحر میں ہی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے چلا گیا تھا، پھر سے بولا۔

”ہوں... کیا ہے؟“ وہ اسے خاموش دیکھ کر پوچھنے لگا، وہ جو پوچھنا چاہتی تھی کل ریڈ سوٹ پہنے یا نہیں، نفی میں سر ہلانے لگی۔

”انتا گھورے جا رہے تھے مجھے بات ہی بھول گئی۔“ وہ منہ بسورتے ہوئے بولی، اسے واقعی بات بھول گئی تھی، وہ اپنے قہقہے کو روک نہ سکا اور وہ خود بھی اسے ناراضی سے گھورتے ہوئے ہنسے لگی۔

”بیٹھ جاؤ تھک جاؤ گی۔“ وہ خود ساتھ والے

درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا اس کے بازو کو پکڑا اور ساتھ بٹھالیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک پریم کے ہاتھ میں تھا اور ہیر کے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا، وہ اسے روز ایک نیا گلاب توڑ کر دیتا تھا، اگر بھی مالی بابا اسے گھورتے تو وہ بھی ڈھٹائی اور کبھی بے چارگی سے کہتا۔

”ان پر ہمارا بھی حق ہے۔“ وہ سر جھکا کر مسکراتے ہوئے اس کے پاس ہی بیٹھ گئی، وہ ریڈ سوٹ ہی پہن کر آئی تھی اور اس کے ہوش کم کرنے کو کافی تھی، انھیں کبھی اس ویلنٹائن پر یقین نہیں تھا، کہانی معلوم تھی اس کی مگر بھی ہمدردی نہیں ہوتی تھی، نہ جانے کیوں پھر بھی وہ ریڈ سوٹ ہی پہن کر آئی تھی، آج یونیورسٹی کے پھول ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا، مالی بابا کی پھولوں پر کڑی نگرانی تھی مگر جو حق سمجھتے تھے انھوں نے توڑ لیے، مالی بابا نے پریم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، اس نے آج پھول نہیں توڑا تھا، وہ اس سے کافی مانوس ہو چکے تھے، اس نے مسکراتے ہوئے کوٹ کی جیب سے پھول نکالا، وہ حیران رہ گئے، شاید چوری توڑا ہے۔

”آج تو سب نے ہمیں سے توڑنا تھا، سو میں نے اس لیے یہاں سے نہیں توڑا، میں نے تو اب گھر میں ایک پودا اس کے نام کر دیا تھا۔“ وہ دلکشی سے مسکرایا، مالی بابا سمجھ نہیں، وہ سر جھٹک کر آگے چل دیا۔ عدیل کوٹوں کا خیال تھا کہ۔

”طوبیٰ اور پریم کو تو آج گفت ملنے ہیں مگر ہمیں ان دونوں سے ٹریٹ۔“ وہ اس تصور سے ہی قہقہہ لگانے لگے۔

آج سجان نہیں آیا تھا، ہیر کی زبانی انھیں یہ معلوم ہوا تھا کہ اسے کافی بخار تھا، طوبیٰ کا دن خراب ہو گیا تھا اور ان سب کا بھی۔ وہ طوبیٰ کو دیکھ نہیں دیکھ سکتے تھے، طوبیٰ کا موڈ بری طرح خراب ہوا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سجان کے گھر پہنچ جائے۔

جائے، وہ سب اس کے گرد، اس کی دلجوئی میں گئے ہوئے تھے، سارے پیریڈ ہی انھوں نے روکے سوکھے لہجے میں لیے، نہ پڑھنے کو دل چاہا نہ کچھ سمجھا گیا، پریم، طوبیٰ کا ہاتھ پکڑے یونیورسٹی کی سڑک پر چل رہا تھا، بلاشبہ آج ہیر بری طرح نظر انداز ہوئی تھی، اسے جیلیسی میل نہیں ہو رہی تھی، مگر کچھ اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا، وہ بے دلی سے ان کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔

”آخری تین پیریڈ رہتے تھے اور سجان آ گیا، اس کی طبیعت ابھی بہت ٹھیک نہیں ہوئی تھی مگر وہ طوبیٰ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ سب پھر سے خوش ہو گئے، پریم نے نظریں دوڑائیں، وہ کہیں نہیں تھی، اسے بڑا افسوس ہوا، کوٹ کی جیب میں رکھا گلاب بالکل تر و تازہ تھا، وہ سامنے سیزھیوں پر افسردہ سی بیٹھی تھی۔

پریم نے کسی کاسٹیکس کی شاپ میں گئے اشتہار پر لکھا پڑھا تھا۔ ”نازگی میں حسن ہے“ اس نے جھٹ سے اس لکھنے والے کو زیرو نمبر عطا کیا، اس نے سر کوئی میں پلا کر اس کی ٹی کی۔ وہ اس وقت بالکل بھی فریش نہیں تھی مگر پھر بھی حسین سے حسین تر تھی، وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا، اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اتنی اداس کیوں ہو؟“ اس نے خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس میں پھول تھما دیا، اس نے مضبوطی سے اس کی ہنسی کو پکڑ لیا، اس نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا، وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”ناراض ہو؟“
”نہیں۔“ اس نے سر کوئی میں ہلایا۔
”سجان آ گیا ہے۔“ اس نے اسے اطلاع دی۔
”اوہ!“ ہیر نے ہونٹ سیکڑ کر اسے دیکھا۔

”جیسی آئے ہوتم۔“ اس کے منہ سے بلا ارادہ ہی نکل گیا، پریم نے چونک کر اسے دیکھا اچھا تو وہ واقعی ناراض تھی۔

”ہیر! تو مجھے طوبیٰ بہت عزیز ہے۔ وہ اداس تھی مجھے اچھا نہیں لگا کہ وہ ایسی رہے۔“ اس نے وضاحت دی، ہیر خود چاہے جتنی مرضی اداس رہے، وہ خود ہی اپنے خیال پر شرمندہ ہوئی اور شرمندگی سے ”سوری“ کہتے ہوئے پریم کی طرف دیکھا، پریم نے کوئی جواب نہ دیا، وہ بھی کہ اب وہ ناراض ہو گیا ہے گھبرا کر اسے دیکھا مگر وہ ناراض نہیں تھا، وہ ناراض ہو ہی نہیں سکتا تھا، ہیر نے سادہ سی سرخ فراک اور چوڑی دار باجامہ پہنا ہوا تھا، فراک کی آستینیں چھوٹی چھوٹی تھیں، اور نرم سی کلائی میں تین، چار سادہ سرخ چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں، گلے اور بازوؤں پر ہلکا ہلکا سفید کام ہوا تھا اور بس... ہمیشہ کی طرح نرم سا سرخ اور سفید ڈائی کیا ہوا دوپٹہ اس کے گلے میں تھا، پریم نے اس کے پکڑے ہوئے ہاتھ میں سفید گلوں والی برسلٹ رکھی اور پھر اٹھا کر خود ہی کلائی میں پہنا دی، وہ اس دوران سر جھکا کر مسکراتی رہی۔

☆.....☆.....☆
”مما!“ وہ بے یقینی سے اپنی ماں کو دیکھتا چلا گیا۔

”جو کہہ دیا ہے اسے فولو کرو۔“ ممانے دو ٹوک لہجے میں کہا۔
”نو... یہ میرے بس میں نہیں۔“ وہ مسلسل نفی کر رہا تھا۔

”اچھا تو کس کے بس میں ہے؟“ ممانے سے تیروں سے پوچھ رہی تھیں، اس نے سامنے رکھا پانی کا گلاس زور سے پرے پھینکا، ممانے نے فرمانبردار بیٹے کے اس رد عمل کو حیرانگی سے دیکھنے لگیں وہ تو جو کتنی تھیں وہ پھر پر لکیر ہوتا تھا۔

”مما! میری اسٹڈی کا کیا ہوگا؟“ وہ نرمی سے پوچھنے لگا، اپنی ماں کو وہ دیکھی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔
”بھڑ میں جائے اسٹڈی، وہاں تمہارا فینس یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو جائے گا۔“ وہ لاپرواہی سے بولیں۔

”مما! بس لاسٹ سیمسٹر رہ گیا ہے پلیز۔“ وہ لجاجت سے بولا، وہ بھڑک اٹھیں۔

”کون کرے اب اتنے منہ دیت؟“
”مما! اتنے تو نہیں تھوڑے سے ہیں۔“ وہ لاڈ سے بولا۔

”اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں، میں تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں، وہاں جاؤ گے تو ایک تو ہائر اسٹڈیز تمہاری کمپیٹ ہوں گی اور دوسرا پوائنٹ یہ کہ بھائی کی خواہش ہے کہ تمہاری اور ان کی چھوٹی کی انجمنٹ کر دی جائے، وہاں رہو گے تو انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے گی۔“ انھوں نے بڑے سچے کی بات کی، مگر اب کی بار بھڑکنے کی باری پریم کی تھی۔

”واٹ...؟ واٹ ممما! یہ کیا بات ہوئی؟ کون سی انجمنٹ اور کیسی انڈر اسٹینڈنگ؟“ وہ گویا اچھل ہی گیا۔ آج ممما کے لیے اگر صدقات کا دن تھا تو وہ دن پھر پریم کے لیے بھی تھا، ممما، لاڈ لے بیٹے کو بار بار بار بھڑکتا دیکھ کر حقیقت پریشان ہو رہی تھیں۔

”مما! کوئی شادی واوی نہیں، کسی بھی چھوٹی موٹی سے۔ میں نے ہیر سے شادی کرنی ہے بس، اینڈ تھنک مو۔“ وہ کرسی سے اٹھ گیا، ممانے اس کو بازو سے پکڑ کر بٹھایا۔

”آرام سے بیٹا! کون ہے وہ ہیر؟“
”میری کلاس فیلو۔“
”اچھا! تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔“ انھوں نے شاید گلہ کیا۔
”اب کرتا دیا ہے۔“ وہ بے زاری سے بولا۔ ممما

خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں، اسے حقیقتاً شرمندگی ہوئی۔

”سوری ماما! بٹ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔“ اس کے ذہن میں ہیر کا سراپا آیا۔

”اور اب تو ہرگز نہیں۔“ وہ کھویا کھویا بولا، وہ جواباً خاموش رہیں، وہ پریشان ہو گیا۔

”ماما! آپ ہیر سے ایک دفعہ مل لیں وہ آپ کو بہت پسند آئے گی۔“ وہ سمجھا شاید پسند کی شادی پر اعتراض ہے، جو بھی تھا وہ ان کا اگوتا بیٹا تھا، بغیر باپ کے بچے کو ممانے ہی بچپن سے لے کر اب تک ہر خواہش سے نوازا تھا، اور اب وہ ان کے بڑھاپے کا سہارا تھیں اس قدر ہرٹ کر رہا تھا۔

”پھر کیا ہو گیا ایک ماما کی خواہش ہے ہاؤ ایجوکیشن، تو پھر کیا ہوا؟ واقعی بھاڑ میں جائے لاسٹ سیکسٹر۔ وہاں تو مشہور یونیورسٹیز ہیں۔“

”مگر... اردو، طوطی، عدیل، مریم، سبحان اور... اور پھر ہیر۔“ وہ بے چین ہوا۔

”بیٹا! تم خدا نخواستہ وہاں ہمیشہ کے لیے تو سیٹل نہیں ہو جاؤ گے، پھر اتنی پریشانی کیوں؟“ انھوں نے نرمی سے کہا۔

”ماما! پھر بھی اتنا عرصہ گزر جائے گا، اور ہمارا تو پھر ہے بھی لاسٹ سیکسٹر۔ کون ملے گا اتنے عرصے کے بعد اور کہاں ڈھونڈوں گا انھیں۔“ وہ پھر پریشانی سے گویا ہوا۔

”اور آپ ایک نیا کھیل شروع کر داری ہیں، دھیان سے سن لیں، میں شادی کروں گا تو صرف ہیر سے۔“ اسے پھر سے غصہ آنے لگا۔

”مجھے امید ہے کہ تمہیں اپنی وہ کزن پسند آجائے گی اگر نہیں آئی تو تمہاری وہ ہیر تو ہے ہی۔“ انھوں نے دل سے فیصلہ کر کے اسے کہا، وہ ٹھیک سے خوش بھی نہ ہو سکا کہ بہر حال اب اسے جانا ہی تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ سب وہاں شکوہ تھے کہ یہ پریم کیا بول رہا ہے۔

”کبھی نہ کبھی تو تم لوگوں سے جدا ہونا ہی تھا تو پھر ابھی کیوں نہیں؟“ وہ سخت دل سے بولا۔ آج سب کو اس کی بات پر غصہ بھی نہ آ سکا کہ بہر حال وہ ابھی تک اس صدمے سے ہی باہر نہیں آ رہے تھے۔

”آج رات میری فلائٹ ہے۔“ اس نے ایک اور دھماکہ کیا۔

”اتنی جلدی...؟“ طوطی بمشکل بولی۔

”جب جانا ہی ہے تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔“ وہ ماما سے سخت ناراض تھا، اگر دیکھا جائے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی، مگر اس کے کچھ ریلیشنز ہی ایسے تھے کہ وہ سوچتا شاید وہ ان کے بغیر نہ رہ سکے، اس نے ہیر کو پھول پکڑاتے ہوئے بمشکل بتایا۔ وہ کچھ کہے بغیر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتی رہی وہ پریشان ہو گیا۔

”سچ میں جا رہے ہو؟“ اس نے جیسے تاکید چاہی۔ پریم نے اثبات میں سر ہلادیا، وہ پھر خاموش ہوئی۔

”اچھا ہے کہ تمہارا کیریئر بن جائے گا، اوکے پیٹ آف لک۔“ اس نے ٹیک اٹھایا اور جانے لگی، پریم نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ رک گئی، وہ منہ موڑے کھڑی رہی، وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

”کچھ ہوگئی نہیں؟“ وہ ہولے سے بولا، ہیر نے کافی دیر بعد نفی میں سر ہلایا، پریم نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا بانیکی کی طرف بڑھا۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو علی...!“ وہ بیک کندے پر ڈالے پورسا چلا جا رہا تھا کہ آواز پر پلٹا، وہ اس کے ماموں کی دونوں پٹیاں تھیں۔

”ہائے!“ اس نے جواباً کہا۔ بالوں کو براؤن ڈائی کیے جینز کے ساتھ ٹی شرٹس پہنے کیوٹ سی وہ دونوں اسے اچھی لگیں۔

”ویکم...!“ ریڈ شرٹ والی دونوں بازوؤں کو پھیلا کر بولی۔

”وہ تین، چار سال پہلے ان سے ملا تھا، اتنا تو وہ پہچان ہی گیا تھا کہ ریڈ شرٹ والی نیہا ہے اور بڑی ہے جبکہ وائٹ والی چھوٹی ہے۔“

”اوہ... اینٹری بیک مین! گاڑی ادھر ہے۔“ وہ ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ وہ صبح ہی تیار ہو کر یونیورسٹی جانے لگا تو دونوں نے ٹوک دیا۔

”یار! کوئی دو چار دن انجوائے کریں گے، چھوڑو تم آج ہی پڑھائی کے لیے ریڈی ہو۔“ وہ دونوں واضح اردو بول لیتی تھیں، منہ سورتی ہوئی نیہا بولی۔

”میرا موڈ نہیں۔“ وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”بیٹا! چلے جاؤ، فریش ہو جاؤ گے۔“ ماموں نے نرمی سے کہا۔

”ابھی موڈ نہیں، بعد میں دیکھا جائے گا۔“ دونوں، بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، انھیں ان کے اس کزن نے کافی مایوس کیا تھا، انھوں نے تو سوچا ہوا تھا کہ وہ خوب انجوائے کریں گے سب مل کر مگر... خیر انھوں نے سوچا اس نے سوچا تھا کہ ماما کو فون نہیں کرے گا مگر وہ ان کی آواز سننے بغیر رہ نہ سکا اور ان کی کال کو انٹینڈ کر لیا۔

”ٹھیک ہوں ماما! آپ کیسی ہیں؟“

”اچھا کھانا کھالیا، اوکے اپنا خنیاں رکھیے گا۔“ جلدی اس نے کال کاٹ دی۔

کافی دنوں بعد اس نے ہیر سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تو رابطہ ہی نہ ہو سکا، شاید اس نے نمبر تبدیل کر لیا تھا، اس نے مایوسی سے موبائل رکھ دیا،

نیہا لوگوں نے بہت کوشش کی مگر وہ ان سے زیادہ فریک نہ ہو سکا۔

ایک دن پھر اس کے کانٹیکٹ پر ہیر سے رابطہ ہو ہی گیا، وہ بہت خوش ہوا اور اسے بارہا ویڈیو چیٹ کا کہا، مگر وہ مانی ہی نہیں، وہ اسی پر راضی تھا کہ چلو اس کی آواز تو سنی۔

”کیسی ہو؟“ وہ بڑی خوشی سے بولا۔

”ٹھیک ہوں۔“ ہیر نے بھی لہجے کو خوشگوار کرنے کی کوشش کی، جلد ہی رابطہ کٹ گیا، مگر وہ اسی پر خوش خوش کمرے سے باہر نکلا، ان دونوں نے اس کے خوش چہرے کو حیرانگی سے دیکھا، وہ ان کی حیرانگی بھانپ کر دل کھول کر مسکرایا۔

”علی! آؤ اوکے؟“ یہاں شرارت سے بولی۔

”اوکے...؟“ اس نے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو صرف۔

”پپی بولو ڈیر۔“ وہ ان دونوں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”اچھا! پپی ہونے کی ریزن ہی بتا دو؟“ دوسری بولی۔

”پھر بھی بتاؤں گا۔“ وہ آنکھیں موندے صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ خوشخوار انداز میں سبحان کے کمرے میں داخل ہوئی، وہ سو رہا تھا مگر اس کی پرواہ کیے بغیر اس نے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر اسے اٹھایا، وہ بہت غصے میں بھی اور ناک اور آنکھیں بہت زیادہ رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں، وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

”اینی پراہلم؟“ ہیر کو سامنے دیکھ کر وہ بے زاری سے بولا، وہ سلگ اٹھی۔

”یو ایڈریٹ ماسٹو پڈ، ڈفر!“ وہ ایک ہی سانس میں چلائے لگی، اس نے پوری طرح آنکھیں کھول

لی تھیں اور ان خطابات پر حیران ہو رہا تھا۔
 ”بس اور کچھ؟“ اسے سونے کی جلدی تھی ان
 خطابات کی پرواہ کیے بغیر بولا اور پھر سے لیٹ گیا،
 وہ چڑ کر رونے لگی، سبحان گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔
 ”کیا ہوا... کیوں رو رہی ہو؟“ وہ پریشانی سے
 بولا۔

”تمہیں پتہ بھی تھا کہ پریم نے چلے جانا ہے
 پھر مجھے بتایا کیوں نہیں تھا؟“ وہ گلہ کرنے لگی، اس
 کے سر پر ابھی تک پریم کا ہی بھوت سوار تھا، وہ
 مسلسل روئے جا رہی تھی۔
 ”یار! مجھے نہیں تھا پتہ، اگر پتہ بھی ہوتا تو پھر کیا
 کر لیتیں تم؟“ وہ بھی چڑ گیا۔
 ”کچھ بھی کر لیتی، کم از کم اسے روک ہی
 لیتی۔“ اس نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔
 ”اچھا پھر جب لاسٹ ڈے وہ تمہیں ملا تھا
 تب کیوں نہ روک لیا؟“ وہ عجیب بات پر حیران
 ہوا۔

”جب تو اس کی سیٹ بھی ہو گئی تھی اور میں شاکڈ
 بھی تھی۔“ وہ غصے سے بولی۔
 ”اگر روکتی تو شاید رک ہی جاتا۔“ اس نے
 اب مشورہ دیا جب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
 ”آ تو اس نے جانا ہی ہے پھر یہ رونے دھونے
 کا کیا فائدہ؟ ویسے تو بڑا اس کا کیریئر، کیریئر کتنی
 ہو۔ وہ قسلی آمیز لہجے میں بولا اور آخر پر اس نے
 منہ بتاتے ہوئے کہا۔

”جانے کب آتا ہے؟“ وہ ماننے کو تیار نہیں
 تھی۔
 ”یار! کیا مسئلہ ہے، حوصلہ کرو، یہ بچوں کی طرح
 ری ایکٹ کیوں کر رہی ہو؟“ سبحان کو سمجھ نہیں آ رہا
 تھا کہ اسے کیا کہے۔
 ”ہوں... بچوں کی طرح ری ایکٹ... خود کو تو
 بخار میں بھی چھین نہیں آتا، بھاگے یونیورسٹی کو۔“

اس نے حساب برابر کیا۔
 ”اچھا طے دے رہی ہو؟“ وہ اس کا موڈ نارمل
 ہوتے دیکھ کر بات بڑھانے کو بولا۔
 ”نہیں جی۔“ وہ تپ کر بولی۔
 ”اچھا تو پھر اب میری کا پی کر رہی ہو؟“ وہ
 مسکراتے ہوئے اسے چلا گیا۔

”میں کیوں کرنے لگی، بھاڑ میں جاؤ تم۔“ اس
 نے رونے کا شغل ترک کر دیا تھا سبحان نے شکر ادا
 کیا، وہ اٹھ کر جانے لگی، سبحان کچھ یاد آنے پر بولا۔
 ”وہ جو مجھے ٹانگوں دیے ہیں ان کا کیا کرنا
 ہے؟“ اس کا انداز ان کا بھی حساب برابر کرنے کا
 تھا، کچھ زیادہ نہیں تو جواباً اسے اس کا ایک کان تو
 مروڑنا چاہیے یا پھر ناک کو زور سے دبانا چاہیے تھا،
 ہیران کا بدلہ سمجھتی۔

”رکھ لو اپنے پاس، شان میں اضافہ کریں
 گے۔“ وہ دروازے کے پاس گئی اور مڑ کر چڑاتے
 ہوئے کہہ کر پھر دروازے کے اس طرف ہو گئی۔
 ☆.....☆.....☆
 آج پھر وہ بہت اداس تھا، اس کی ساری شوخی تو
 اپنے ملک کے ایئر پورٹ پر ختم ہو گئی تھی یا شاید اس
 وقت ہی جب اس نے ممائی کی بات ماننے کا فیصلہ کیا
 تھا، وہ کبھی بھی بہت بچھتا تھا اور پھر ساری سوچوں
 کو بھٹک کر دل لگا کر کوئی بھی کام کرنے کی کوشش
 کرتا مگر...!

”کس دیس میں ہے دل میرا۔“ وہ اکثر گنگنا تا
 تھا۔
 ”کس دیس میں ہے دل تیرا۔“ یہاں شوخی سے
 اس کے سامنے آ کر گنگنائی، اسے مدخلت پسند نہ
 آئی وہ اس وقت تینوں یونیورسٹی میں آئے تھے، وہ
 شفاف اور صاف ستھری سڑک پر کوٹ کی جیبوں
 میں ہاتھ ڈالے چل رہا تھا، اس کے ساتھ وہ دونوں
 بہنیں بھی تھیں، وہ ان سے خاصا تیز چل رہا تھا، یہاں

نے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے ساتھ چلتی بہن کے
 پاؤں پر پاؤں مارا، اسے وہاں گئے ایک مہینہ ہو گیا
 تھا مگر ان کا کزن کے ساتھ گھومنے پھرنے کا شوق
 ابھی تک پورا نہیں ہو سکا تھا، یہاں تیز چلتے ہوئے
 اس کے کوٹ کے ساتھ لپکتی ٹوپی کو پکڑ کر اسے گھمایا
 اور اس کے کوٹ کی جیب میں سے والٹ نکال لیا۔
 ”کیا بد تیزی ہے؟“ اس نے ناگواری محسوس
 کی، جواباً وہ دونوں ڈھٹائی سے نہیں۔

”کزن ہونے کا اتنا تو حق ہے۔“ دونوں نے
 بیک ٹائم کندھے اچکا کر کہا اور والٹ میں سے چند
 ڈالر نکال لیے۔
 ”چلو آکس کریم کھاتے ہیں، آج منع نہ کرنا
 تمہارے ہی پیسوں کی ہوگی۔“ یہاں نے معصومیت
 سے کہا، وہ سر جھٹک کر مسکرا دیا۔
 ”ارے اسمگل... اسٹیمیز ریڈی ہو، چلو چلتے
 ہیں۔“ وہ ان کے ساتھ آ کر ٹکریا پارک گیا۔

”اچھا یہ بتاؤ یہ گنگنا کیا رہے تھے؟“ یہاں جان
 چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھی۔
 ”تم نے سن تو لیا تھا۔“ جواباً پریم نے کندھے
 اچکائے۔
 ”دوبارہ سناؤ گے؟“ اس نے اس سے پوچھا،
 پریم نے نفی میں سر ہلا دیا۔
 ”وائے...؟“ اس نے بد مزگی سے پوچھا اور چیچ
 آنسکریم میں سے بھر کر نکالا اور منہ میں جھٹ سے
 ڈال دیا۔

”اب موڈ نہیں۔“ اس کا واقعی موڈ نہیں تھا۔
 ”تمہارا موڈ کب ہوتا ہے، یہ یہاں تو تمہیں
 بوڑھی روح، سڑیل اور جانے کیا کیا ٹانگوں دے چکی
 ہے۔“ وہ کب سے بیٹھی سن رہی تھی، بول ہی پڑی،
 پریم نے جواب نہ دیا اور موبائل پر آئی کال ”لیں“
 کر لی۔

☆.....☆.....☆

”ٹھیک تو ہیں آپ ممائی؟“ وہ تشویش سے بولا،
 ممائی آواز سے تو وہ تندرست نہیں لگ رہی تھیں۔
 ”ہوں... فائن بیٹا! بس بات کرنے کو جی چاہ
 رہا تھا۔“ وہ مدھم لہجے میں بولیں، پریم کے دل کو
 کچھ ہوا۔
 ”نومما! آپ ٹھیک نہیں ہیں۔“ وہ آہستگی سے
 بولا، ممائی نے کوئی جواب نہ دیا۔

”ممما! اگر زیادہ بیمار ہیں تو میں آ جاؤں بلکہ میں
 ابھی سیٹ بک کروانا ہوں۔“ وہ جذباتی ہوتے
 ہوئے بولا، ممائی نے ہی اسے پالا تھا اور اب وہی ان کا
 سہارا تھا، یہ وہ بھی نہیں بھولا تھا، وہ کمرے سے باہر
 نکل آیا۔

”ہوں... آ جاؤ... میرا دل ہی نہیں لگ رہا
 تمہارے بغیر۔“ یہ ممائی کہہ رہی تھیں اس کا حیران ہونا
 بجا تھا۔

”جج...؟“ وہ بے یقینی سے بولا، مہارون نے لگ
 پڑیں۔
 ”کبھی تم چند دنوں کے لیے کہیں گئے نہیں اب
 دو ماہ ہو گئے ہیں، تم کتنی جلدی ہو آ جاؤ، بلکہ سب
 کچھ کلیر کر دانا، اب کہیں نہیں جاؤ گے تم۔“ اس کی
 دلی مراد برآئی مگر وہ ٹھیک سے خوش نہ ہو سکا، شاید ممائی
 زیادہ بیمار ہوں، واقعی یہی لگتا ہے ممائی کا دل نہیں لگ
 رہا، وہ سوچتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آیا، اس نے
 کال کر کے سیٹ بک کروائی، کل رات کی۔ وہ حقیقتاً
 خوش ہو گیا، اس کی خوشی میں پوری دنیا کو خوش ہونا
 چاہیے، اس نے سوچا وہ یہی چاہتا تھا مگر پہلے وہ اپنی
 دو سزوں کو خوش کر لے۔

”چلو گھومنے چلتے ہیں۔“ وہ ان کے کمرے
 میں جا کر بولا تو ان کا حیران ہونا بجا تھا۔
 ”اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں، جانا ہے تو
 آ جاؤ۔“ وہ شرمندگی چھپاتا ہوا غصے سے بولا، وہ
 اچھلتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئیں، وہ بہت گھومے

اور بہت جھوٹے۔ اس نے خوش ہونے کی وجہ بتائی تو وہ سمجھ گئی کہ یہ اس کا حق ہے۔

ہاں اتنی خوشی اس کا حق تھی، وہ جو اتنے ماہ سے خوش نہیں ہو سکا تھا، اس نے ان دو ماہ کو زندگی کو برا خواب سمجھا، مگر ان دونوں کو اس کے جانے کا تھوڑا دکھ تھا، آج ہی تو اتنا انجوائے کیا اور یہ سب ایک خواب ہو گیا، وہ اتنا گھوٹے کی باری پڑول ڈالوایا۔

کافی رات کو جب صبح ہونے والی تھی وہ تب گھر گئے، وہ دن وہاں اس کا آخری دن تھا۔

”تم لوگ بھی چلو میرے ساتھ“۔ اس نے اپنی خوشی میں انہیں آفر کی۔

”پھر کبھی“۔ وہ تنبیہ کی سے بولیں، وہ اتنا سنجیدہ کم ہی ہوتی تھیں، اس نے سب کے لیے شاپنگ کی اور یہ سب کے لیے ہی سر پرانز تھا، صرف ماکو ہی پتہ تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے ہیر کو دیکھا، وہ بہت مر جھائی ہوئی تھی، وہ سب سے خفا خفا سی لگی، خیر وہ اسے منالے گا، وہ سیدھا ای کے پاس جانا چاہتا تھا مگر نہیں، وہ سب سے آخر میں اس کے پاس جائے گا تاکہ وہ باقی کا سارا نام صرف اس کے ساتھ گزارے۔

اس کے سارے دوست اس کے لوٹ آنے پر خوش نہیں بہت خوش تھے، آج ان سب نے کوئی چیز یاد نہیں لیا تھا، ہیر کا ڈیپارٹمنٹ الگ تھا، سو وہ بے خبر تھی۔ ان کے ٹریڈ کے مطالبے پر وہ بے اختیار ہنسنے لگا، وہ ہزاروں ٹریڈ دینے کو تیار تھا۔

”مگر سنو! میں تو تیار ہوں مگر دینی تم لوگوں کو چاہیے“۔ وہ پھر سے وہی پریم تھا، خدی، شرارتی اور پہلے جیسا۔

ہیر اسے دیکھ کر پھر شاکدہ رہ گئی، مگر وہ کھل کر مسکرا رہا تھا، وہ سمجھ گئی کہ وہ حقیقتاً اس کے سامنے ہے، وہ مسکرانے لگی مگر جھٹ سے خشکی سے گردن

موڑی، اس کا حق تھا اتنا خفا ہونا تو۔ وہ تو اس کے ساتھ خوب بھگڑا ڈالنا چاہتا تھا پھر وہ اسے ناراض کیسے دیکھ سکتا تھا۔

”میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ ناراض ہو“۔ اس نے جواب نہ دیا۔

”اور یہ بھی نہیں کہ کیسی ہو؟“ پھر کوئی جواب نہیں، اس نے نرمی سے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے۔

”آئی نو۔ تم مجھ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتیں اور اب مجھے دیکھ کر بہت ہی تندرست ہو گئی ہو، بالکل ٹھیک ہو“۔ پریم کی شوخی عروج پر تھی، وہ اس سے بہت لڑنا چاہتی تھی مگر یہ تو پتہ تھا کہ اس کے خشکی باندھ کر دیکھنے سے اسے بات بھول جایا کرتی تھی، اس نے خشکی سے اسے دکھا مارا مگر پھر ہلکلا کر ہنسنے لگی، وہ جھٹ سے مان گئی تھی۔ پریم کی معصوم سی ہیر...

یہ ان کا یونیورسٹی میں آخری فنکشن تھا، پریم اور طوبی ہر جگہ کوئی بھی کام ساتھ کرتے تھے۔ مگر اس دفعہ اس نے طوبی سے پیشگی معذرت کر لی۔ وہ خفا ہونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

”یار پریم! عجیب عاشق ہو یا را! وہ سچا ہی تو ہے ناں اتنا بھدار بچہ، مگر ایک تم ہو یونیورسٹی کے پھول ختم کرنے پر تلے ہوئے“۔ وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

”اچھا اچھا اب جیلس ہو رہی ہو“۔ وہ جیسے کچھ سمجھتے ہوئے بولا، وہ پھر سے ہنسنے لگی۔

”وہ تمہارا سچا ہے اور میں پریم اس کا...!“

وہ پھر شرارت سے بولا۔ پریم نے ہیر کو بارہا فورس کیا کہ وہ اس کے ساتھ فنکشن پر ڈانس کرے، وہ شرماتے ہوئے گھورنے لگ جاتی، وہ سمجھتی تھی کہ وہ بس اسے تنگ کرنے کے لیے کہہ رہا ہے بات تو ٹھیک تھی، مگر اگر اس کا بس چلتا تو وہ سچ میں اس کے

ساتھ ناچنا شروع کر دیتا، مگر اس نے ہیر کو اپنے ساتھ کبیرنگ کرنے کے لیے منایا لیا، وہ بہت کنفیوژ ہو رہی تھی مگر وہ پریم کی بات کو ٹال نہیں سکتی تھی۔

”اک شخص ہم کو چاہتا تھا شاید اس نے ہماری محبت میں کمی محسوس کی جو وہ ہم سے روٹھ گیا نہیں! سنا ہے وہ ہم سے روٹھا نہیں تھا اس کی مجبوریاں تھیں مگر ہمارے درمیان تو پھر دوریاں تھیں ہماری محبت میں بہت کشش تھی شاید تھی تو اسے ہماری محبت سے بہت ہی ”عشق“ تھا

اک دن پھر سر دھواؤں کے درمیان وہ پھر سے لوٹ آیا

ہاں! وہ واقعی لوٹ آیا

پھر ہمیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ ہم سے پچھرا ہی نہ تھا...

ہیر نے مسکراتے ہوئے ڈائری بند کی اور مینسل نکال لی۔ وہ گہرے سبز رنگ کی لمبی فرائی اور چوڑی دار باجامہ پہنے پریم کے ساتھ کھڑی تھی، فرائی پر ہلکا سا سفید کام تھا اور نرم سا دودھیا اس کے گلے میں جھول رہا تھا، پریم کا دیا ہوا سفید گلوں والا بریلیٹ اس کی کلائی میں تھا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی، وہ پورا فنکشن یوں ہی ساتھ ساتھ رہے، وہ بہت اچھا دن تھا، پھر سیکسز شروع ہو گیا، وہ پڑھائی میں جت گئے۔

☆.....☆.....☆

”بچی کے تواب پیپر بھی ختم ہونے والے ہیں، بھائی صاحب! اب شادی کی تاریخ ناں پکی کر لیں؟“ بڑی پھپھو کو لڈو ٹک کا گلاس پکڑے ابو

سے کہہ رہی تھیں، ہیر جو چائے پکڑا کر دروازے کے پاس پہنچی تھی ٹھٹھک کر رک گئی۔

”پیپر ختم ہو جائیں تو پھر انشاء اللہ جلد ہی کر لیں گے“۔ ابو نے نرمی سے جواب دیا، ہیر پریشان ہو گئی۔ اس نے چائے کا کپ پڑے اپنی طرف آتے سچاں کو دیکھا، وہ اسے پریشان دیکھ کر اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا؟“ پھر چلتے ہوئے اس کے پاس ہی آ کر کھڑا ہو گیا۔

”بھائی صاحب! میں نے کہا بھی تھا آپ اسے بہت نہ پڑھا میں، بس جلدی جلدی ہمارے گھر بھیج دیں، رونق ہو جائے گی“۔ پھپھو پچکار تے ہوئے بولیں۔

”آپا! کہہ تو دیا ہے کروں گے“۔ امی نے رسائی سے کہا۔

”بچی کو بتایا ہوا ہے کہ اس کی پھپھو کے بیٹے سے بات ملے ہے؟“ پھپھو بات بڑھانے کو بولیں۔

”نہیں آپا! سوچا تھا کہ وقت آنے پر بتا دیں گے“۔ امی نے جواب دیا۔

”ہائے... ہائے! لوبھلا بتا دیتا تھا، خیر سے وہ جہاں پڑھتی ہے وہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہوتے ہیں، آج کے بچوں کا کیا پتہ، کہیں خود ہی نہ پسند کر بیٹھے ہوں“۔ پھپھو تشویش سے بولیں، ہیر کو پیروں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”نہیں آپا! وہ تو ہر بات شیر کرتی ہے مجھ سے اور ویسے بھی کوئی بات نہیں ایسی، ایسا کچھ فضول نہیں سوچنا چاہیے آپ کو، بڑا مان ہے مجھے اپنی بیٹی پر“۔ ابو کی بات پر ہیر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”بیٹا! دل میں جو بات ہو مجھے کہنا، دیکھو مجھے تم پر بہت اعتبار ہے، اور بہت لاڈلی ہو تم میری“۔ ابو نے بہت عرصے پہلے اسے ایک دفعہ کہا تھا، ابو اس

اندھ کی تقلید



خود بات کروں گا تمہارے قادر سے آج ہی۔“ وہ جیسے فیصلہ کر کے بولا۔

”نہیں!“ ہیر نے نفی میں سر ہلایا۔

”تم بات نہیں کرو گے۔“

”کیوں... دیکھو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں تمہارے لیے۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”تم میری بات سمجھو... آج لاسٹ پیپر ہے ناں۔“ وہ بڑبڑائی۔

”کیا تم چاہتے ہو میری وجہ سے ابو دکھی ہوں، میری پھپھو بائیں بنا کیں؟“ وہ بالکل بھی رو نہیں رہی تھی، وہ یہ بالکل بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ کوئی ہیر کو کچھ کہے۔

وہ کمزور نہیں تھی بلکہ بہت مضبوط تھی، وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا، بھی تو اسے بدنام نہیں کروانا چاہتا تھا، یہ بہت بڑی بات نہیں تھی کہ پھپھو چند دن بائیں کر کے ہٹ جائیں، ابو دکھی ہوتے تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاتے اور ان کی محبت کی پیپی اینڈنگ ہو جاتی، مگر سمجھا جائے تو یہ بات بہت بڑی تھی، ابو کا مان توڑنا اور کردار پر کوئی بھی بات سہنا بہت بڑی بات تھی۔ وہ سمجھ گیا، اور پھپکا سا مسکرایا، وہ دونوں کمزور نہیں تھے بلکہ بہت مضبوط تھے، کیا ہوا اگر وہ نہ مل سکے، دل تو ان کے ایک دوسرے کے دیس میں ہی ہونے تھے۔

”اللہ حافظ!“ ہیر بمشکل مسکرائی اور بولی، ہمیشہ وہ اسے بائیں کہہ کر جاتا تھا مگر آج وہ کھڑا تھا اور وہ جاری تھی، زرد پٹیا لاشلوار اور گلانی اونچی میض اور باریک دوپٹہ پہنے پر پیام کو اس کی یہ ڈرینگ بہت پسند تھی۔

”ہیر!“ اس کے پکارنے پر وہ مڑی۔

”اللہ حافظ!“ اس کے کہنے پر دونوں مسکرائے اور اپنی اپنی راہ لی۔

☆.....☆.....☆

سے بہت پیار کرتے تھے اور اس کی ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جایا کرتے تھے۔

”اف...! اب کیا ہوگا؟“ وہ کانپتے ہوئے سوچنے لگی، اس نے پر پیام کی بابت گھر والوں سے کوئی بات نہیں کی تھی، جب پر پیام پر پوزل بھیجتا گھر والوں کو وہ بتا دیتی، مگر یہ کیا ہوا؟

”میں خود چاچو سے بات کروں گا، بلکہ کرتا ہوں، تم فکر نہ کرو، اور ڈرو بھی نہیں، ڈونٹ وری یار!“ سبحان اس کی حالت دیکھ کر گھبرا کر آہستگی سے بولا، اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”فی الحال چپ رہو۔“ وہ بڑبڑائی۔ پھپھو بات کو بہت بڑھادی تھی اور جب وہ ابو کو بتائے گی جب وہ پھپھو سے سب ملے کر کچے ہوں گے تو ان پر کیا بیٹے گی، وہ سوچ کر دہل گئی۔

”پھپھو لے جائیں گی تمہاری ڈولی اور رہنا تم چپ۔“ وہ پڑ گیا۔ اسے بچپن سے لے کر اب تک کی ابو کی محبتیں اور نوازشیں یاد آئیں، وہ روتے ہوئے کمرے میں چلی گئی، وہ بہت روئی۔ ممکن ہے ابو اس کی بات کو مان لیتے، مگر اس کے گھر میں اس سب کی گنجائش ہی کہاں نکلتی تھی، تو کیا وہ مقدمہ لڑے بغیر ہی ہارنے کا فیصلہ کر رہی تھی؟ ابو اسے کچھ نہیں کہیں گے مگر انھیں بہت زیادہ دکھ ہوگا، وہ کیسے سراٹھائے پھپھو کی باتوں کو جھٹک رہے تھے۔

”اوہ میرے خدا!“ وہ روتے ہوئے بے اختیار بولی، پر پیام سے دستبردار ہونا پوری خوشیوں کو لات مارنا تھا اور ابو کو دکھی کرنا شاید... بہت زیادہ ہی خوشیاں بھلانا تھا۔ وہ اپنے حق کے لیے لڑے، یہ اس کا حق تھا، مگر وہ اس کے ساتھ لڑے جس کے اس پر بہت احسان تھے۔ صبح پر پیام نے اس کی بات سنی تو بھڑک ہی اٹھا، وہ کیسے اس کے بغیر جیے گا؟ مگر وہ اس کے بغیر مر بھی نہیں سکتا تھا۔

”اف...! مجھے پتہ نہیں تھا تم تنہی کمزور ہو، میں

ہے، جب وہ بچے کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو درست کرنے کی بجائے نظر انداز کرنا شروع کر دیتی ہے کہ ہر چھوٹی بڑی بات پر بچے کو ٹوکنے سے خود اعتمادی کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن یہ خود اعتمادی کی کمی اس خود اعتمادی کی زیادتی سے کہی جاتا ہے کہ وہ اپنے ہر غلط کو تباہی کے دہانے پر لاکھڑا کرتی ہے، وہ اپنے ہر غلط کام کو ہی اس اعتماد کے ساتھ سرانجام دیتا ہے کہ وہ صحیح کر رہا ہے، اور یہ اعتماد عطا کرنے والی یقینا اس کی ماں ہوتی ہے، تو کیا ہمیں اپنی اولاد کو ایسا اعتماد دینا ہے جس میں وہ اپنی صحیح راہ کا تعین بھی نہ کر سکیں، یا ایسا اعتماد جو اسے اچھے اور برے کی تیز کرے۔

سب سے پہلی اصلاح کی ضرورت ہم ماؤں کو ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو اچھا انسان بنانے کے لیے ان کی تربیت کن خطوط پر کرنی ہے، کیونکہ ایک اچھی ماں ہی ایک اچھی قوم کی معمار ہو سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

ادارہ رڈا ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

تم میرے ہو کے رہو

صالحہ محمود

قیمت: 500 روپے

ملنے کا پتہ:

ویل کم بک پورٹ اردو بازار کراچی

رڈا ڈائجسٹ 77 اپریل 2014ء

کار فرماہیں؟

☆ ☆ ☆

یہ ہے مغربی تہذیب کی اندھی تقلید میں پاگل ہوتی ماں کا شاخسانہ، آج ماں کا کردار فقط اتنا رہ گیا ہے کہ بچوں کو اچھا کھلائیں، ان کو فیشن کے مطابق چلائیں ان کے کچے ذہنوں پر فیشن اور تقلید کے الفاظ اس سیاحتی سے لکھے جائیں، جو ان کے نصیب کی سیاحتی سے دھلیں تو دھلیں ورنہ کسی اور سیاحتی سے تو دھلنے کے نہیں۔

بچوں کے ہاتھوں میں موبائل، انٹرنیٹ، لپ ٹاپ دے کر ہم لبرل ازم کا راگ الاپنے والے یہ جانتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

ماں جب بچے کو ہر قسم کی سہولت دیتی ہے تو پھر وہ اس پر نظر کیوں نہیں رکھتی کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اس کے مشاغل کیا ہیں؟ اس کی صحبت کیا ہے؟ اس کی سوچ کیا ہے؟ نہیں بالکل نہیں، ایسا کر کے ہم اپنے اوپر دقیقہ نویس کا ٹیپہ کیسے لگاوا سکتے ہیں، ہم تو آزادی کا جھنڈا لہرانے والی قوموں کی صف اول میں کھڑے ہونا چاہتے ہیں، اس کے لیے چاہے ہم انسانیت اور اخلاقی اقدار کی جس بھی پستی میں گریں اس میں کوئی مذاق نہیں ہے۔

ان سارے مسائل کے ہونے یا نہ ہونے کا ذمے دار کون ہے؟ یہ جو سارے مسائل ہیں جو معاشرے کی ذلت و رسوائی کا باعث بن رہے ہیں ان کا ذمے دار کون ہے؟

یہ تمام مسائل کب جنم لیتے ہیں؟ جب ہم اپنی زندگی کی لگائیں ایک ایسے بندے کے ہاتھ میں تھماتے ہیں جو کہ خود تو ایک دودھاری نکواری جیسے راستے پر خوشنم ہوتا ہے، اس لیے وہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ ضرور گھسیٹتا ہے کہ آج تم بھی اس راستے پر چل کر دیکھو کہ گناہ کے راستے میں کتنی لذت ہے، بچے کے کردار میں لڑکھڑاہٹ اس وقت آتی ہے جب ماں کی صحبت میں زیادتی جائز سے ناجائز صورت اختیار کرنے لگتی

ساتھ اکلوتی ہے، محبوب کے شہر پہنچنے پر لڑکی کو ہاتھ چلتا ہے کہ اس کا محبوب کسی بڑے عہدے پر نہیں بلکہ معمولی سا ریڑھی بان ہے، اب وہ نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ اپنے قدم پیچھے ہٹا سکتی ہے۔

آگے قدم بڑھاتی ہے تو آگے منزل تو ہے، پر ایسی جس میں اذیت، لعنت و ملامت، بد دعاؤں، ناکام حسرتوں کے سرے ایسے اچھے ہیں کہ ان کو سلجھانے کی کوشش میں اگر خدا نے واحد سے ایسی ستر زندگیاں بھی مانگ لائے تو وہ بھی کم ہیں، پیچھے دیکھتی ہے تو تمام کشتیاں جل چکی ہیں، اب راکھ کریدنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔

☆ ☆ ☆

افسوسناک امر یہ ہے کہ فقط پندرہ سولہ سالہ بچی اتنا بڑا قدم کس لیے اٹھاتی ہے، آخر اس کی برأت اتنی بڑھی کیسے کہ میلوں دور بیٹھے اس چند دن پرانے محبوب کے سامنے اسے اپنے سب خون کے رشتے تک بھول گئے، اسے وہ سب محبتیں بھول گئیں جن کو سمیٹے اسے اپنا دامن کم پڑتا محسوس ہوا کرتا تھا، اب ان ہی محبتوں کو اپنے قدموں تلے روندتے ہوئے اور اپنے والدین کی عزت اچھا لیتے ہوئے اس کے ہاتھ ذرا نہ کانپے؟ اس کے قدم ذرا نہ ڈمگ گئے؟ ایسا کوئی بھی عمل کرتے ہوئے ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اوپر ایک ایسی ذات بھی ہے جو بہتر کار ساز ہے۔

وہ لڑکی جب میں گھٹے سفر کرنے کے بعد اپنا گھر بار، اپنے رشتے ناتے تیا گئے کے بعد جب اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچتی ہے، جب انصاف الہی جسم صورت میں اس کو اپنے سامنے ملتا ہے، جس کے ساتھ اب اسے اپنی باقی ماندہ زندگی کے دن اپنی ماں کی آہوں اور سسکیوں کا حساب دیتے ہوئے چکانا ہے، یہ تو عمل کرنے والے کی حقیقت ہے۔

لیکن اس عمل کرنے والے کے پیچھے محرکات کون سے ہیں؟ آخر ہماری تباہی کے پیچھے کیا وجوہات

آج کا اخبار میرے ہاتھوں میں ہے اور میری حالت ایسی ہے گویا جسم میں جان باقی نہ رہی ہو، میں سوچتا کچھ چاہتی ہوں پر سوچ نہیں پانی، کرنا کچھ چاہتی ہوں پر کر نہیں پانی، میرے حواس گویا سلب ہو چکے ہیں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا، ہم لوگ کیا کر رہے ہیں؟ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟ کیا یہ ہے ہمارا آج؟ کیا ہوگا ہمارا کل؟ مغرب کی اندھی تقلید میں آخر ہم کہاں تک جائیں گے، فیشن اور جدیدیت کے نام پر ہم اور کیا کیا اپنائیں گے؟ اپنی اقدار اور روایات کو چھوڑ کر دوسروں کی اندھی تقلید کا شاید یہی انجام ہوتا ہے کہ ہماری نسل محبت جیسے لافانی جذبے کے نام پر کون سے معرکے سرانجام دے رہی ہے، آج کی یہ محبت ہمیں تباہی، ناکامی، نامرادی، ذلت، رسوائی، ذلالت اور بدنامی کے ایسے گڑھے میں پھینک چکی ہے، جس سے انسان نکلنے کی کوشش کرے تو ذلالت اور پڑا رہے تو موت ہی اپنی آغوش میں پناہ دے سکتی ہے، اور ان کے آگے قطعاً دوسرا کوئی راستہ نہیں بچا۔

☆ ☆ ☆

میں ایک گھریلو خاتون ہوں مجھے زمانے کی اونچ نیچ کا کچھ خاص علم نہیں ہے، مجھے بھاگتے زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا بھی نہیں آتا ہے گھر کے کام کاج کرتے کرتے میں دن سے رات اور رات سے دن کرنی ہوں، میری زندگی میرے گھر سے شروع ہو کر میرے گھر پر ہی ختم ہوتی ہے، لیکن میری ہمیشہ سے یہی عادت رہی ہے کہ میں ناشتہ کرنے سے پہلے اخبار ضرور پڑھتی ہوں، آج کی خبر جب میری نظروں سے گزری تو چند ساعتوں کے لیے مانو مجھے سکتے ہو گیا، میرا دل چاہا میں اتنا پھوٹ پھوٹ کر روؤں کہ ہر طرف جل جل ہوا جائے۔

میٹرک کی ایک طالبہ جو کہ ایک بڑے شہر کی رہائشی تھی، موبائل دوستی سے پروان چڑھنے والی محبت کے لیے راتوں رات گھر سے بھاگ کر ایک چھوٹے سے قصبے میں آ گئی، اس محبت کی خاطر جس میں صنف مخالف ایک معمولی سا ریڑھی بان ہے، لڑکی کم عمر ہونے کے ساتھ



”بہی سونیا! آج نو بجتے کو ہیں لیکن سجادول ابھی سے اپنے بیٹے کے لیے پریشان تھیں۔
”امی! آپ فکر نہ کریں بھائی آتے ہی ہوں تک اسپتال سے واپس نہیں آیا۔“ مسرت بیگم کب



میں شاید کوئی کام پڑ گیا ہو۔“ سونیا جو شام کا کھانا بنا رہی تھی، ماں کو پرسکون یا مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگی، مسرت بیگم نے چینی سے انتظار کرتی ہوئیں برآمدے میں غصے لگیں اور سونیا سے پھر مخاطب ہوئیں۔

”سونیا! ذرا سجادول کو کال کرنا، میرا دل گھبرا رہا ہے، شہر کے حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں، انسان کو کچا جرمو کی طرح کاٹا جا رہا ہے، آئے دن کوئی نہ کوئی نئی خبر سننے کو ملتی ہے۔“ مسرت بیگم کراچی کے حالات سے خوب آشنا تھیں اور سجادول کا لیٹ ہونا ان کا خون خشک کیے جا رہا تھا۔ سونیا کب سے سجادول کو فون کر رہی تھی، لیکن کال ریسپونڈ نہیں ہو رہی تھی، آخر کار تھک مار کر مسرت بیگم اپنے بیٹے کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگنے لگیں، بسھی بھار سونیا کو اپنی ماں پہ غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں سجادول کے لئے اتنی پریشان ہو جاتیں ہیں، وہ کونسا کوئی بچہ ہے جسے گھر کا پیٹ نہیں چلتا، لیکن سونیا یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتی تھی کہ سجادول کے علاوہ ان کا سہارا ہی کون ہے، بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانا کوئی مصیبت سے کم نہیں تھا، سونیا اپنی ان سوچوں میں گم تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا اور وہ دروازہ کھولنے کے لیے بھاگی، لیکن دروازے پر منظر ہی عجیب تھا، خون میں آلودہ چادر جو لاش پر ڈالی گئی تھی، وہ اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ کچھ ضرور ہوا ہے، دو پولیس اہلکار آگے بڑھے اور لاش کو اٹھا کر اندر لے آئے، اس سے پہلے کہ سونیا کپڑا اٹھاتی مسرت بیگم جو بیٹے کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں، انجینی مردوں کو اندر آتے ہوئے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”کیا ہوا ہے؟ یہ کون ہے؟“ اس کو ابھی پولیس اہلکاروں نے جواب نہیں دیا تھا کہ سونیا نے لاش کے منہ سے کپڑا اٹھایا اور اپنے جوان بھائی کو خون

میں لت پت دیکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ مسرت بیگم نے چیخنا شروع کر دیا۔ پولیس اہلکاروں نے بتایا کہ۔

”روڈ پر کچھ نامعلوم افراد نے فائرنگ کی، جس میں سات لوگ جاں بحق ہو گئے ہیں اور آپ کے بیٹے کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے، تاہم ابھی تک کوئی ملزم گرفتار نہیں ہو سکا، امید ہے کہ ملزم گرفتار کر لئے جائیں گے۔“ اتنا بتا کر وہ لوگ چلے گئے، لیکن مسرت بیگم کی گودا بڑ چکی تھی، وہ چراغ بجھ چکا تھا جس سے اس گھر میں ہلکی سی روشنی تھی، سجادول 24 سال کی عمر کا خوش اخلاق نوجوان جو ابھی دو ماہ پہلے ڈاکٹر کے عہدے پر فائز ہوا تھا اس نے اپنے باپ کا خواب پورا کر دیا تھا، جسے دیکھ کر مسرت بیگم اپنے مستقبل سے مطمئن تھیں کہ اس کا ماضی جو برے اور اتر حالات پہ مشتمل تھا، گزر گیا اور خوشحالی کے دن آنے لگے، لیکن اسے کیا خبر ”ہوتا ہے وہی جو لکھا ہوتا ہے تقدیر میں“ آج پھر تقدیر نے مسرت بیگم کو بے حال چھوڑ دیا، پیٹ کاٹ کاٹ کر پالنے والی مسرت بیگم اپنے بیٹے کو بھی کھو بیٹھی تھیں، اب ان کے پاس نہ کوئی مال تھا نہ کوئی اور چارہ جس سے وہ تدفین کا انتظام کر سکتیں۔ محلے والے مسرت بیگم کی چیخ و پکار سن کر اکٹھے ہو گئے اور مسرت بیگم کو حوصلہ دینے لگے، سونیا بار بار اپنے بھائی کو ہی ملنے جا رہی تھی۔

”دیکھ لے سونیا! آخری بار اپنے ویر کو.... یہ چہرہ پھر دکھائی نہیں دے گا۔“ مسرت بیگم جو سونیا کو تڑپتا دیکھ کر خود رونے لگیں۔ سونیا کی دوستیں جو قریب ہی محلے میں رہتیں تھیں، سن کر آگئیں اور سونیا کو سنبھالنے لگیں، محلے والوں نے تدفین کا انتظام کیا، یوں سجادول کو منوں مٹی کے بوجھ تلے دبا دیا گیا، آج مسرت کے گھر کا آگن سونا پڑا تھا، محلے کی عورتیں آ رہی تھیں اور افسوس کر کے جا رہی

تھیں۔

سمرت بیگم کے ماں باپ پچھلے دو سالوں سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، سمرت بیگم ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، انہوں نے غربت ہی میں آنکھ کھولی اور سسرال میں بھی غریبی ان کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔ شوہر ایک فیکٹری میں گارڈ تھا، گھر کی گزر بسر مشکل سے ہو رہی تھی۔ سمرت بیگم نے سلائی کڑھائی کا کام شروع کر دیا لیکن سلطان (سمرت بیگم کا خاوند) جو سمرت بیگم سے بہت محبت کرتا تھا، اسے تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا، اسے منع کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت دیتا، لیکن الفاظ گونگے بن جاتے، مہنگائی کے اس دور میں وہ دن رات اپنے گھر کے حالات بدلنے کی کوشش کرتا، جب سلطان گھر آتا سمرت کھانا سرو کرنے کے بعد لوگوں کے پڑے آدمی آدمی رات تک سلائی کرتیں رہتیں، گھر کے حالات تبدیل کرنے، اپنے بچوں کا مستقبل روشن کرنے کی اس دوڑ میں دو جی دن رات اپنی جانوں کو سولی پہ چڑھا کر مہنگائی کے دور میں حالات بدلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، لیکن قسمت کے آگے کس کا زور، ایک رات جو جنوری کی سرد راتوں میں سے ایک تھی، ہر طرف دھند نے اپنا ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ سلطان فیکٹری کے باہر پہرہ دے کر تھک گیا تھا، اس نے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا سوچا۔ ابھی اس نے اپنی بندوق کندھوں سے اتاری ہی تھی کہ دھند میں اسے دو آدمی اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے، انہوں نے سلطان کو بغیر کچھ کہے شوٹ کیا، اور فیکٹری کے اندر چلے گئے، اس فیکٹری کا شمار دنیا کی بڑی فیکٹریوں میں ہوتا تھا، اس لیے اس کے کئی دمن تھے، ان لوگوں نے فیکٹری کا صفایا کیا اور چلے گئے، اس وقت سلطان کے پاس کوئی نہیں تھا، شدید سردی ہونے کے

باعث لوگ اپنے اپنے گھروں میں تھے۔ سلطان اگرچہ ان لوگوں کو نقاب کے باوجود پہچان چکا تھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا اس کی روح پرواز کر چکی تھی، فیکٹری کا مالک سعودیہ میں رہائش پذیر تھا، سلطان نے ان ڈاکوؤں کو دو بار پھانسی دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ اس کے دشمن بن گئے تھے۔ سمرت بیگم کے ماں باپ نے بھی ساری زندگی کرائے کے مکان میں بسر کی تھی اور وہ خود بھی اب تک کرائے کے مکان میں زندگی گزار رہی تھیں، غریبی میں سب رشتہ داروں نے ساتھ چھوڑ دیا، آج سجاد کو گئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے، محلے والے آ رہے تھے اور افسوس کر کے جا رہے تھے، جب لوگوں کا دل کم ہوا تو سمرت بیگم کمرے میں آ کر سجاد کی تصویر دیکھ کر رونے لگیں، سونیا خود بکھر چکی تھی، محلے کی لڑکیوں نے سونیا کو کھانا کھانے کے لئے دیا، لیکن اس کی بھوک مرچکی تھی سب کے اصرار پر دو لٹے لیے اور کمرے میں چلی آئی۔ ماں کو روتا دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے کوئی مصیبت کا بہت بڑا پہاڑ اس پر گر گیا ہو لیکن وہ ایک باشعور اور صابر لڑکی تھی، وہ جانتی تھی کہ خدا ان کو آزار رہا ہے، اب صبر کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

”امی! بس کریں ہمارے رونے سے بھیا کو تکلیف ہوگی۔“ سونیا ماں کے آنسو صاف کر رہی تھی۔

”ہاں بیٹا! خدا جو کچھ کرتا ہے ہماری بھلائی ہی کے لیے کرتا ہے۔“ وہ سونیا کو گلے لگا کر تسلی آمیز الفاظ کہنے لگیں وہ جانتیں تھیں کہ اب سونیا ہی ان کا سب کچھ ہے، آج کتنے دنوں بعد سمرت بیگم نے خود کو سنبھالا اور سالوں سے جام ہوئی سلائی مشین کو تیل دے کر دھوپ میں رکھ کر سونیا کے پاس چلی آئیں۔ سونیا اپنی پرانی کتابوں کی چھان بین کر

رہی تھی جس میں اس کے بھائی کی کتابیں بھی شامل تھیں۔ اچانک سونیا کے ہاتھ میں BSC کی ایک کتاب آ گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر محسوس کیا، جس میں سجاد بیٹھا پڑھ رہا تھا اور سونیا اپنے بھائی کے لیے دودھ کا ایک گلاس بنا کر لائی اور کہا۔

”بھائی! آپ اتنی موٹی موٹی کتابوں میں سر کھپاتے رہتے ہو، کچھ کھانے پینے کی طرف بھی دھیان دیا کریں۔“ تو سجاد مسکرا کر کہتا۔

”تم ہر وقت مجھے کیوں نوٹ کرتی رہتی ہو، گھر کے معاملات میں امی کا ہاتھ بٹایا کرو، اور by the way جب تم میری کلاس میں آؤ گی تب پتہ چلے گا۔“ سونیا منہ بنا کر کہتی۔

”میں ایسی کتابیں نہیں پڑھوں گی، آپ کا تو صرف ایک ہی جنون ہے کہ ڈاکٹر بننا ہے، پولیس میں بھرتی ہو جاتے، کامرس کی فیلڈ میں چلے جاتے، نابالبا بنائیں! میں ایسی کتابوں میں سر نہیں کھپاؤں گی، میں تو بینک منیجر بنوں گی۔“ سونیا فخر سے سر ہلا کر کہتی۔

”میں تجھے نوکری کرنے نہیں دوں گا سمجھیں۔“ سجاد ذرا مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہتا۔ سونیا ناک کو پھلاتے ہوئے بولتی۔

”کیوں آپ کو کیا مسئلہ ہے؟ آپ اپنی نوکری کرنا اور میں اپنی جاب کروں گی، اس طرح ہم دونوں مل کر امی کا سہارا بنیں گے، امی دن رات اتنی محنت کر کے ہمیں پڑھاتی ہیں، تو پھر کیوں ہم امی کی محنت رائیگاں جانے دیں۔“ سونیا سمجھانے والے انداز میں کہتی تو وہ سر کو نیچے کرتے ہوئے ”بس باس“ کہہ کر چپ ہو جاتا۔ سمرت بیگم کب سے کھڑی سونیا کو روتے دیکھ رہی تھیں۔ سونیا رونے میں اتنی مکن تھی کہ ماں کے آنے کا بھی احساس نہ ہوا۔ سمرت بیگم دل پر پتھر رکھ کر آگے

بڑھیں۔

”بیٹی! کیا ہوا تم رورہی ہو کیا سجاد کی یاد آ رہی ہے۔“ سمرت بیگم بیٹی کا دکھ جانتے ہوئے بھی اس سے پوچھ رہی تھیں۔

”ہاں امی! میں بھائی کو ایک پل نہیں بھول پائی ہوں، ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے آس پاس ہیں اور مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔“

”بیٹی! کیا کریں ہمارے مقدر ہی ایسے ہیں، میں کتنی خوش تھی کہ میرا بیٹا ڈاکٹر بن گیا ہے، لیکن اس منحوس شہر نے اسے بھی نگل لیا۔“ سمرت بیگم سونیا کے ساتھ خود بھی رونے لگیں۔

”امی! ہم اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں چلے جاتے ہیں۔“ سونیا ماں کو نئے مشورے سے نوازا رہی تھی۔

”نہیں سونیا! ہمیں اس شہر کے حالات کو سدھارنا ہوگا، ہمیں مل کر ان حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا، ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ اگر ہم ڈر کر یہاں بھاگ جائیں گے تو ہماری طرح اس شہر میں کوئی نہیں رہے گا، یہاں کتنی ہی ماؤں کے بچے قتل ہو رہے ہیں، دھماکوں کی نظر ہو رہے ہیں اور شاید ہوتے رہیں گے، مگر ہمیں ان حالات سے لڑ کر بے گناہوں کی جان بچانی ہوگی، غربت کی وجہ سے پستول اٹھانے والے کو خود کو بم سے اڑانے والے کو روکنا ہوگا۔“ سمرت بیگم کسی قیمت پر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہ تھیں۔

”بیٹی! تو ایسا کر اپنی چھوڑی ہوئی پڑھائی کو دوبارہ سے شروع کر دے، صبح کان جا کر ایڈمیشن لے آتا۔“ سمرت بیگم سونیا کو سمجھا رہی تھیں، سونیا سمجھ چکی تھی کہ اب میں ہی ان کا سب کچھ ہوں، پھر اچانک جو سوال اس کے دماغ میں اٹھا وہ اس نے بتا دیا، وہ سوال یہ تھا کہ۔

”میری مائیں کیسے ادا ہوگی؟“ سمرت بیگم پہلے

سوچ میں پڑ گئیں، پھر بعد میں بولیں۔

”میں نے سوچا ہے کہ میں پھر سے سلائی کڑھائی شروع کر دوں۔“ اس سے حاصل ہونے والے پیسوں سے تیری قمیض ادا ہو جائے گی اور گھر کا سرکل بھی تھوڑا بہت چل جائے گا۔ تمہیں بینک منیجر بننے کا شوق ہے، وہ میں ضرور پورا کروں گی، خدا ہمارے ساتھ ہے صبح کالج جا کر ایڈمیشن لے آنا۔“

”اچھا ای! میں بھی آپ کا ساتھ دوں گی۔“

سو نیا خوش ہوئی ہوئی بولی۔

”لیکن وہ کس طرح؟“ مسرت بیگم حیرانگی سے پوچھ رہی تھیں۔

”وہ اس طرح.....!“ سونیا نے لاڈ سے ہاتھیں

ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں بچوں کو شام کے وقت ٹیوشن پڑھایا

کروں گی، اور آپ سے سلائی کڑھائی سیکھ کر آپ

کا ہاتھ بٹایا کروں گی۔“ سونیا نے سارا ملان ماں کو

بتایا مسرت بیگم کو آنے والا کل ماضی کی نسبت

خوشگوار نظر آنے لگا۔

☆.....☆

زندگی کی رفتار آہستہ آہستہ پھر شروع ہو گئی

سونیا صبح کالج جاتی اور شام میں بچوں کو ٹیوشن

پڑھاتی، مسرت بیگم محلے والوں کے کپڑے سلائی

گرتیں۔ مسرت بیگم کے ہاتھوں کے سلے ہوئے

کپڑے پورے محلے میں مشہور تھے، اسی وجہ سے

محلے کی کئی لڑکیاں ان سے سلائی کڑھائی سیکھنے بھی

آتیں، ایک دن کوئی گاڑی مسرت بیگم کے

دروازے کے آگے آ کر رکی، مسرت بیگم سبزی بنا

رہی تھیں انہوں نے اتنی توجہ نہ دی، کیونکہ انہیں پتا

تھا کہ رشتے داروں نے تو مجھے غریبی میں دیکھ کر منہ

موڑ لیا ہے۔ دل میں سوچا اور پھر سبزی بناتیں رہیں

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مسرت بیگم نے

دو پٹہ درست کیا اور دروازے کا رخ کیا اور پوچھا۔

”جی کون؟“ ایک اجنبی آواز نے اپنا تعارف

کروایا۔

”میں افضل ہوں۔“ مسرت بیگم نے سمجھا شاید

کوئی سجاد کا دوست ہوگا۔ اس لیے دروازے کو

کھولا، لیکن وہاں پر موجود شخص کا چہرہ جانا بچپانا سا

تھا، سب سے پہلے اس شخص نے ادب سے سلام کیا

جس کے جواب میں مسرت بیگم نے سر سے اثبات

کا اشارہ کیا، علیک سلیک کے بعد وہ شخص خود ہی

مسرت بیگم سے مخاطب ہوا۔

”آپ مجھے اندازے کا نہیں کہیں گی؟“

”اوہ معاف کیجئے گا، میں آپ کو نہیں جانتی۔“

مسرت بیگم نے کچھ کھوجتی نگاہوں سے کہا تو وہ شخص

مسکرایا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ مسرت

بیگم اس کے پیچھے پیچھے چل دیں اور اسے بٹھانے

کے لئے ایک چارپائی کو سیدھا کیا، یہ سوچتے ہوئے

ضرور یہ آدمی سجاد کا جاننے والا ہوگا جو بغیر

اجازت لیے اندر آ گیا ہے۔ اس شخص نے گفتگو کا

آغاز کیا۔

”میں افضل ہوں جس فیکٹری میں آپ کا

شوہر کام کرتا تھا میں اس فیکٹری کا مالک ہوں،

سلطان کی موت ہماری وجہ سے ہوئی تھی۔“ مسرت

بیگم کو حیرانگی ہو رہی تھی کہ آج برسوں سے بند پڑی

کتاب کھلنے لگی تھی، وہ تو حیرانگی کے عالم میں اس

آدمی کی باتیں سن رہی تھیں۔

”دراصل وہ لوگ جنہوں نے سلطان کو قتل کیا

تھا وہ لوگ پکڑے گئے ہیں وہ لوگ 2 سال سے

جیل میں سزا بھگت رہے ہیں، وہ لوگ کوئی اور نہیں

بلکہ میرے اپنے لوگ ہیں، انہوں نے اعتراف کیا

ہے کہ انہوں نے حسد میں آ کر ایسا کام کیا تھا،

میری داستان بہت بڑی ہے لیکن میں آپ کو صرف

اتنا ہی بتا سکتا ہوں، سمجھ نہیں آ رہی کہ کہاں سے

شروع کروں؟ میرا باپ بہت امیر آدمی تھا، جگہ جگہ

براس کے ہوٹل، انڈسٹریز چلتی تھیں اور آج بھی

چل رہی ہیں، آپ یوں سمجھ لیں کہ آدھا کراچی

ان کا تھا، ہم سات بھائی ہیں، میرے پانچ بھائی

سعودیہ میں رہتے ہیں اور سب کے سب شادی شدہ

ہیں، یہاں یعنی پاکستان میں دور رہتے ہیں جن میں،

میں خود اور ایک مجھ سے چھوٹا ہے، میرا نمبر چھٹا ہے،

میرے والد صاحب کا ایک کزن جو میرے والد کا

برزنس پارٹنر تھا، اس نے ہمیں دھوکا دیا، ایک دفعہ

میرے والد برزنس کے سلسلے میں دھوکے ہوئے

تھے، وہ جاتے ہوئے سارا برزنس انکل عزیز کو دے

گئے تھے، ان کی غیر موجودگی میں انکل نے تمام

برزنس کو سنبھالنا تھا، میرے والد کو تقریباً ایک مہینہ

وہاں پر لگ گیا تھا، میں اور میرے دو بھائیوں نے

انکل کو ملنے والے پیسے دیکھا۔ انہوں نے پایا کو

فون پر بھی بتایا، لیکن پایا نے ایک نہ سنی پایا نے ہمیں

ڈانٹنا شروع کر دیا، کہ ہم کو غلط فہمی ہوئی ہے، انکل

عزیز ایسے نہیں۔ پھر ایک دن پایا کی واپسی ہوئی پایا

نے واپسی کا ہمیں بتایا ہوا تھا اور تاکید کی تھی کہ انکل

عزیز کو نہ بتانا، میں خود آ کر اس سے پتہ لوں گا،

پھر جب پایا اپنے آفس کی طرف آ رہے تھے

راستے میں گودام میں اجنبی آواز سن کر رک گئے

، پایا نے گودام کا دروازہ کھولا تو انکل عزیز کے ساتھ

دو افراد اور بھی تھے۔ پایا انکل کی تمام باتیں سن چکے

تھے ان دو افراد کے ہاتھوں میں ملے مال دیکھ کر پایا کا

پارہ ہانی ہو گیا، انکل عزیز کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا

تھا، پایا پر ان دو افراد نے حملہ کر دیا، اور پایا کو نیچے گرا

دیا، اس سے پہلے کہ وہ پایا کا کام تمام کر دیتے، میں

اور سلطان وہاں سے گزر رہے تھے، ہمیں سیکرٹیری

نے بتایا کہ باس آ چکے ہیں، میں اور سلطان پایا سے

ملنے آ رہے تھے، ہم نے ان دونوں افراد کو پکڑ کر

پولیس کو دے دیا لیکن انکل عزیز کو پایا نے پولیس

کے حوالے نہیں کیا۔ انکل عزیز کو پایا نے کھری

کھری سنا لیں اور انہیں اپنے برزنس سے الگ کر دیا

۔ اس کے بعد انکل عزیز نے پایا کے برابر کا کاروبار

شروع کر لیا۔ لیکن قسمت نے پھر انکل کا ساتھ نہ دیا

، ان کی فیکٹری کو آگ لگ گئی اور پھر وہ پہلے والے

حالات پر آ گئے، ہمیں پھر انکل عزیز کا پیسہ چلا

کہ وہ کہاں ہیں؟ کس حال میں ہیں؟ پھر ہمیں پایا

نے اعلیٰ تعلیم دلائی اور سب کو بیرون ممالک بھیج دیا

اور پھر پاکستان میں ہماری شادیاں کروادیں اور ہم

سب اپنی اپنی فیملی کے ساتھ سعودیہ سیٹل ہو گئے،

تمام برزنس کو پایا نے اکیلے ہی سنبھالا ہوا تھا، ہم

سب اپنی اپنی فیملیوں کے ساتھ خوش تھے، پایا کا

دل ہمارے بغیر نہیں لگتا تھا ہمارے ساتھ فون پر

گفتگوں بات کرتے رہتے اور ہمیں واپس آنے کا

بھی نہیں کہہ سکتے تھے وہ جانتے تھے کہ ہم اپنا برزنس

چھوڑ کے نہیں آ سکتے تھے پھر جب ہمیں سلطان نے

بتایا کہ پایا کو پہلا ایک ہوا ہے، تو مجھ سے نہ رہا گیا،

میں اپنی فیملی سمیت پاکستان آ گیا اور یہاں پر

کاروبار شروع کر دیا، پایا نے بڑے بھائی جو مجھ

سے بڑا ہے اسے بھی پاکستان بلا لیا، اور میرے

ہوتے ہوئے سلطان کو قتل کیا گیا تھا میں بہت غمزدہ

ہوا تھا، سلطان کے قتل سے پہلے ہی میرے والد اس

دنیا سے رخصت ہو گئے اور مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ تم

سلطان کے گھر والوں سے ضرور ملنا اور ان کی ہر

طرح سے مدد کرنا، آج میں اپنے باپ کا وعدہ پورا

کرنے آیا ہوں، میں محذرت خواہ ہوں کہ میں

نے آنے میں دیر کر دی، لیکن میں پھر بھی کوشش

کروں گا کہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ میں

سلطان کا گھر نہیں جانتا تھا اور نہ ہی آپ سے میری

ملاقات ہوئی تھی پھر ایک دن مجھے سلطان کا آئی

ڈی کارڈ ملا۔ کارڈ پر آپ کا پتہ تھا، بس اسی کو فون کر

کے یہاں پہنچا ہوں۔“ مسرت بیگم چائے اور بسکٹ

لے آئی تھیں، اتنے میں سونیا کالج سے واپس آئی

اور جب کمرے میں انجینی شخص کو دیکھا تو ادب سے جا کر اسے سلام کیا، افضل صاحب سمجھ چکے تھے کہ یہی ان کی بیٹی ہے، اس لیے حال دریافت کرنا مناسب سمجھا۔

”بیٹی! کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟“
”انگل! میں! آئی کام پارٹ ون میں ہوں۔“
اتنا کہہ کر سونیا کمرے سے باہر چلی گئی، مسرت بیگم سے افضل نے پھر گفتگو شروع کی اور پوچھا۔
”آپ کی صرف ایک بیٹی ہے، میں نے تو سنا تھا ایک بیٹا بھی ہے؟“ بیٹے کے پوچھنے پر مسرت بیگم کی متنازع ہوئی اور اسے آنسو افضل صاحب سے چھپا نہ سکیں۔ مسرت بیگم، افضل صاحب کو بتانے لگیں لیکن زبان جیسے ہلنے کے لیے تیار نہ تھی، پھر آخر کار بتانا شروع کیا۔

”بھائی! اور اصل اب بیٹی ہی میرا سب کچھ ہے، بیٹا فائرنگ کی زد میں آ کے فوت ہو گیا تھا۔“
مسرت بیگم آگے کچھ نہ بول پائیں۔ افضل صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے اور پھر بولے۔
”آپ حوصلہ رکھیں یہ اولاد اللہ کی امانت ہوتی ہے اور جس کی امانت ہوتی ہے وہ واپس لینے کا بھی حق رکھتا ہے، آپ فکر نہ کریں آپ کے گھر کا خرچہ آج سے میرے ذمے ہے۔“ افضل صاحب مسرت بیگم کو بتا رہے تھے۔

”نہیں آپ ہمارے غریب خانے میں تشریف لائے اس سے بڑھ کر ہمارے لیے اور کوئی خوشی ہو سکتی ہے، آپ رہنے دیں۔“ مسرت بیگم انہیں منع کر رہی تھیں۔

”آپ ایسا نہ کریں میرا دل نہ توڑیں میں اپنے والد سے کیا ہو وعدہ پورا کر رہا ہوں۔“ وہ چلے گئے۔

”امی یہ کون تھے؟“ سونیا جو ان کی باتیں خاموشی سے باہر کھڑی سن رہی تھی، اب ماں سے

پوچھ رہی تھی پھر مسرت بیگم نے سارا واقعہ سونیا کو سنا دیا، سونیا تو خوشی سے تپنے لگی کیوں کہ وہ اپنا ہی نہیں اپنے گھر والوں کا خواب پورا کرنے جا رہی تھی، پھر وہی زندگی کی روٹیں شروع ہو گئی، صبح کالج، شام کوچوں کو پڑھانا ماں کے ساتھ گھر کے کام کروانا، سارا دن اسی مصروفیت میں گزر جاتا اور رات کو جب تک ماں نہ سوئی تب تک ماں کے ساتھ جا گنا۔ مسرت بیگم رات کو لوگوں کے کپڑے سلائی کیا کرتی تھیں، ایک دن مسرت بیگم سونیا کو کالج چھوڑنے جا رہی تھیں کہ راستے میں لکڑا دایے لڑکے سے ہو جو درخت کے پیچھے چھپ کر بم والی جیکٹ پہن رہا تھا، مسرت بیگم کو پہلے اس لڑکے پر بہت غصہ آیا، لیکن پھر اچانک وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں کہ شاید وہ یہ سب مجبوری کے تحت کر رہا ہے، پھر وہ سوچنے لگیں۔

”اگر اس نے یہاں دھماکہ کیا تو کئی بے قصور لوگ مارے جائیں گے۔“ پھر ان کے سامنے سجاد کی تصویر ٹھوم گئی۔ جو بے قصوروں میں شامل تھا، جلدی سے انہوں نے اپنی رفتار کو تیز کیا اور قدم بڑھاتے ہوئے اس درخت کے قریب پہنچ گئیں وہ لڑکا مسرت بیگم کو دیکھ کر سہم گیا اور کہنے لگا۔

”اگر آپ نے پولیس کو اطلاع دی تو میں خود کو بم سے اڑا لوں گا۔“ مسرت بیگم نے نرمی سے کہا۔
”بیٹا! ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے، تم یہ کام کیوں کر رہے ہو؟“

”میں آپ کو کیوں بتاؤں؟ آپ جیسے لوگ مجھے یہ سب کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔“ وہ لڑکا ڈٹ کر بولا۔ مسرت بیگم نے پھر سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”اگر تم مجھے نہیں بتاؤ گے تو تمہاری جان تو جانی ہی ہے، ساتھ بے قصور لوگ جنہوں نے تمہیں کچھ نہیں کہا وہ بھی زبردستی مارے جائیں گے، تم مجھے

اپنا مسئلہ بتاؤ گے تو شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں جنہیں اپنی ماں کی قسم بیٹا بتاؤ میں تمہاری ماں جیسی ہوں۔“ مسرت بیگم آج اس سے بچ اگلاونا چاہتی تھیں اس پر وہ لڑکا رو دیا۔

”آپ نے مجھے اس کی قسم دی ہے، جس کے لئے میں یہ کام کرنے جا رہا تھا، میری ماں دو دن سے فٹ پاتھ پہ بیمار پڑی ہے، ہم لوگ بہت غریب ہیں بھیک مانگ کر گزارا کرتے ہیں، لیکن جب میں نے پانی پانی اٹھی کر کے ماں کا علاج شروع کر دیا تو اس کے علاج کے لئے مجھے 15 ہزار روکارہتے، میں کچھ کام تو کر نہیں سکتا، خدا نے مجھے ایک بازو سے محروم کر دیا ہے، میں نے کسی ہوٹل میں کام کی تلاش شروع کی، آخر کار میں ایک ہوٹل میں ملازم لگ گیا، وہاں کے لوگ مجھے میری معذوری کا طعنہ دیتے ایک دن اسی طرح مجھے میرے مالک نے کہا کہ یہ جگہ اور پانی کے گلاس اٹھا کے اس کمرے میں پہنچا دے، میں نے ایک ہاتھ سے جگہ تو اٹھا لیا، لیکن دوسرے ہاتھ سے گلاس کس طرح اٹھاتا، جن مہمانوں کو کھانا دینا تھا، وہ ذرا جلدی میں تھے مالک نے میری بہت بے عزتی کی، میں وہاں سے ناراض ہو کر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور دل میں ارادہ کیا تھا، کہ کسی بس کے نیچے آ جاؤں یہ دنیا مجھ پر تنگ ہوئی جا رہی ہے، میں یہ ارادہ دل میں لیے ہوئے سڑک پر لیٹ گیا، اس وقت جب وہاں سے ایک ٹرک گزر رہا تھا، ٹرک والے نے ٹرک روکا اور مجھے سڑک سے اٹھایا اور لیٹنے کی وجہ پوچھی، تو میں رو دیا، ٹرک والے نے کہا میرے ساتھ چل میں اس کے ساتھ چل دیا، وہ مجھے دھمکے دوں کے پاس لے گیا، انہوں نے مجھے یہ کام کرنے کے لیے کہا، میں مان تو گیا لیکن میں ہرگز اسے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا، مجھے ان کروڑوں لوگوں سے زیادہ اپنی ماں کی جان عزیز

ہے، ان لوگوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس کام کے بدلے میں وہ مجھے دو لاکھ دیں گے، بلکہ مجھے نہیں میری ماں تک ضرور پہنچا دیں گے۔“ مسرت بیگم افسوس کر رہی تھیں کہ اس وقت ان کے پاس صرف 13 ہزار روپے تھے، جو کل انہوں نے لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے اور سونیا کی ٹیوشن فیس لے کر جمع کیے تھے۔

”بیٹا! تمہیں 15 ہزار کی ضرورت ہے، اس کے بدلے میں تم میری بات مانو تو یہ 13 ہزار اپنے پاس میری طرف سے رکھ لو اور اپنی ماں کا علاج کروالو۔“ وہ لڑکا اس فرشتہ صفت عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی عمر 50 سال کے لگ بھگ تھی، اس لڑکے نے مسرت بیگم کو اتنی دعائیں دیں کہ جس کا وہ شکر نہیں کر سکتی تھیں۔

”میں آپ کا شکر یہ کس طرح ادا کروں، الفاظ میرے بس میں نہیں ہیں اللہ آپ کو خوش رکھے تا عمر آپ غموں سے دور رہیں۔“ اس لڑکے میں آج مسرت بیگم کو اپنا سجاد نظر آ رہا تھا۔ لڑکے نے جیکٹ کو اتار کر ان لوگوں کو دینے کا فیصلہ کیا اور مسرت بیگم اپنے گھر کی طرف چل دیں، آج وہ خوش تو تھیں لیکن کچھ پانے کے لیے کچھ کھانا پڑتا ہے مکان کا کرایہ بھی ادا کرنا تھا اور بجلی کا بل بھی آچکا تھا، یہ ماہ ان کے لیے بہت مشکل سے گزر رہا تھا، کیوں کہ ساری جمع پونجی وہ اس لڑکے کو دے چکی تھیں، اب صرف خدا سے ہی مدد کی امید تھی، سونیا کی اس مدد پر دنگ تھی کہ ایک روپیہ گھر میں نہیں ہے اب یہ ماہ کیسے گزرے گا، اسے تو بس اسی بات کی ٹینشن تھی ہوئی تھی، لیکن مسرت بیگم خدا کی رحمت سے مایوس نہیں تھیں، پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا افضل صاحب کا ملازم مسرت بیگم کو 30 ہزار روپے دے گیا، جس سے سارے ماہ کا خرچہ آسانی سے اٹھایا جاسکتا تھا۔ مسرت بیگم اگرچہ پڑی لکھی نہیں

تھیں لیکن ان کی تربیت ایسی ہوئی تھی کہ جیسے ان کا تعلق پڑھے لکھے خاندان سے ہو، انہیں پڑھنے کا بہت شوق تھا اکلوتی ہونے کے باوجود وہ اپنا یہ شوق پورا نہ کر سکیں، وہ سوچتی تھیں کہ تعلیم ہر ایک کا حق ہے اسے حاصل کرنا چاہیے اور آج وہ اسی شوق کو پورا کر رہی تھیں وہ آج ٹائم سے فارغ ہو کر کاپی چل لے بیٹھیں کچھ لکھ رہی تھیں، سونیا کے آنے پر مسرت بیگم سونیا کے لیے کھانا لگا کر ہمسائیوں کی طرف گئی ہوئی تھیں، شام کو بچے ٹیوشن آگئے اور سونیا نے بچوں کو پڑھا کر گھروں کو بھیج دیا، لیکن مسرت بیگم ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھیں، سونیا پریشان ہو رہی تھی۔ سونیا کو کچھ یاد آنے پر چادر سے نقاب کیا اور ہمسائیوں کے گھر جانے لگی، اچانک دروازے پر ہونے والی دستک سے وہ چونک گئی اور دروازہ کھولا، مسرت بیگم ہاتھ میں شاپر اٹھائے کھڑی تھیں۔

”امی! آپ تو ہمسائیوں تک گئی تھیں، اگر بازار جانا تھا تو مجھے کفرم کر دیتیں میں جب سے اتنی پریشان ہوں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔“

”بیٹی! میں گئی تو ہمسائیوں کے گھر تھی لیکن وہ مجھے زبردستی بازار لے گئیں، ان کے بیٹے کی شادی ہے وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ! آتم ہمارے ساتھ چلو اور ہماری شادی پر تم ضرور آنا، بس زبردستی انہوں نے مجھے یہ سوٹ لے کر دے دیا، میں تو بہت منع کر رہی تھی لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی، اچھا یہ سوٹ دیکھ کیسا ہے؟“ مسرت بیگم سونیا کو سوٹ دکھا رہی تھیں، جولا نٹ پنک کلر پر مشتمل تھا اور اوپر دھاگے سے ہلکی ہلکی کڑھائی کی ہوئی تھی۔

”اچھا ہے آپ پر خوب بچے گا۔“ سونیا پر جوش ہو کر کہہ رہی تھی۔

”امی! آپ سے ایک بات پوچھوں یہ کاپی پتہ نہیں کس کی ہے؟ میں نے بچوں سے پوچھا تھا کہ تم

میں سے تو کوئی کل بھول تو نہیں گیا تھا، لیکن سب نے کہا ہماری نہیں ہے یہ کاپی مجھے چار پائی سے ملی ہے، اور ساری ABC سے بھری ہوئی ہے، آپ اسے پھینکنا نہیں پتہ نہیں کس کی ہوگی۔“ سونیا ماں کو بتا رہی تھی اور مسرت بیگم برآمدے میں کھڑی ہنس رہی تھیں، سونیا نے آج کتنے سالوں کے بعد اپنی ماں کو ہنسنے ہوئے دیکھا تھا۔

”امی! میں کیا لطیفہ سن رہی ہوں، آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟“ سونیا تھوڑی سی خفا دکھائی دی، مسرت بیگم نے سونیا سے کہا۔

”یہ کاپی کسی بچے کی نہیں بلکہ میری ہے۔“ مسرت بیگم یہ کہہ کر پھر ہنسنے لگیں۔

”امی! یہ ABC آپ نے نکھی ہے؟“

”I am shoked“ سونیا ماں سے کہہ رہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ سونیا کے لئے یہ کسی معجزے سے کم نہ تھا اور وہ اسے معجزہ ہی تصور کر رہی تھی کیونکہ مسرت کون سا پڑھی لکھی تھیں۔

”ہاں! تم حیران کیوں ہو رہی ہو؟ لاؤ میں تمہیں دوبارہ لکھ کے دکھا دیتی ہوں۔“

”امی! میں حیران اس بات سے ہو رہی ہوں کہ آپ نے یہ لکھائی کہاں سیکھی؟“ سونیا ماں سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں! تم اس بات کو ضرور پوچھو گی میں نے سوچا تھا۔“ مسرت بیگم سونیا کو بتانے لگیں۔

”پرسوں جب ایک بچے کو ABC نہیں آ رہی تھی تم اسے لکھنا سکھا رہی تھیں میں بہت غور سے تمہیں اسے سکھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی، میرے خیال میں وہ بچہ رشندہ کا ہے جو ہمارے محلہ میں نئی آئی ہے وہ ابھی اسکول نہیں جاتا، اس بچے کو پتا نہیں ABC آتی یا نہیں لیکن مجھے ضرور آگئی ہے۔“ مسرت بیگم فخر سے کہہ رہی تھیں۔

”امی! آپ پڑھ سکتیں ہیں۔“ سونیا ماں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

”اور تم مجھے پڑھا سکتی ہو۔“ مسرت بیگم کی اس بات پر سونیا بھی ہنس پڑی پھر دونوں نے Dinner کیا اور پھر نیند کی وادیوں میں کھو گئیں۔

☆.....☆.....☆

آج سونیا نے کالج سے چھٹی کی تھی کیوں کہ مسرت بیگم کی طبیعت خراب تھی، وہ رات سے بستر پر پڑی ہوئی تھیں، سونیا نے گھر کا سارا کام ختم کیا اور مسرت بیگم کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے گئی، ڈاکٹر نے میڈیسن دی اور مسرت بیگم کا دھیان رکھنے کی تاکید کی، سونیا نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”جب ان کے سر میں درد شروع ہوتا ہے تو میں جتنا مرضی سردیادوں، پھر انہیں سکون نہیں ملتا، کیا آپ بتانا پسند کریں گے اس کی کیا وجہ ہے؟“

سونیا نے فکر مند انداز میں پوچھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

”یہ ٹینشن بہت لیتی ہیں، جب وہ ان کے دماغ کو چڑھتی ہے تو ان کے دماغ کی شریان پھٹنے تک کا خطرہ ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر یہ کہہ کر اور مریضوں کا معائنہ کرنے لگا اور سونیا سارے راستے سوچتی رہی، آخر وہ کوئی پریشانی ہے جو امی کو لاحق ہوگئی ہے؟ سونیا نے دل میں سوچا اور اس وقت سوچوں کے سمندر میں وہ بہت زیادہ ڈوبی ہوئی تھی کہ سامنے سے آتی ہوئی گاڑی سے ٹکرانے لگی، وہ لڑکا جلدی سے باہر نکلا جو کارڈرائیو کر رہا تھا، مسرت بیگم اور اس لڑکے نے سونیا کو ہسپتال پہنچایا سونیا کے سر پر اور بازو پر چوٹ آئی تھی وہ لڑکا ڈاکٹر کے پاس گھڑا، ڈاکٹر کی Advice سن رہا تھا، پھر وہ واپس آیا اور مسرت بیگم سے سوری کرنے لگا۔

”آئی! آپ مجھے معاف کر دیں، میں بینک سے لیٹ ہو رہا تھا، میری آج بہت ضروری میٹنگ

”ی۔“ وہ لڑکا شرمندہ لہجے میں بولا، مسرت بیگم کو وہ لڑکا بہت پیارا لگا، نہایت سمجھدار، جنر کی پینٹ شرٹ میں لمبوس وہ کسی شہزادے سے کم دکھائی نہیں دے رہا تھا اسی وقت مسرت بیگم نے دل میں دعا کی۔

”کاش میرا دادا اس طرح کا ہو۔“ مسرت بیگم نے دل کی گہرائیوں سے اس لڑکے کو معاف کر دیا۔

سر پہ چوٹ آنے کی وجہ سے سونیا کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ڈیڑھ گھنٹے تک ہوش آ جائے گا۔ مسرت بیگم سونیا کے سر ہانے بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ لڑکا باہر کسی فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کے واپس آنے تک سونیا کو ہوش آ چکا تھا، جب سونیا نے اپنی نیلی نیلی سی آنکھیں کھولیں تو وہ لڑکا ان جھیل سی آنکھوں میں ڈوب گیا، ڈاکٹروں نے کچھ کا سانس لیا اور سونیا کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ سونیا نقاب پہننے کے باوجود اس لڑکے کو گھائل کر رہی تھی، وہ لڑکا مسرت بیگم اور سونیا کو ان کے گھر تک چھوڑ کے جا چکا تھا، سونیا دودن میں ٹھیک ہو گئی تھی، مسرت بیگم کسی کے گھر گئی ہوئی تھیں سونیا گھر میں اکیلی بیٹھی Messee پر اپنی دوستوں سے بات کر رہی تھی کہ جب اس نے اپنی دوستوں کو کار کا واقعہ سنایا تو وہ اسے چھیڑنے لگیں۔ سونیا جب ان سے تنگ آ گئی تو کیاری میں لگے پھولوں کو پانی دینے لگی، دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے بائیں کیاری میں چھوڑا اور دروازہ کھولنے ہی لگی تھی کہ ماں کی نصیحت یاد آ گئی۔

”بیٹی! بغیر پوچھے دروازہ نہ کھولنا، حالات بہت خراب ہیں۔“ اس لئے سونیا نے پوچھنا مناسب سمجھا۔

”جی کون؟“ سونیا نے مدغم آواز سے پوچھا۔

کوئی جواب موصول نہ ہوا تو سونیا نے دوبارہ پوچھا، لیکن پھر جواب نہ ملا، سونیا کو غصہ آ گیا اور دروازہ کھولنے لگی مگر کبھی نہ سونیا کا میل پیپ دینے لگا، سونیا کال سن رہی تھی اس کے بعد دروازہ پر دستک نہ ہوئی، سونیا نے کال بند کی اور پھولوں کو دوبارہ سے پانی دینے لگی، امیرا واپس گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اور اس کا دوست اس پر ناراض ہو رہا تھا۔

”آج پھر تم ویسے ہی بات کئے بغیر لوٹ آئے پتا نہیں کیا ہے گا تمہارا؟“ اس کا دوست اس پر غصہ کر رہا تھا۔ پھر پھر یہ خاموشی کے بعد وہ خود ہی بولا۔

”میں نے دروازہ بجایا تھا اندر سے اس کی آواز آئی، اس نے پوچھا کون؟ میرا حوصلہ نہیں پڑا کچھ بولنے کو اور کچھ دیر وہاں پر کھڑے رہنے کے بعد میں واپس آ گیا۔“ امیرا اپنی تفصیل اقرار کو سنا رہا تھا، اقرار بولا۔

”واہ مجنوں صاحب! آج پھر واپس آ گئے جس دن سے تم نے اس کو دیکھا ہے میرے ناک میں بھی دم کیا ہوا ہے۔“ اقرار اسے ڈانٹنے کا پورا حق رکھتا تھا کیوں کہ وہ دوست کے ساتھ ساتھ اس کے تایا کا بیٹا ہونے کا اعزاز بھی رکھتا تھا۔ امیرا نے مایوسی سے گاڑی اشارت کر دی۔ گھر پہنچنے تک ایک اور ہی ہنگامہ امیرا اور اقرار کا منتظر تھا، امیرا کی بہنیں اور اقرار کی بہنیں امیرا کی منگنی کی نوید سن رہی تھیں، اقرار کو امیرا پہ پہلے ہی بہت غصہ تھا، اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، امیرا تو اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ اقرار البتہ پوری کوشش میں تھا کہ کچھ ہو جائے، امیرا کا دل خود کو ختم کرنے کو چاہ رہا تھا اسے اس وقت کچھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا اس وقت صرف اسے اللہ کی ذات دکھائی دی، اس نے جلدی سے جائے نماز اٹھائی، ظہر کی نماز ادا کی اور رورو کر خدا سے اپنی محبت کی بھیک مانگی، شام کو ان لوگوں نے مل کر

منگنی کے لئے جانا تھا، سب لوگوں نے اصرار کیا کہ امیرا بھی ساتھ جائے گا، لیکن امیرا کی تو دنیا ہی بکھر چکی تھی، مایوس سا چہرہ لے کر ساتھ چل دیا، اقرار اسے راستے میں چھیڑ رہا تھا، اقرار کی چار بہنیں جو سب شادی شدہ تھیں، اقرار کا رشتہ امیرا کی بہن سے ملے تھا۔ صرف امیرا ہی کے لئے لڑکی ڈھونڈنا مشکل ہو رہا تھا، لیکن یہ مشکل اقرار کے پاپا افضل نے آسان کر دی تھی۔ امیرا سارے راستے خاموش اور اقرار، امیرا کو حوصلہ دے رہا تھا۔ لیکن جب اقرار نے کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا تو خوشی سے بولا۔

”امیرا تم تو اچھی طرح پھنس گئے۔“ امیرا جو پہلے ہی غصے میں بیٹھا تھا، جل کر بولا۔

”کیا مطلب؟ تم مجھے اور پریشان کرو، کوئی بات نہیں تمہاری باری آئے گی تب بتاؤں گا۔“ اقرار اور امیرا دونوں گاڑی کی کچھلی سائیڈ پر بیٹھے تھے، دونوں کی جوڑی خاندان بھر میں مشہور تھی، منگنی کے لئے امیرا کی ماما اور اس کے پاپا اور دو بہنیں آئی تھیں، جن میں اقرار کی منگیتر بھی تھی، اقرار تو پرسکون تھا کیونکہ اس کا پیار اس کے پاس موجود تھا۔

”اچھا یار! تو برا مان گیا ذرا ان راستوں کو دیکھو، ہم صبح یہیں تو آئے تھے۔“ اقرار کے کہنے پر امیرا نے باہر دیکھا، واقعی صبح وہ اس لڑکی کے گھر ان ہی راستوں سے ہوتے ہوئے گیا تھا۔ امیرا نے حیران ہو کر کہا۔

”تو کیا ہوا وہ تو نہیں ہو گی۔“ اقرار نے سمجھانے والے انداز میں کہا ”یار! تو خدا پر بھروسہ رکھ وہی ہو گی۔“ اقرار نے پر جوش ہو کر کہا۔

”چل اے، میں نہیں مانتا۔“ امیرا نے دسم لہجے میں کہا۔

”اچھا تو میرے ساتھ شرط رکھ لے۔“ اقرار

نے امیرا سے کہا۔

”چل ٹھیک ہے مگر شرط۔“ دونوں نے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا، ایسے جیسے کوئی وعدہ کر رہے ہوں، امیرا کی ماما آبیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو امیرا اور اقرار ڈھیٹ بن گئے۔ گاڑی ان کے گھر کے آگے رک گئی۔ امیرا اور اقرار اتر کر ایک سائیڈ پر ہو گئے سب گھر والے ان کے گھر چلے گئے۔ اقرار نے فخریہ انداز میں کہا۔

”دیکھ لے میں یہ شرط جیت گیا، وہی لڑکی نکلی۔“

”تو ذرا آسمان سے نیچے زمین پر آ جا، اگر اس کی کسی بہن سے میری منگنی ہو گی تو پھر کیا بنے گا؟“ وہ دونوں اسی موضوع پر ڈسکس کر رہے تھے کہ امیرا کی بہن ان کو بلانے کے لئے آ گئی۔

”چلو جناب! مرغا حلال ہونے لگا ہے۔“ اقرار نے امیرا کو چھیڑا۔ امیرا سے رہا نہ گیا اور اپنی بہن سے پوچھا۔

”جس گھر ہم لوگ جا رہے ہیں وہ لوگ کیا کرتے ہیں، کتنے ہیں؟“ امیرا کی بہن نے ان سوالوں کے جوابات مختصر دیئے اور کہا۔

”بھائی! وہ صرف ایک ہی بہن ہے اس کا ایک بھائی تھا، وہ فوت ہو گیا اور پاپا حیات نہیں ہیں وہ ابھی پڑھ رہی ہے اور کون سی کلاس میں پڑھتی ہے یہ آپ خود پوچھ لیجئے گا۔“ پھر امیرا اور سونیا کی منگنی بہت شان و شوکت سے کی گئی اور مسرت بیگم نے ان لوگوں کو بتایا۔

”یہ لڑکا تو ہمارا محسن ہے۔“ گھر والے اس کا قصہ سن کر اپنے بیٹے کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ پھر وہ لوگ گھر آ گئے وہ لوگ کچھ پریشان سے تھے، افضل صاحب نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

”مسرت بیگم نے تین سال بعد شادی کا کہا

ہے، لڑکی ہمیں بہت پسند ہے دونوں کی جوڑی چاند اور سورج کی ہے لیکن وقت بہت زیادہ ہے ہم سب سے اتفاق نہیں ہو گا۔“ امیرا کے پاپا افضل صاحب کو بتا رہے تھے، افضل صاحب نے نکل دی۔

”اس لڑکی نے اپنے ماں باپ کا خواب پورا کرنا ہے وہ بیگم بیگم بننا چاہتی ہے، لہذا انتظار کیا جائے۔“ امیرا تو تایا کی عدالت میں کھڑا تایا کی باتیں سن رہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ تایا اب اسے تین سال کی قید کی سزا سنارہے ہیں، لیکن اقرار، امیرا کو سمجھا رہا تھا۔

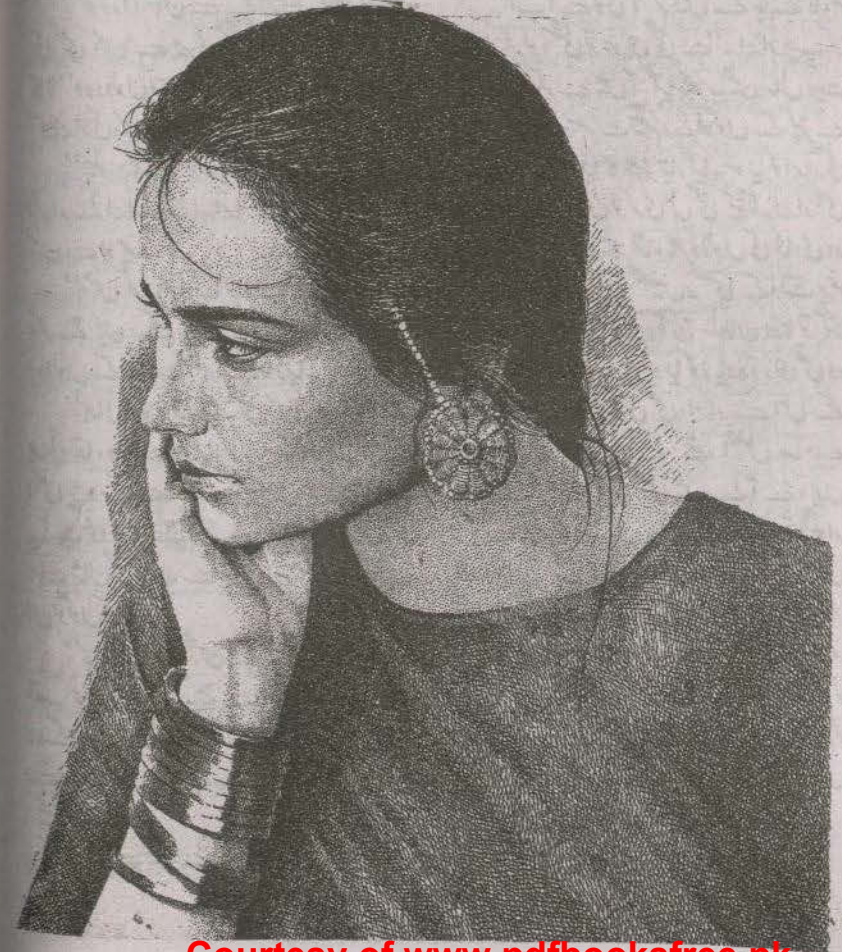
”اب اسے کوئی آ کر نہیں لے جائے گا، تم انتظار کر لو، منگنی تو ہو ہی گئی ہے۔“ امیرا چپ کر کے اپنے کمرے میں آ گیا پھر یہ تین سال بیت گئے پتا نہ چلا، مسرت بیگم نے لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے سونیا کا جینز تیار کیا۔ سونیا کو امیرا کی وجہ سے بیگم میں نوکری مل گئی کیونکہ امیرا بھی بیگم میں بیگم کا منبج تھا، پھر دونوں کی شادی ہو گئی۔ مسرت بیگم کی آنکھیں رخصتی کے وقت پر نم تھیں وہ سوچ رہی تھیں، آج سلطان ہوتا تو کتنا خوش ہوتا، سجاد کی یاد سونیا کو زیادہ آ رہی تھی وہ خود بہت زیادہ رو رہی تھی، امیرا سے اس کے آنسو دیکھے نہیں جا رہے تھے، افضل صاحب مسرت بیگم کو بھی اپنی فیملی میں لے آئے، یوں مسرت بیگم کا مستقبل ماضی سے بہت خوشگوار تھا، انہوں نے اپنی ساری زندگی غریبی میں گزاری تھی، لیکن آج ان کی اپنی گاڑیاں تھیں۔

”جی کہتے ہیں، وقت ہر کوئی کو بھر دیتا ہے مسرت بیگم کو کبھی کسی نے غیر محسوس ہونے نہیں دیا، مسرت بیگم کو اپنوں کی طرف سے غم ہی تو ملے تھے، اب مسرت بیگم کو کوئی پریشانی نہ تھی، وہ بیٹی کی طرف سے مطمئن تھیں اور سونیا بھی اپنی ماں کی قربانیوں کی قدر کرتی تھی۔

☆.....☆.....☆

قہر میں لگ کر

جاب پر وہ سیٹ ہو گئی تھی، امی اور اودو نوں کو ہی مطمئن کر دیا تھا، مگر اس نے یہ بات گھر میں کسی کو بھی نہیں بتائی تھی۔



”کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟“ جاوید احمد کو اس کی جاب کرنا اچھا نہیں لگا تھا اس لیے کہ وہ شادی شدہ اور کسی کی امانت تھی۔

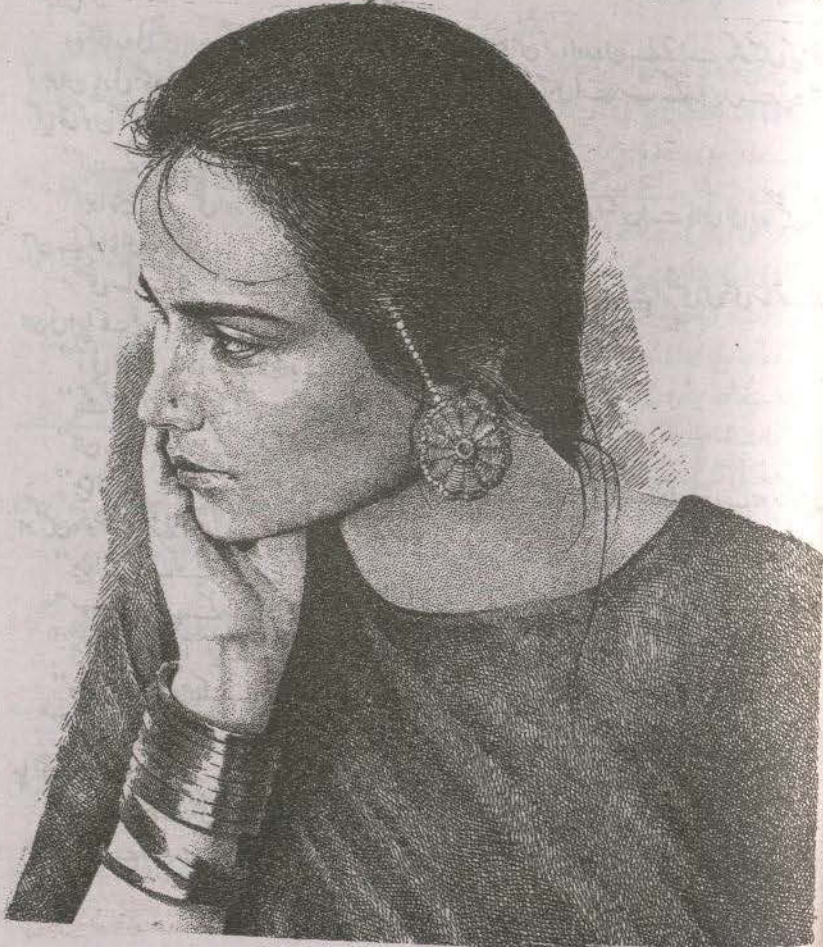
”ابو پریشانی کیسی جاب میں پہلے بھی کرتی تھی، آج بھی کروں گی۔“ لہجہ اس کا اندر سے بہت دکھی ہو رہا تھا۔

”مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“

”ابو! آپ کو کیا ہو گیا ہے، میں آپ کی بیٹی اسی طرح آج بھی ہوں، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں پھر آپ کیوں مجھ سے شرمندہ ہیں؟“

”دیکھو! مرتضیٰ صاحب کو تمہاری جاب کا سن کر خوشی نہیں ہوئی تھی، وہ الٹا ناراض ہو رہے تھے۔“

”ان سے بول لیے ان کا نواسہ سارے رشتے توڑ کے چلا گیا، اب وہ کس رشتے کی بنا پر ایسی بات کر رہے ہیں۔“ رمنا اور ایمن دسترخوان لگا رہی تھیں، اس کے آنے کے بعد ہی سب کھانا ساتھ ہی کھاتے تھے۔



”خدا خواستہ ان کا نواسہ رشتہ ختم کر کے نہیں گیا ہے، جو تم ایسی بات کہہ رہی ہو بیٹا!“ جاوید احمد مغموم سے لہجے میں گویا ہوئے۔

”ابو! پلیز ان فضول باتوں کو ڈسکس نہیں کریں تو بہتر ہے۔“ وہ دسترخوان پر ایمین سے پلیٹیں وغیرہ لے کے لگانے لگی۔

”بیٹا! تم گھر چلی جاؤ، مرتضیٰ صاحب بہت منتیں کر کے گئے تھے، آج انھیں آئے ہوئے بھی دس دن ہو گئے ہیں۔“

”ابو! آپ واپس جانے کی بات کر رہے ہیں ان کے گھر کی خواتین کے چہروں اور لہجوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا، وہ لوگ بھی اس شادی سے قطعی خوش نہیں۔“ خوشنما کو ہیشم کی بڑی مای کا طنز یہ لب و لہجہ بھولتا ہی نہیں تھا۔

”اباجی کی پتہ نہیں کیا عادت ہو گئی ہے ہر ایک پر ترس کھانے لگتے ہیں، لے کے ہیشم کی زندگی ہی خراب کر دی۔“

وہ کتنا روٹی تھی ان کے ایسے کیلیے اور حقارت بھرے الفاظ سن کر، اوروں نے تو اسے کچھ نہیں کہا تھا، نوجوان پارٹی بھی نارمل تھی، اس نے صرف ایک رات گزاری تھی، صبح ہی اسے سب کے رویوں سے پتہ چل گیا تھا کون کتنا خوش ہے۔

”ان کے گھر کے لوگوں کی پرواہ نہیں کرو مرتضیٰ صاحب کا خیال کرو۔“

”ابو! پلیز۔“ وہ خشکی اور افسردگی سے کہتی ہوئی اندر چلی گئی، امی رہنا اور ایمین اسے بلاتی ہی رہ گئیں، مگر اس نے کھانا ہی نہیں کھایا۔

مرتضیٰ صاحب پھر چلے آئے اس دفعہ اکیلے نہیں آئے تھے، ان کے بڑے بیٹے ارغشی علی بھی ساتھ تھے، ان کی اچانک غیر متوقع آمد پر وہ سب ہی گھبرا گئے، خوشنما اندر بیٹھی ہوئی تھی۔

”آئی! آج بھی جاؤ وہ آپ کو بلارہے ہیں۔“

”مجھے نہیں آنا تو نہیں آنا۔“ وہ قطعیت بھرے لہجے میں اسے ڈپٹ کے بولی۔

”ان سے بولو آرام سے بیٹھے، کیا فائدہ مجھے لے جانے کا؟“

”بیٹا! اندر آ سکتا ہوں۔“ مرتضیٰ علی چوکھٹ پر کھڑے اجازت لے رہے تھے، دونوں مؤدب ہو کر کھڑی ہو گئیں، خوشنما تو گڑبڑا ہی گئی۔

”بیٹا! میں آپ کو لینے آیا ہوں۔“

”سوری میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔“ اس نے جھٹ درشت لہجے میں جواب دیا۔

”بیٹا! ہیشم واپس آ گیا ہے۔“

”واپس...؟“ وہ چونک کے رہ گئی اتنی جلدی وہ کیسے واپس چلا گیا، وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔

”سوری میں پھر آپ سے کہتی ہوں، جس گھر میں میری عزت نہیں میں وہاں کا رخ بھی نہیں کرنا چاہتی۔“

”بیٹا! آپ ہماری بیٹی ہو، ہماری عزت ہو، ہم خوشی سے رخصت کروا کے لے کے گئے ہیں۔“

”خوشی سے رخصت کروا کے صرف آپ لے کے گئے، باقی آپ کے نواسے اور کسی بھی فرد کی کوئی خوشی

نہیں تھی۔“ خوشنما بہت صاف گو تھی۔

مرتضیٰ علی شرمندہ ہو گئے، وہ اپنی بڑی بہو کی ترش روی کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے، وہی سب سے زیادہ ناک بھوں بھی چڑھا رہی تھیں۔

”خوشنما بیٹی! ایک بار ٹھنڈے دماغ سے سوچو، شادی بیاہ کوئی کھیل نہیں ہے۔“ وہ افسردہ اور مایوس چہرے کے ساتھ اس کے سامنے آ گئے۔

”یہی میں آپ سے کہنے والی ہوں، شادی بیاہ کوئی کھیل نہیں ہے، پلیز مجھے مجبور نہیں کریں کہ میں انتہائی قدم اٹھاؤں اور آپ کے نواسے کے پاس چھتاوے کے سوا کچھ نہ ہو، میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔“ وہ بہت ضدی ہوئی تھی، پشت پھیر کے کھڑی ہو گئی تھی، مرتضیٰ علی لب کھلتے ہوئے اس کے روم سے نکل گئے، خوشنما کو انھیں ایسے جواب دیتے ہوئے دکھ بھی ہو رہا تھا، مگر وہ اپنی اور بے عزتی اس گھر میں نہیں کروانا چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس دن وہ اچانک ہی آ گیا تھا، نزہت تو اسے دیکھتے ہی چپکے لگی تھیں، ہیشم جیسا لائق فائق اور لاکھوں کی جائیداد کا مالک، وہ نہیں چاہتی تھیں کوئی بھی باہر کی لڑکی آ کر ہیشم کے باپ کی جائیداد پر عیش کرے، خوشنما کے جانے سے وہ سب سے زیادہ خوش تھیں۔

”اے بیٹا! کمزور کتنے ہو گئے ہو، کچھ خیر خبر تک نہیں دی تم نے۔“ صبح وہ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، مرتضیٰ علی اس سے سخت ناراض تھے اور وہ ان سے بھی زیادہ سخت ناراض تھا۔

”مامی! یہی کافی ہے میں آ گیا ہوں، کمزور کا کہنا فضول ہے۔“ شاہدہ مامی نے اس کے لیے ناشتہ لگایا تھا، باقی کے لوگ تو صبح ہی ناشتہ کر کے اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے تھے۔

”وہ تمہاری بیوی... وہ تو صبح ہی چلی گئی تھی، ارے اس کے تئیر تو ایسے تھے جیسے مخلوق سے آئی ہے۔“

نزہت اپنے طور پر شروع ہو گئی تھیں۔

”رات نانا جان اسے لینے گئے تھے۔“ وہ سمجھ گیا تھا جب وہ ارغشی علی کو ساتھ چلنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

”وہ آئی نہیں ہے، اگر کر تیشی ہے، تم منانے آؤ۔“ وہ نگاہیں ادھر ادھر کر کے بولنے لگیں۔

”واٹ... میں منانے آؤں؟ مانی فٹ... میں اگر واپس آیا ہوں تو اس لیے کہ میں کیوں گھر سے اس کی وجہ سے جاؤں، جائے گی تو وہ جسے میں پسند تک نہیں کرتا۔“ ہیشم کے لہجے میں ناکواریت تھی۔

”میں تو کہتی ہوں بیٹا! فارغ کرو اور اپنی مرضی سے شادی کر لو۔“

”بڑی مامی! میں کروں گا بھی ایسے ہی۔“ وہ بھی ان کی بات سن کے مشتعل ہی ہو گیا تھا، اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اس لڑکی کو منا کے لائے جسے اس کا نانا بیاہ کے لائے تھے۔

”ہیشم! ناشتے سے فارغ ہو کر میرے روم میں آنا۔“ جانے کب وہاں مرتضیٰ علی آ گئے تھے، انھوں نے اپنی بہو کی باتیں سن لی تھیں۔

نزہت تو بوکھلائی گئیں، فوراً ڈائنگ ٹیبل کی چیئر کھسکا کر اٹھ گئیں، شاہدہ انھیں اشارے سے بتا بھی رہی تھیں، مگر وہ تو دائیں بائیں دیکھے بغیر مصروف تھیں، ہیشم لب بھنج کر رہ گیا۔

”اے بیٹا! میرا نام تو بالکل نہیں لینا، میرے پیچھے پہلے ہی پڑے رہتے ہیں، تمہاری بیوی میری وجہ سے

گئی ہے۔“ نزہت جاتے جاتے بھی چنگاری دینے سے باز نہیں آئی تھیں۔

”بڑی مای! آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، میں تو وہی کروں گا، جو میں چاہوں گا۔“ اس نے ان کے شانے پر ہنسی دے کر تسلی دی۔ وائٹ میٹشل شلوار میں ملبوس سو برس ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

”تم نے جتنی حماقتیں کرنی تھیں کر لی ہیں، اور مزید تم کرو، یہ میں چاہتا نہیں ہوں۔“ انھوں نے کڑے تیوروں سے گھورنے کے بعد سخت لہجے میں کہا۔

”نانا جان! میں اگر واپس آیا ہوں تو اس لیے کہ میں اپنے لوگوں کو اس کی وجہ سے کیوں چھوڑوں، چھوڑے تو وہ چھوڑ کے جائے۔“

”زیادہ فضول گوئی کی ضرورت نہیں ہے، میں نے نزہت کی ساری باتیں سن لی ہیں، وہ ایک نمبر کی حاسد عورت ہے، عقل سے پیدل، اس کے کہنے پر چل کر اپنے گھر کو بر باد کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔“ انھوں نے ساتھ ہی تنبیہ بھی کی۔

”سیدھی شرافت سے جا کر خوشی کو لے آؤ۔“

”خوشی! یہ کون ہے، اور کس کی خوشی؟“ وہ کچھ سمجھا نہیں یا جان کے انجان بن رہا تھا۔

”مجھے زیادہ باتیں کرنے کی عادت نہیں ہے، یہ تم بھی جانتے ہو، خوشی تمہاری بیوی ہے۔“ انھوں نے جتاہ۔

”اونہہ... بیوی! وہ ہنکار کر رہ گیا۔

”اونہہ... کرنے کی ضرورت نہیں ہے، سیدھی طرح انسانوں کی طرح جا کر اسے لے آؤ۔“

”نانا جان! اسے آپ اپنی پسند سے لائے ہیں اور خود ہی لائے، مجھے اسے لانے کی ایسی کوئی خوشی نہیں ہے۔“ وہ بھی ان کا نواسہ تھا، ترکی بہ ترکی بولا۔

”ہیشم! تم کیا سمجھ رہے ہو، میں تم سے اتنے دن بے خبر تھا یہ تمہاری خام خیالی ہے، تم اشعر کے گھر تھے مجھے سب پتہ تھا۔“

”مجھے بھی پتہ ہے اشعر ہے ہی آپ کا چچو۔“ وہ ان کے سنجیدہ چہرے کو دیکھنے لگا۔

”نانا جان! آپ مجھ سے ضد نہیں کریں، مجھے یہ لڑکی قطعی پسند نہیں ہے، اگر میں شادی کروں گا تو اپنی پسند کی، ایسی بیک ورڈ لڑکی میرے ساتھ نہیں چل سکتی۔“ وہ ملکوں ملکوں گھومتا تھا، ایک سے ایک لڑکی سے اس کی دوستی بھی تھی، اس لیے اس کی نظر کہیں ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔

”دوسری کرو یا تیسری میری بلا سے، مگر اسے تمہیں واپس لانا ہے، الٹا سیدھا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تم میری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہو۔“ انھوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا، نزہت جو اس کی برین واشنگ میں لگی ہوئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”بیارے پیارے بھائیوں کے بڑے بھیا، آج بنیں گے کسی کے سیال، ہے اے ہے...“ مزمل گیت سے ہی کو دتا بھانڈا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

”ہیں، ہیں یہ نہیں کیا ہوا؟“ سب کے لیے ناشتہ لگا رہا تھا، سنڈے تھا سب ہی گھر پر تھے۔

”وہ مجھے امی نے منج تیاہا ہے، اپنے بڑے بھیا کی نسبت طے ہونے والی ہے۔“ وہ بہت خوش تھا۔ ضمیر ان

رواڈ انجسٹ [94] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [95] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [96] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [97] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [98] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [99] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [100] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [101] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [102] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [103] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [104] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [105] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [106] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [107] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [108] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [109] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [110] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [111] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [112] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [113] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [114] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [115] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [116] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [117] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [118] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [119] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [120] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [121] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [122] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [123] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [124] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [125] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [126] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [127] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [128] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [129] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [130] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [131] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [132] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [133] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [134] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [135] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [136] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [137] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [138] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [139] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [140] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [141] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [142] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [143] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [144] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [145] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [146] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [147] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [148] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [149] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [150] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [151] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [152] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [153] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [154] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [155] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [156] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [157] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [158] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [159] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [160] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [161] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [162] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [163] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [164] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [165] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [166] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [167] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [168] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [169] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [170] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [171] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [172] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [173] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [174] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [175] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [176] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [177] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [178] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [179] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [180] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [181] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [182] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [183] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [184] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [185] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [186] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [187] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [188] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [189] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [190] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [191] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [192] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [193] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [194] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [195] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [196] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [197] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [198] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [199] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [200] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [201] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [202] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [203] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [204] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [205] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [206] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [207] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [208] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [209] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [210] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [211] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [212] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [213] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [214] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [215] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [216] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [217] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [218] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [219] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [220] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [221] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [222] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [223] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [224] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [225] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [226] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [227] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [228] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [229] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [230] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [231] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [232] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [233] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [234] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [235] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [236] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [237] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [238] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [239] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [240] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [241] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [242] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [243] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [244] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [245] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [246] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [247] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [248] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [249] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [250] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [251] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [252] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [253] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [254] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [255] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [256] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [257] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [258] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [259] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [260] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [261] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [262] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [263] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [264] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [265] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [266] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [267] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [268] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [269] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [270] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [271] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [272] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [273] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [274] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [275] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [276] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [277] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [278] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [279] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [280] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [281] اپریل 2014ء

راڈ انجسٹ [282] اپریل

”یاد ہے دادی جان نے کیسے کہا تھا، گھر کی لڑکی ہے گھر ہی میں رہے گی، زیادہ خرچہ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ فضول رسومات میں پیسہ بالکل برباد نہیں کرنا۔“ مزمل کو اپنی دادی کی باتیں یاد آ گئیں۔
”ویسے بھی یہ لوگوں نے ٹریڈ خوب نکالا ہے کتنی کرنے کا، فضول رسم کوئی نہیں کریں گے ویسے ساری ہوں گی۔“

”چلو چھوڑو، کیا لوگوں کی باتیں لے کے بیٹھ گئے۔“ رضوانہ نے جھٹ موضوع ہی بدل دیا۔
”تم لوگ ناشتہ کرو، میں چائے کی کیتلی لے آؤں، چائے بن گئی ہوگی۔“ چاروں ہی ناشتہ کرنے لگے تھے، سنڈے کو گھر میں صبح سب ہی ساتھ ناشتہ کرتے تھے، آدم شام میں میڈیکل اسٹور کھولتا تھا مگر اس نے ایک ملازم لڑکا رکھا ہوا تھا، دیکھ بھال کے لیے۔

”امی! جلدی سے تیاریاں شروع کر دیں، سچ میں ہمارے گھر میں ابھی تک کبھی کوئی بھی خوشی کا فنکشن نہیں ہوا۔“ مزمل زیادہ ہی ایکسائینڈ ہو رہا تھا۔

”انشاء اللہ تعالیٰ! وہ سب بھی ہوں گی۔“ وہ مسکرا رہی تھیں۔ ضمیر ان کے لب مسکرا رہے تھے، حجاب کی دلکش من موئی صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی، ڈری ڈری سی سائیں لیتی وہ بالکل گڑبائی لگتی تھی۔

”لو جی بڑے بھیا تو پہنچ گئے خیالوں میں، بھائی جان! ویسے یہ بتا دیں ابھی ہنی مون پر ہیں یا اس کے بھی بعد کا سوچ رہے ہیں؟“ مزمل نے معنی خیزی سے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”سدا سدا... ورنہ ایک الٹا ہاتھ پڑے گا، زیادہ ہی بکواس آگئی ہے۔“ وہ جھینپ گیا۔

وہ سب ہی ہنسنے لگے تھے، ضمیر ان اپنی چائے کا کپ اٹھا کر اندر چلا گیا، کیونکہ اسے پتہ تھا بھائی اسے چھیڑ چھیڑ کر ناک میں دم کر دیں گے۔

آدم کو یہ دھڑکا تھا، اس کی پچھو یا دادی جان ہی نہ چلی آئیں، ان کا سنڈے اسی طرح غارت ہو جاتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”رات شہر یار سے انٹرنیٹ پر باتیں ہوتی ہیں، اگلے مہینے آ رہا ہے، کیونکہ یہ بیٹا تو حجاب کی شادی ہونے نہیں دے گی۔“ حسین بیگم اچھی طرح جانتی تھیں۔

حجاب ابھی تک یہیں رہ رہی تھی، حسین بیگم نے اسے جانے ہی نہیں دیا تھا ابھی خاندان میں کسی کو بھی نہیں پتہ تھا حجاب کا رشتہ طے کر دیا گیا۔

”اماں! یہ شہر یار تو شادی آرام سے کروادے گا۔“ اکرام نے بھی تائید کی، بیٹا ان سے جو کہہ چکی تھیں اتنی جلدی بھی کیا ہے۔

حجاب چاہ رہی تھی کسی طرح ضمیر ان سے بات کرے مگر کیسے وہ زبردستی کے رشتوں کی قائل ہی نہیں تھی اس نے بھی ضمیر ان کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا۔

حسین بیگم اور اکرام نے اسے یہیں رکھا ہوا تھا، ساری شادی کی رسمیں ادھر ہی سے ہونا تھیں ارومہ کو تو بہت خوشی ہوئی اور یہ فکر بھی دور ہوئی کہ حجاب کی شادی ہو رہی ہے ورنہ بیٹا تو اس کی ہونے ہی نہیں دیتیں کچھ دفعہ کار شہ بھی بیٹا کی وجہ سے ہاتھوں سے گیا تھا۔

”کیا بات ہے حجاب؟“ نازیہ نے اسے یوں سوچوں میں گم دیکھا۔

”جی کچھ نہیں۔“ وہ پاؤں سمیٹ کے بیٹھ گئی اس دن کے واقعے کے بعد سے وہ اور ہی حجب ہوئی تھی۔
”اگر کسی کتاب وغیرہ کا پڑھنے کا موڈ ہے تو شہر یار کے کمرے سے لے آؤ، تمہیں تو وہ کچھ ہی نہیں کرتا ہے کچھ بھی لینے سے۔“ نازیہ کو حجاب پر ترس بھی آ رہا تھا، جو کچھ نہیں بول رہی تھی۔

”مامی! شادی کیا بہت ضروری ہے جبکہ میرا تو کوئی قصور بھی نہیں ہے۔“
”یہ سب ہم جانتے ہیں شادی تو تمہاری ویسے بھی کرنی تھی، ابھی ہو جائے گی تو اچھا ہے سب لوگ بہت اچھے ہیں، بہت خوش رہو گی، ضمیر ان کو سب ہی جانتے ہیں، شہر یار کا دوست ہے۔“ انھوں نے حجاب کو ریلیکس کیا۔

”شہر یار ماموں کو ایک دفعہ آنے تو دیں ان سے بات کر کے ہی پھر یہ سب کیا جاتا۔“
”شہر یار کی بھی یہی مرضی ہے، تمہاری شادی ضمیر ان سے ہی ہو۔“ حجاب لب لچل کے رہ گئی کوئی بھی اس کے دل کی کوئی بات سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔

”تم اٹنی سیدھی سوچوں میں نہیں پڑو، مغرب کے بعد رضوانہ آئیں گی تمہارے کپڑوں اور جوتے کا ناپ لینے، وہ پہلے مگنی کریں گی پھر ہی آگے کی رسمیں کریں گی۔“ نازیہ نے اس کے گلابی رخسار تھپتھپائے ارومہ بھی آگئی تھی بلیک ٹراڈز پر پنک شرت میں بیس وہ مسکرا رہی تھی۔

”مجھے پتہ تھا تم منہ بنا کے بیٹھی ہوگی۔“ وہ بیٹھ رہی اس کے قریب پڑھ کے بیٹھ گئی۔
”اپنی بکواس کرنے آ گئیں۔“ حجاب نے اسے گھورا۔

”وہ تو مجھے آتا تھا آج رضوانہ آئی آئیں گی میں تو اپنی بہن کی شادی کی ہر تقریب میں آگے آگے رہوں گی۔“ وہ بہت خوش تھی۔

”حباب! شہر یار ماموں کہہ رہے تھے میں تم لوگوں کے لیے وہاں سے کافی چیزیں لا رہا ہوں، حجاب سے کہنا جو کچھ چاہیے بتا دینا۔“

”مجھے کیا چاہیے امی سے کہیں؟“
”امی نے تو یہی چوڑی میک اپ کی لسٹ بتادی تھی، شہر یار ماموں نے ڈانٹ دیا۔“ وہ بتانے لگی، نازیہ دونوں کو باتیں کرتی ہوئی چھوڑ کے چلی گئیں۔

”شکر ادا کرو تمہاری اچھی جگہ شادی ہو رہی ہے۔“ ارومہ نے اس کی روئی صورت دیکھ کر پھر کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ پنک کاٹن کے ایمر ایڈری والے سوٹ میں سمیل سی سر پر آ فیل جمائے اس کے سامنے کھڑی تھی، بیشم بھی کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا، مگر اشعر اسے دیکھ کر زیادہ خوش ہوتا تھا۔

”مس خوشنما! آپ کی کارکردگی بہت اچھی جا رہی ہے ویلڈن!“ اشعر نے اسے خلوص دل سے سراہا تھا۔

”تھینکس سر!“ اس نے مسکرا کے اتنا ہی کہا۔
”آپ دوسرا آفس جوائن کرنا چاہیں گی؟“ اشعر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”دوسرا آفس؟“ وہ کچھ بھی نہیں۔
بیشم نے اسی وقت سراہا، اسے اپنے آفس کے لیے ایک عدد پرسنل سیکریٹری کی ضرورت تھی اور اسے

خوشنما مناسب لگی تھی، کیونکہ وہ بہت ذمے دار اور سمجھدار تھی، مگر ایک خرابی تھی صاف گو اور منہ پھٹ بہت تھی، اس نے یہ بھی گوارا کیا تھا۔
 ”مطلب یہ کہ پشیم کو اپنے آفس کے لیے ذمے دار ایمپلائی کی ضرورت ہے۔“ اشعر اس سے بات کرتے ہوئے بہت جھکتا تھا کیونکہ وہ ذرا لحاظ جو نہیں کرتی تھی اور اسے توقع تھی وہ ضرور کوئی ایسا ہی جواب دے گی، وہ دونوں ہی گڑبڑا جائیں گے۔
 ”انہیں میں ہی کیوں اپنے آفس کے لیے چاہیے ہوں؟ ان کے آفس میں کوئی اور ایمپلائی نہیں ہے؟“ وہ چونک کر کوئی پشیم ایسے تاثر دے رہا تھا جیسے وہ اس پر توجہ ہی نہیں دے رہا تھا اور خوشنما کو اس کی یہ آکڑی تو ٹکانی تھی۔

”آپ کے دوست تو ایسے گونگے بہرے بنے بیٹھے ہیں جیسے انہیں آواز ہی نہیں آرہی ہو، اگر انہیں ضرورت ہے تو خود کیوں نہیں بولتے؟“ پشیم نے لب لعل لے کر، اشعر جزبہ ہو گیا وہ خاصی سنجیدہ لگ رہی تھی۔
 ”یار اشعر! میں نے کہا بھی تھا تمہیں کم بولنے والی چاہیے۔“
 ”مسٹر پشیم صاحب! آفس میں کم بولنے والی کا گزارہ بھی نہیں اور آفس والے رکھتے بھی نہیں ہیں، یہ آپ بھی بہتر جانتے ہیں۔“ اس نے طنز کے ساتھ جتنا۔
 ”مس خوشنما! ایسا میں چاہ رہا ہوں آپ پشیم کا آفس جوائن کر لیں کیونکہ یہ اپنا آفس اشارٹ کرنا چاہتے ہیں ان کے اسٹاف میں اور بھی لڑکیاں ہیں جب ان کے آفس کا کام چلنے لگے تو آپ واپس یہیں اپنی سیٹ جوائن کر لیجئے گا۔“ اشعر نے ہی دفاع کے لیے وضاحت بھی دی۔
 ”جی اچھا سوچ کے بتاؤں گی۔“

”یار! تم مجھے کیا فضول لوگوں کے چکر میں الجھا رہے ہو کوئی اور ہوا سے بھیج دو۔“ پشیم کو اس کا جواب ہی سہا گیا اسے کوئی انکو کرے یہ تو وہ برداشت ہی نہیں کرتا تھا جبکہ وہ خود لوگوں کو انکو کرنا رہتا تھا۔
 خوشنما اس کا مشتعل ہونا دیکھ رہی تھی، اشعر نے اسے اشارے سے جانے کو کہا جبکہ خوشنما کا تو دل کر رہا تھا، اس کی طبیعت صاف کر دے، اس دن کے سارے بدلے لے لے مگر قدرت اسے خود موقع دے رہی تھی، وہ خود جی ران بھی اس غیر متوقع بات پر پشیم کو اپنے آفس کے لیے ایمپلائی کی ضرورت تھی۔
 ”یار! منہ تو بند کر لیا کرو۔“

”تم نے دیکھا نہیں کیسے کہہ رہی ہے، سوچ کے جواب دوں گی، اس سے بولو اوقات میں رہے۔“ اسے تو پتہ ہی لگ گئے۔

”تم اتنا غصہ کیوں ہو رہے ہو یار لڑکی ہے ذرا آرام سے بات کی جاتی ہے۔“ اشعر اسے سمجھانے لگا۔
 ”لڑکی ہے کیا مطلب میں نے تو ایک رات کی دہن کا خیال نہیں کیا، یہ کیا میرے سامنے حیثیت رکھتی ہے۔“ وہ تو غصے کے مارے اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔
 ”شرم کر عزت کر صنف نازک کی۔“

”ارے صنف نازک کی عزت ساری لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، لڑکوں کے پاس دولت دیکھ کر ان کے پاس آتی ہیں۔“ وہ بہت بدگمان ہو رہا تھا اسے کئی لڑکیوں نے دھوکہ جو دیا تھا اس دن سے سوچ لیا تھا، شادی نہیں کرے گا، مگر ناتانجان کو یہ کہا ہوا تھا اپنی پسند سے شادی کرے گا، تاکہ وہ اسے بار بار شادی کا نہیں بولیں۔

لیکن پھر بھی انہوں نے زبردستی اپنے ایمپلائی کی بیٹی سے اس کی زبردستی شادی کر دی، اس دن سے وہ اور ہی نفرت کرنے لگا تھا۔ ایمپلائی بھی اپنے مطلب کے ہوتے ہیں۔
 ”بس رہنے دے عزت کر، بتاؤں کتنی ایسی ہیں جو عزت کے قابل نہیں ہیں۔“ وہ دانت پیسنے لگا۔
 ”یار! لڑکی تو ایسی نہیں ہوتی ہے۔“

”تجھے بڑی ہمدردی جاگ رہی ہے اس لڑکی سے۔“ اس نے بغور دیکھا۔
 ”بکواس نہیں کیا کرو۔“ اشعر جھپٹ گیا اسے خوشنما اچھی لگی تھی، مگر شادی شدہ کاسن کے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا، مگر پسند پر تو کسی کی پابندی نہیں اس لیے وہ خوشنما کو پسند کرتا تھا۔
 ”سن... مجھے اس لڑکی کو ہی رکھنا ہے۔“ پشیم کو پھر ضد ہی ہو گئی وہ اپنی بات پر اڑ گیا۔
 ”ہوں... کوشش کروں گا، کیونکہ تم جو سلوک کرتے ہو میرا بھی دل نہیں کر رہا اسے تمہارے پاس بھیجوں۔“
 ”یہ کہو تمہارا خود کا دل اس پر آ گیا ہے۔“ پشیم نے سگریٹ سلگایا اور ہونٹوں سے لگا لیا، اشعر نے اسے جواب میں کڑی نظروں سے گھورا تھا۔

☆.....☆.....☆

فراج اسے سی و یو بایک پر لے آیا تھا، جان بوجھ کر سارے راستے جھٹکتے ہی دیتا رہا تھا، واپسی میں سعدیہ کی حالت خراب ہی ہو گئی تھی، حسنی نے اسے بغور جاچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔
 ”تمہیں اگر اکی نے فراج بھائی کے ساتھ دیکھ لیا، فوراً تمہیں پشاور روانہ کریں گی۔“ اس نے سعدیہ کو دیکھا جو اش روم میں گھس گئی تھی فراج اپنے روم میں تھا۔
 ”تم سب ہی ڈل ہو، اگر ذرا سا گھوم پھر آتی ہوں تو ایسا کیا کر دیا؟“ وہ پاؤں دھو کر آ گئی تھی اور فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

”امی! بہت برامنائی ہیں یوں لڑکا لڑکی ایسے گھومیں تو۔“
 ”پتہ نہیں تم لوگ کیا کیا سوتے رہتے ہو۔“ وہ اپنے بالوں کو لپیٹ کے کچر میں قید کرنے لگی تھی۔
 ”اری او... حسنی!“ نسرین کی کڑک آواز پر دونوں ہی اچھل گئی تھیں۔
 ”یہ اتنی جلدی کیسے آگئیں؟“ حسنی جلدی سے باہر آئی نسرین برآمدے میں بڑے تخت پر بیٹھ گئی تھیں۔
 ”مجھے سر درد کی کوئی ٹیبلٹ دے اور پھر کڑک سی جائے بنا کے دے، بہت سر میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ حسین بیگم کی طرف گئی تھیں، وہاں جون کے آئی تھیں انہیں حسنی کی اور ہی فکر ہوئے لگی تھی۔
 حسنی نے فوراً ہی حکم کی تعمیل کی تھی اور خود ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

”جناب کا رشتہ طے کر دیا ہے بھائی نے۔“
 ”جناب کا...؟“ حسنی تو اچھل ہی گئی۔
 ”مجھے ساری تفصیل خود بھائی نے بتائی ہے، شہر یار بھی چھٹی لے کے آ رہا ہے، اس کے دوست سے رشتہ طے ہوا ہے۔“

”چلو یہ تو خوشی کی بات ہے، میں خود جا کر جناب کو مبارکباد دوں گی۔“ حسنی نے کھلے دل سے کہا۔
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی، مجھے تو تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے، جناب تو تم سے کتنی چھوٹی ہے، اس کی شادی ہونے والی ہے۔“

”امی! مجھ سے تین سال چھوٹی ہے کوئی زیادہ چھوٹی نہیں ہے، اور آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ وہ تو برا سامنے بتا کر رہ گئی۔
”زیادہ بک بک نہیں کرو، رفعت نے کچھ زیادہ ہی دماغ خراب کر دیا ہے۔“ وہ چائے کے سب لیے لگیں۔

”آپ ہر بات میں ماما کا نام کیوں لیتی ہیں؟“
”کیونکہ مہارانی بتا کہ تیرا دماغ خراب کر رہی ہے، اسے تو تمہاری فکر ہے نہیں، سگی ماں میں ہوں، مجھے ہو رہی ہے فکر تمہاری۔“ ان کے تودل پر گھونٹے ہی پڑ رہے تھے حجاب کی حسنی سے پہلے شادی جو ہو رہی تھی۔
”لیں یہ آپ نے کیا بات کی؟“
”میں نے ٹھیک بات کی ہے، چل جا کر شام کی ہنڈیا کی فکر کر، میرا سر دکھ رہا ہے، مجھ سے کچھ نہیں ہوگا۔“
وہ سر پکڑ کر خنث پر ہی لیٹ گئی تھیں۔

”پتہ نہیں امی دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش کیوں نہیں ہوتی ہیں۔“ اس نے حیرانگی اور تاسف سے سوچا۔
حجاب کو مبارک باد دینے تو وہ ضرور جانے کی اور اس سے پوچھے گی بھی یہ شادی وغیرہ اتنی جلدی کیوں ہو رہی ہے؟ وہ سائن بنانے میں لگ گئی تھی، سجدہ کو روٹی بنانے کا کہہ دیا تھا، کیونکہ روٹی بنانے کی وہ بہت چور تھی، اسے چڑھی بہت ہوتی تھی، رفعت نے اسے رانی بنا کر رکھا ہوا تھا، اور نسرین نے اسے نوکرانی، وہ بہت خائف ہو گئی تھی نسرین سے۔

☆.....☆.....☆

اس دن تو راشدہ آگئی تھیں، نوشین ان کے ساتھ ہی تھی، گھر میں تیاریاں دیکھ کر وہ دونوں ہی چونک گئی تھیں، پھر بڑے بڑے گولڈن خوبصورت سے ڈبے سائیز ٹیبل پر رکھے تھے۔
”مامی! یہ ڈبے کس کے ہیں؟“ اس نے لپک کے خوش ہو کر گھولا جس میں جھلملاتا ہوا لائٹ پنک سوٹ دیکھا۔

رضوانہ تو گڑبڑا ہی رہی تھیں گھر میں اس وقت منزل اور طحہ تھے، ضمیر ان اپنی جاب پر سے نہیں آیا تھا اور آدم اس وقت میڈیکل اسٹور پر ہوتا تھا۔
”اچھا ہوا راشدہ! تم آگئیں ویسے میں تمہاری طرف آنے والی تھی۔“
”اچھا! اچھا! راشدہ خوش ہو کر غلط فہمی کا شکار ہونے لگی تھیں۔ رضوانہ گھبرا گئیں وہ بات کو کچھ اور ہی نہ سمجھ لیں۔

”مامی! آپ نے ساڑھی بھی نہیں لیا۔“ روشین خواہ خواہ شرماتی تھی۔
”راشدہ! میں نے ضمیر ان کی بات طے کر دی ہے۔“ انھوں نے ہمت کر کے بلا تمہید کے کہہ دیا۔
”کیا...؟“ دونوں ماں بیٹی بیک وقت چیختی تھیں۔

”ہاں وہ ضمیر ان کے دوست کی بھانجی ہے، بہت پیاری بچی ہے۔“
”بھائی! ارشہ کرنے سے پہلے آپ گھر کی لڑکیاں تو دیکھ لیں، آپ سے امی بھی کہہ رہی تھیں۔“ ان کے چہرے کا تو رنگ ہی اڑ گیا تھا، نوشین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اسے یہ امید نہیں تھی، ضمیر ان کی کہیں اور ہو۔
”آج کل بچوں کی بھی مرضی دیکھنی پڑتی ہے۔“ انھوں نے لوازمات کی ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھی۔

”مامی! آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔
”تم کیوں اپنا دل اداس کرتی ہو، ضمیر ان سے بہت اچھا لڑکا دیکھ کر تمہاری شادی کریں گے۔“
”بس... بس بھائی! رہنے دو، تم نے یہاں دکھا دیا بلکہ بدلہ ہی لیا ہے۔“ وہ تو الٹا سیدھا ہی بولنے لگی تھیں۔

”تم غلط نہیں سمجھو راشدہ! دیکھو اولاد کی مرضی بھی دیکھنی پڑتی ہے۔“ وہ انھیں سمجھانے لگیں۔
”بھائی جان نے تم سے واسطہ ختم کر دیا ہے، جب ہی اولاد کے فیصلے تم خود کرنے لگی ہو۔“ وہ تو تملارا ہی تھیں، اسی دور ان ضمیر ان آگیا تھا گھر میں ان کی بحث چھڑی دیکھ کر وہ کوفت میں مبتلا ہو گیا۔
”ضمیر ان! آخر مجھ میں کمی کیا تھی جو تم نے کہیں اور سوچا بھی؟“ نوشین اس کے روم میں چلی آئی تھی، نفاس سے وہ بیڈ پر تکیوں کو ڈیل کر کے لیٹا ہوا تھا۔

”نوشین! کمرے میں آنے سے پہلے ناک تو کر لیا کرو۔“ وہ بے زاری اور ناگواری سے گویا ہوا۔
”ضمیر ان! تم اتنے انجینی نہیں بن سکتے۔“ وہ اس کے پیروں میں ہی آکر بیٹھ گئی۔
”یہ کیا حرکت ہے؟“ وہ اٹھ کر بیٹھا۔
”ضمیر ان! میں نے تم سے محبت کی ہے، تم پلیز میرے ساتھ ایسا تو نہیں کرو۔“
”نوشین! پلیز کیا بچوں والی حرکت ہے؟“ وہ تو غصے میں آ گیا۔
”ضروری ہے میں بھی محبت کروں، میں نے تمہیں کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں۔“ وہ اس کے رونے سے کوفت محسوس کر رہا تھا، تیزی سے روم سے ہی نکل گیا۔

راشدہ رضوانہ کو سنانے میں لگی ہوئی تھیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”واہ بیٹا! واہ... خوب کیا۔“ تم نے میری بیٹی کو انکا کے رکھا۔
”پچھو! غلط بیانی سے بات نہیں کریں، میں نے کوئی آپ کی بیٹی کو انکا کے نہیں رکھا۔“ وہ تو چیخ ہی پڑا۔
”ہر بات کی حد ہوتی ہے، میری ماں نے اپنی مرضی سے میرا رشتہ طے کیا اور مجھے اپنی ماں کی بے عزتی بالکل برداشت نہیں جو آپ لوگ مسلسل کیے جاتے ہیں۔“ وہ اشتعال میں آ گیا۔
نوشین نے رورو کے اپنا حشر کیا ہوا تھا، اور ادھر رضوانہ کم صم خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔
”زبردستی رشتے نہیں کیے جاتے یہ دل کی خوشی سے کیے جاتے ہیں۔“

”ہاں بیٹا! ہاں ہمیں ہی بھاشن دو۔“ وہ طنز کرنے لگیں۔
”پچھو! آپ ہر بات کا غلط مطلب نہیں لیا کریں۔“ اسے اپنے رویے کا احساس ہوا تو لہجہ نرم بنایا۔
”بس رہنے دو۔“ وہ چادر سر پر جما کے جانے ہی لگی تھیں۔
”راشدہ! روکو تو...!“

”بھائی! کس لیے رکو، جب تم نے بات ہی ختم کر دی۔“ وہ بہت غزدہ ہو رہی تھیں۔
”نوشین! میری ایک بات یاد رکھنا، رشتے دل سے کیے جاتے ہیں زبردستی ایک فریق کی مرضی پر نہیں کیے جاتے ہیں۔“ ضمیر ان نے اسے سمجھایا۔
”ادبہ...!“ کر کے وہ چلی گئی تھی، راشدہ بھی بڑبڑاتی ہوئی نکل گئی تھیں۔

”دیکھنا تمہاری دادی کا طوفان“۔
”امی! پلیز آپ ڈرنا چھوڑ دیں“۔ ضمران انھیں ریلیکس کرنے، ان کے پاس بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

”کبخت اس چپل کو بھی ابھی ٹوٹنا تھا“۔ وہ چپل ہاتھ میں لے کر تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی، ٹریفک میں کچھ افراتفری بھی مچنی ہوئی تھی، جانے کہاں آج بم بلاسٹ ہوا تھا جو ناگن کارو ڈبی بند کر دیا تھا، اور اس سے کچی میں بیٹھا نہیں جاتا تھا۔
”میں کچھ مدد کروں؟“، بیشم کی گاڑی اس کے قریب رکی، خوشنما کے قدم رک گئے، وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی، شہر کے حالات کی وجہ سے وہ کچھ ڈر رہی تھی، سامنے اسے دیکھ کر خوشنما کی جان میں جان آئی۔
”کیا مدد کریں گے، یہ جونی ٹوٹ گئی ہے جوڑ دیں گے؟“ وہ پرامتداد اور نڈر لہجے میں گویا ہوئی۔
”واٹ نان سنس“۔ وہ اس کی بے تکی بات پر زچ ہو گیا، بلیک پیٹ پر اسکاٹی بلیو شرٹ میں وہ بہت ڈینٹ لگ رہا تھا۔
”اس شخص میں خولصورتی بھی ہے اسارٹس بھی ہے، مگر لب و لہجہ اور سوچیں کتنی بری ہیں“۔ وہ سوچ کے رہ گئی۔

”ارے جو بات ہے میں نے آپ کو بتادی“۔ وہ پنک سوٹ میں پنک ہی ہو رہی تھی، خولصورتی اس میں بلا کی تھی، وہ سوچنے لگا، اسے یوں تنہا لگتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟
”دیکھیے! شہر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں، کیسے تو میں ڈراپ کر دوں؟“، بیشم کو ہی اسے واضح کرنا پڑا۔
”جی.... جی نہیں بالکل نہیں“۔ خوشنما گڑبگڑ گئی۔ اگر اس نے گھر دیکھ لیا تو وہ سمجھ جائے گا، وہ کون ہے اور اتنی جلدی وہ ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔
”دیکھو! میرے پاس ٹائم نہیں ہے اور جلدی بیٹھو حالات ویسے ہی ٹھیک نہیں ہیں، بہت تمہاری زبان چلتی ہے“۔ وہ لے زاری سے گویا ہوا۔
”آپ کو روکا کس نے ہے جابیے“۔ خوشنما نے اکڑ دکھائی، مگر اسے ڈر بھی ہوا وہ واقعی چھوڑ کے نہیں چلا جائے۔

”تم واقعی بے وقوف ہو، یا پھر تم مجھے جان بوجھ کر غصہ دلارہی ہو؟“، بیشم گاڑی سے نیچے اتر آیا، مرنک پر ٹریفک کا بہت شور تھا، سب کو اپنی اپنی بڑی تھی۔
”بیٹھو اندر، کہاں دھکے کھاؤ گی، الٹے سیدھے راستوں پر چلی گئیں تو گھر والے پریشان ہوں گے“۔
”آپ کو کیوں اتنی فکر ہو رہی ہے؟“ وہ حیران بھی ہوئی، بیشم آخراں کی اتنی فکر کیوں کر رہا ہے؟
”مجھے اس لیے فکر ہو رہی ہے کہ تم میرے دوست کے آفس میں کام کرتی ہو، ڈے داری ہو اس کی، میری تم پر اگر نگاہ نہیں پڑتی تو الگ بات تھی“۔ اس نے خوشنما کو زبردستی فرنٹ سیٹ پر بٹھایا، خوشنما نے پھر زیادہ بحث بھی نہیں کی۔

”جانا کہاں ہے؟“ وہ ڈرائیونگ کے دوران پوچھنے لگا۔

”کے ڈی اے کی چورنگی پر اتار دیجئے گا“۔ اس نے گھر سے دور بتایا۔

”سرجانی ٹاؤن سے آئی ہو؟“، بیشم کچھ چونکا اور ہلکی سی یاد دہرائی ان راستوں پر ایک دفعہ نانا جان کے۔

ساتھ آیا تھا۔
”سرجانی تو آگے ہے میں پہلے رہتی ہوں“۔ اس نے گہری سوچ اس کے چہرے پر دیکھ لی تھی۔

”جواب کیوں کر رہی ہو؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”ظاہر ہے مجبوری ہے، اس لیے کر رہی ہوں، کیوں آپ کو تو پتہ ہے پھر دوبارہ یہ سوال کیوں؟“ خوشنما نے اس دن انٹرویو کے دوران جو کچھ اس نے بیشم کو ہی سنانے کو اشعر کو بتایا تھا وہ یہ بھولا تو نہیں ہوگا۔
”تمہارا شو ہر مہینہ چھوڑ کے کیوں گیا؟“ اس نے پھر ذاتی سوال کیا۔

”اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے، بہت اپنی امارات کا زعم تھا، میں خود ہی چھوڑ کے آ گئی“۔ اس نے طنز میں ہمارا تیرا چھالا۔

”ہوں... خیر!“ وہ چپ ہو گیا، اس کا گھر آ گیا تھا، بیشم نے کچھ دور ہی اتارا تھا، خوشنما نے مڑ کے تک نہیں دیکھا تھا۔

”اف یہ لڑکی... بولتی کتنی ہے“۔ ایک لمبے کے لیے اس نے سوچا۔

خوشنما اپنے نام کی طرح ہی خوشنما تھی، ایک وہ تھی جس سے اس کی شادی ہوئی تھی، جس کا نام خوشی تھا، مگر اس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔

”لڑکیوں کو تو ان کی اوقات پر رکھنا چاہیے، ورنہ ہر امیر لڑکے کو دیکھ کر پاگل ہونے لگتی ہیں“۔ بیشم کا دل بہت برا ہو گیا تھا لڑکیوں کی طرف سے دد لڑکیوں سے محبت کی تھی دونوں ہی اسے لوٹ کے چلی گئی تھیں، انھیں صرف پیسہ چاہیے تھا۔

”اگر یہ لڑکی اس کا آفس جوائن کر لے تو اسٹاف بھی ٹھیک رہے گا ہر ایک کو یہ سیدھا ہی رکھے گی“۔ بیشم اس لیے بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اس کا آفس جوائن کر لے، اسے آفس میں سنجیدہ ماحول پسند تھا سب اپنے کام سے کام رہیں۔

”اگر یہ منع کرے گی آنے سے میں بھی مجبور کر دوں گا“۔ پورے راتے وہ خوشنما کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا، بھی ذہن الجھ کے خوشی کی طرف بھی چلا جاتا تھا دل پتہ نہیں بے کل اور پریشان کیوں ہو جاتا ہے، اس کا نہ گھر میں نہ آفس میں دل لگتا تھا۔

☆.....☆.....☆

ادھر رضوانہ ساری باتیں طے کر کے چلی گئی تھیں، شہر یا بھی ایک دن اچانک ہی آ گیا دو مہینے ایسے گزرے تھے کہ پتہ ہی نہیں چلا تھا، شہر یاری کہاں جا بہت اچھی لگتی تھی، رہنے کو فلیٹ بھی مل گیا تھا سب کچھ اس کی توقع سے بڑھ کے ہی تھا نرسین کو پتہ چلا تو وہ سب سے پہلے ملنے چلی آئی تھیں۔

”انھیں کون خبر دے کے آیا ہے؟“ شہر یا ر حجاب کے پاس ہی بیٹھا تھا۔

”حباب! حسیٰ آئی بھی آئی ہیں“۔ ارومہ نے آکر اطلاع دی۔

”اچھا تو دونوں ماں بیٹی میری ٹوہ میں آئی ہیں، میری وہاں حجاب کیسی ہے؟“ وہ بولا۔

”شہر یا راموں! حسیٰ آئی حجاب سے ملنے آئی ہیں، ان کی شادی کے چرچے پورے خاندان میں جو

ہو گئے ہیں ہر کوئی حیران بھی ہے“۔ اس نے بتایا۔

”ارے آجائیں حسیٰ آئی!“۔ ارومہ نے اسے کمرے سے باہر دیکھا وہ جھجک کے رک گئی، شہر یا رفان کلر

کے قمیض شلوار میں ملیں نکھر نکھر اٹھا تھا، اس کی وجاہت دیکھ کر تو سب ہی چونک جا گئے تھے۔

”حاب! لوگوں کو چین نہیں پڑا، خبریں لینے آ گئے ہیں۔“ اس نے طنز کیا۔
”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، امی نے مجھے بتایا ہی نہیں آپ بھی آ گئے ہیں ورنہ میں کبھی نہیں آتی۔“ حسنی کا سنی کپڑوں میں خاصی دلکش اور پیاری لگ رہی تھی۔

”جسٹ بھی بولنا نہیں آتا، جب ہی تو دن بہ دن وزن میں اضافہ ہو رہا ہے۔“ شہریار نے اس کے مونہے کو استہزامیہ انداز میں دیکھا۔

”آپ کو کیا فکر ہے اپنا کھاتی ہوں۔“ اس کے تو ہنسنے ہی لگ گئے۔

”جب ہی یہ حال ہے جو آج تک کسی نے پوچھا نہیں۔“ شہریار نے زچ کرنے کے ساتھ سلگا دیا۔

”حاب! شکر کرو جو تمہاری شادی جلدی ہو رہی ہے، ورنہ لوگ تو ابھی تک شہزادے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔“ وہ دل کھول کے اسے تیار ہاتھا۔

حسنی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، دوسرا جا رہا تھا، شہریار نے بات ہی ایسی کر دی تھی، حباب شہریار کو منع کیے جا رہی تھی، مگر وہ تو شروع ہو گیا تھا۔

”انسان کو کسی کی اتنی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے۔“

”اچھا یہ تم کہہ رہی ہو، جو یہ نہیں کیا کیا بول دیتی ہے۔“ اس نے پھر طنز کے ساتھ بتایا۔

”میری شادی کی آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں کیوں فکر کرنے لگا، تم دیکھنا ایسے ہی مولیٰ اور بوڑھی ہوتی جاؤ گی، کوئی نہیں کرے گا تم سے شادی۔“ شہریار نے اسے نفسیاتی طور پر ہار چڑھایا۔

حسنی کو عجیب الجھن ہونے لگی، وہ تو بولے جا رہا تھا، اور وہ دفاع میں کچھ نہیں بول رہی تھی۔

”میں رشتہ آپ کا پھر بھی قبول نہیں کروں گی، خود کشی کر لوں گی مگر شہریار احمد! تم سے شادی کبھی نہیں کروں گی۔“ وہ تیز لہجے میں گویا ہوئی۔

”حسنی آئی! آپ شہریار ماموں کی باتوں کو اتنا سیریس نہیں لیا کریں۔“ حباب نے ماحول کی تلخی کو دور کرنے کو کہا۔

”ارے حباب! انھیں میری باتوں کو سیریس لینا چاہیے، کیونکہ کبھی وقت ایک سا نہیں رہتا ہے۔“ لہجے میں تمسخر تھا۔

”آپ کو بہت گھنڈ ہو گیا ہے، اپنی باہر کی حباب کا۔“

”گھنڈ... ارے یہ مجھ پر نہیں ہوتا ہے، البتہ آپ جیسے لوگوں کو ہوتا ہے۔“ وہ حسنی کو دل کھول کے چارہا تھا۔

”لو... شہریار تو یہاں بیٹھا ہے۔“ نسرین ہنسی مسکراتی شہریار کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”السلام علیکم! اس نے جھٹ سلام چھاڑا۔ حسنی کی صورت روئی جیسی ہو رہی تھی۔

”کیسے ہو، حباب تو اچھی ہے، کتنے دن کی چھٹی پر آئے ہو؟“ ان کے لب و لہجے میں شہد ٹپک رہا تھا۔

”آپ نے تو اتنے سارے سوال کر ڈالے۔“ وہ مسکرایا، حسنی اس وقت خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

”حاب کی شادی کر کے جانے گا۔“ حسین بیگم نے ہی خوش ہو کر بتایا۔

”بھابی! شہریار کی بھی بات غیر کہیں لگا دیں۔“ نسرین نے ہی خود سے کہا۔

”ہاں سوچ رہی ہوں۔“ وہ ذرا اترا کے بولیں۔

”حاب بھی اچھی ہے، فلیٹ، گاڑی سب ملا ہوا ہے۔“

”چلو یہ اچھی بات ہے۔“ نسرین کا ذہن تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

حسنی، حباب کے پاس ہی بیٹھی رہی، شہریار باہر چلا گیا تھا، نسرین حسین بیگم سے جانے کن باتوں میں الجھی ہوئی تھیں۔

حاب کا ذہن بھی سوچ رہا تھا حسنی اور شہریار کی بھی شادی کروادے، کیونکہ ان دونوں کی لڑائی اسی طرح ہی ختم ہو سکتی ہے اسے خود سے حسنی سے بھی بات کرنی تھی، مگر اس نے کسی مناسب وقت کے لیے چھوڑ دیا۔

☆.....☆.....☆

وہ صبح دن چڑھے تک نہیں سوتا تھا، مگر آج اسے اتنی تھکن ہو رہی تھی، اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا، پھر رات بھر نیت پر بھی بیٹھا رہا تھا۔

”کب تک سوتا ہے؟“ مرتضیٰ علی نے اس کی گلاس ونڈو کے سارے پردے ہٹا دیے، تیز روشنی سیدھی اس کے بیڈ پر پڑی۔

”کیا ہے نانا جان! سونے بھی نہیں دیتے ہیں۔“ وہ خفگی سے بولا۔

”سگیارہ بج رہے ہیں، ابھی بھی نہیں اٹھتا؟“

”اٹھ کر کیا کروں؟“ وہ چڑ گیا۔

”کیوں اپنے آفس کا بھوت اتر گیا؟“ وہ اس کے بیڈ پر سرے پر ہی بیٹھے۔

”رات بھر اسی پر کام کر رہا تھا، اسٹاف جمع کر لیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ہوں... تو گڈ! پھر خوشی کے بارے میں بھی سوچا؟“ وہ پھر اپنی بات پر آ گئے۔ اس کا پورا کمرہ کھلا ہوا تھا، وسیع و عریض بیڈ، دیز اور جدید طرز پر ڈیکوریت کروایا تھا۔

”نانا جان! میں اسے کبھی نہیں لاؤں گا، اور ہاں ڈائینورس دے رہا ہوں۔“

”فضول حرکت کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، تمہیں مزہت چڑھانی ہے، اس عورت کی باتوں میں نہیں آؤ۔“

”مجھے کوئی نہیں چڑھا رہا، مجھے وہ لڑکی پسند ہی میں ہے۔“ اچھے نکھرے بالوں کے ساتھ وہ بے زار سا کہہ کر بیٹھ گیا تھا۔

”تم نے اس کا گھونگھٹ اٹھا کے دیکھا تھا؟“

”یہ اور آپ لوگوں نے فضول بیک ورڈز نہ نکالی تھی، لمبے گھونگھٹ کی۔“ وہ منہ ہٹا کے بولا۔

”جو چلا آ رہا ہے، وہ تو ہونا تھا اور یہ نہت نے ہی رسم نکالی تھی، اور میں بھی اسے خوب جانتا ہوں، کیوں نکالی تھی تاکہ تم اپنا دل نہیں ہار دو۔“

”واٹ ریش... نانا جان!“ وہ جھینپ گیا۔

مرتضیٰ علی بیڈم سے بہت فریٹ تھے، دونوں کی بالکل دوستوں کی طرح بنتی تھی، مگر یہ شادی کروا کے مرتضیٰ نے اسے خود سے بدظن کر دیا تھا۔

محبت شریک سفر میری



”خوشی بہت خوبصورت اور بالکل نئے دور کی ہے، تم اسے سمجھو، پرکھو، دیکھنا تمہارے معیار پر پوری اترے گی۔“ وہ اسے سمجھانے لگے۔

”نانا جان! لڑکیاں سب ایک سی ہوتی ہیں، اپنے آپ کو کچھ سمجھنے والی اور میں کہتا ہوں شادی اپنی مرضی اور پسند سے کروں گا۔“ وہ پھر انھیں ٹالنے لگا۔

”پیشم! تمہیں میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، کسی کو بھی پسند نہیں کرو گے اور تمہاری پچھلی دو کہانیاں مجھے پتہ ہیں۔“ انھوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پیشم نے بیڈ سے اتر کر کبل اوپر ڈالا، لب بچ کے وہ رہ گیا۔

”تمہیں کوئی شادی نہیں کرنی ہے، یہ تو مجھے پتہ ہے۔“ وہ بھی اس کے نانا تھے، بچپن سے جانتے تھے وہ کیسا ہے، جب ایک چیز دل سے اتر جائے دوبارہ وہ چھوٹا بھی نہیں تھا۔

”پیشم! بٹا اے دو قی نہیں کرو، تمہارے لیے جیسی لڑکی ہونی چاہیے، میں نے اس سے ہی تمہاری شادی کروائی ہے، غریب ہے مگر سب کی عزت کرنا جانتی ہے۔“

”نانا جان! غریب لوگوں کے ہی تو دماغ ہوتے ہیں، کیونکہ کہتے ہیں اگر غریب گھر کی لڑکی بیاہ کے لائیں تو وہی سب سے زیادہ خڑے دکھاتی ہے۔“ اس نے یہ بات اشعر کی امی کی منہ سے سنی تھی، اور ان کے سامنے دہرا دی۔

”تم ایسے کیسے کہہ سکتے ہو؟“ وہ جرح کرنے لگے۔

”اشعر کے بڑے بھائی کی بیوی ان سے کم حیثیت کے لوگوں میں سے ہیں، آپ سنئے! وہ پہلے سال ہی اسز بھائی کو لے کے الگ ہو گئی۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”ساری لڑکیاں ایسی نہیں ہوتی ہیں۔“ وہ پھر بھی اس کی بات ماننے سے انکاری تھے۔

”نانا جان! آپ مجھے اس خوشی کو آزاد کرنے دیں، خواہ نواہ میرے ساتھ بندھی رہے گی۔“

”خبردار! جو تم نے دوبارہ یہ بات کی تو، ہم خاندانی لوگ ہیں، ہمارے گھروں میں عورتوں کی عزت کی جاتی ہے، انھیں در بدر نہیں کیا جاتا ہے۔“ انھیں پیشم کی ضد پر افسوس ہو رہا تھا۔

”تم اسے یہاں لے آئے تم از کم وہ یہاں رہتی تو تمہارا دل خود بخود اس کی طرف مائل ہو جاتا۔“

”میرا دل اتنا پاگل نہیں ہے۔“ وہ یہ کہہ کر واش روم میں گھس گیا۔

مرتضی علی کو دکھ و افسوس ہو رہا تھا، انھیں جاوید احمد کے سامنے بہت شرمندگی ہوتی تھی، وہ تو ان کا خیال کرنے گئے تھے، ان پر اپنی پڑ گئی تھی۔

”پیشم! تم کتنے بند باندھ لو، یاد رکھنا خوشی تمہاری بیوی ہی رہے گی اور تمہیں اسے لے کے آنا ہوگا۔“

”یہ کبھی نہیں ہوگا۔“ اس نے اندر سے ہی ہانک لگائی۔

”اباجی! آپ ادھر ہیں؟“ نزہت انھیں دیکھ کر خفیف سی ہو گئیں۔

”نزہت! تم اپنے کام سے کام رکھا کرو، پیشم کو چڑھانے کی کوشش میں نہیں رہو۔“ وہ انھیں کہہ کر رے نہیں چلے گئے۔ نزہت پر تو پانی پڑ گیا، مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں، سوچ لیا تھا خوشی کو آئے نہیں دیں گی۔

”چار دنوں میں آپ سے اتنی اچھی جان پہچان ہوگئی ہے، معلوم ہوتا ہے ہم برسوں سے ساتھ ہیں، آپ بالکل اپنے والد کی طرح ہیں، وہی محبت کرنے والا دل، وہی دوسروں کی مدد کرتا۔“ چاندنی نے محبت سے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ دل کی دھڑکن بے قرار ہونے لگی، اس کے ہاتھوں کی نرمی اسے ہاتھ پر محسوس کرتے اس کے چہرے پر مسکراہٹ تاج لگی۔

”مجھے بھی کچھ ایسا لگتا ہے، ہم برسوں کے ساتھی ہوں، میں بس اکثر یہ سوچتا ہوں، آپ میرے والد کے ساتھ اکیلے رہتی تھیں، مطلب کس رشتے سے؟ میرا کہنے کا مطلب ہے آپ کے گھر والے... وہ کہاں ہیں وہ کچھ نہیں کہتے؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

”جی میں جانتی تھی آپ یہ سوال ایک روز مجھ سے ضرور کریں گے، آخر آپ نے پوچھ ہی لیا، میں بہت دھمکی لڑی، دون، آپ کے والد اقبال صاحب نے میرا بہت خیال رکھا ہے، مجھے اپنا سمجھا، میری زندگی، میری عزت ان کی قریں دار ہے، میں گاؤں کی رہنے والی ہوں، سیلاب میں میرے تمام گھر والے ڈوب گئے، میرے رشتے کے ایک ماموں مجھے شہر اپنے ساتھ لے آئے، مجھے لگے مجھے سہارا مل گیا پر میں غلطی، یہاں لا کر انھوں نے میرا سودا کر دیا، بڑی مشکل سے میں اپنی جان بچا کر بھاگی اور اقبال صاحب کی گاڑی سے مگر نے مجھے بے ہوش کر دیا، ہوش آیا تو میں اس گھر میں تھی، ذمہ داری اقبال صاحب نے میرا بہت خیال رکھا مجھے تعلیم دلائی، اچھا کھانا، پڑھنا، لکھنا سکھایا، اچھے لوگوں میں بیٹھنا سکھایا، مجھے اپنے بزنس میں ملا کر انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہترین انسان تھے، کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی پر اپنی میں سے ایک بڑا حصہ میرے نام کر دیا، میں جتنا ان کا احسان مانوں کم ہے۔“ چاندنی کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، شاید وہ رورہی تھی۔

”میں نے آپ کو اداس کر دیا، میں معافی چاہتا ہوں۔“ سمان نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں اٹھالیا۔

”چاندنی! میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا، آپ مجھے پسند ہو، میں آپ کو اپنا بنانا چاہتا ہوں، یہ بات اس وقت ہی میرے دل میں آگئی تھی، جب آپ کو پہلی بار دیکھا تھا، میں بس کہنے کی ہمت وقت کے انتظار میں تھا۔“ چاندنی کا چہرہ اب تک اس کے ہاتھوں میں تھا، نگاہیں نظروں سے ہو کر دلوں کا شکار کر رہی تھیں، اس کے جسم پر چمکے کرٹ سا لگ رہا ہو، محبت کی چٹائی اس کے لفظوں میں شامل تھی۔

”آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی سمان!“ سرخ آنکھیں جھکی پلکیں چاندنی اس کے گلے سے لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

”چار مہینے میں بس دو بار ہی سمان آیا، کیسا بدل گیا، جانے کو تیار ہی نہ تھا، اور گیا تو آیا ہی نہیں۔“ اماں جی اس کی یاد میں رورہی تھیں۔

”مہینہ بھر پہلے آیا تو کہہ رہا تھا کوئی لڑکی پسند آگئی ہے، اس کو دل کی بات کہہ کر شادی کر لے گا، بڑے باپ کا بڑا بیٹا بن گیا ہے، پیسے والا ہو گیا ہے، ہم غریب لوگ اس کو کہاں پسند آئیں گے، کہتا ہے اماں جی! اے سی میں سونے کی عادت ہوگئی ہے، اب یہاں آؤں تو سو یا نہیں جاتا۔“ اماں جی اس کی لمبی باتیں کہہ کر رورہی تھیں، مریم اماں جی کو حوصلہ دیتے کام میں مصروف رہی۔

”اماں جی! اداس نہ ہوں، ہم تو ہیں آپ کے پاس اور ہم آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔“ اس نے اماں کو گلے لگا لیا۔

”سمان! آپ یہاں کے لوگوں کو ان کی چالوں کو سمجھتے نہیں، آپ کا روبرو نہیں سنبھال سکتے یہاں، پھر آپ نے ابھی تک کہیں جاب بھی نہیں کی، کام کیسے سنبھالو گے آپ؟“ چاندنی نے کیلے بالوں میں برتن کیا۔

”میں ماننا ہوں چاندنی! کہ میں نے اب تک کام

نہیں کیا، تعلیم ہی مکمل کی ہے، پر میں جاہل نہیں ابجو کیڈ ہوں اور باخوبی کاروبار سنبھال سکتا ہوں، مجھے پسند نہیں تم ہر صبح تیار ہور کے غیر مردوں کے ساتھ مل کر کام کرو، ان کی تقریح کا سامان ہو۔“ سمان کا غصہ تیزی پکڑ رہا تھا۔

”جلد سے جلد مجھ سے نکاح کرو اور گھر سنبھالو، کاروبار کی فکر تم چھوڑ دو۔“ سمان نے چاندنی کا بازو پکڑ کر اسے خود سے نزدیک کر لیا۔

”ہاں سمان! تم ٹھیک کہتے ہو، اب مجھے اپنی تمام پریشانی ختم کر دینی چاہیے۔“ چاندنی نے محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو جیسے اس کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

”کیسی محبت تھی آپ کی جو دولت کی چمک میں غائب ہوئی، آپ نے تو ساری زندگی ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔“ مریم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو رہے تھے، چاندنی جتنی چاندنی میں اسے وہ دن یاد آنے لگے جب سمان نے ایسی ہی ٹھنڈی رات آنی سردی کے دنوں میں اسی محبت پر سمان نے اس کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر کہا تھا۔

”مریم! میں تم کو پسند کرتا ہوں اور تم کو ہی اپنی زندگی کا ہم سفر بناؤں گا۔“

”سمان کے لفظوں میں جو سچائی تھی اس کو کیسے جھوٹ مان لوں، کیسے بھول جاؤں سمان! واپس آ جائیں آپ، اماں جی کو تو تسلی دے دی خود کو کیسے سنبھالوں؟“ اماں جی کو نو جوانی میں ہی طلاق دینے والا اقبال اپنے ماں باپ کی اگلی و گزری اولاد تھا، دولت کی کمی نہ تھی، جو چاہتا جس کو چاہتا حاصل کر لیتا، اس کے لیے والدین نے اپنے ایک جاننے والے کی بیٹی سے اقبال کا نکاح کر دیا، پر بد قسمت سال بھر بعد ہی والدین ایک حادثے میں انتقال کر گئے، اقبال نے اپنی بیوی بیٹا چھوڑ کر تمام کاروبار اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر دوسرے شہر منتقل کر لیا، اماں جی کبھی کسی مکان میں تو

کبھی کہیں، بے سہارا ہو گئیں، مریم کے والد اور ان کی بیوی حنا بیگم نے اماں جی کو اپنی بہن بنا کر اپنے مکان کے اوپر بے دو کمروں میں رکھ لیا، اس وقت ان کی ایک ہی اولاد اسد بیٹا تھا، دو سالوں بعد مریم پیدا ہوئی، اماں جی اکثر ان دونوں کا بہت شکریہ ادا کرتیں پر دونوں میاں بیوی یہ کہہ کر انھیں خاموش کر دیتے کہ وہ انھیں اپنی بہن مانتے ہیں، اور سمان کو اپنا بیٹا۔

☆.....☆.....☆

”شاہ! اب یہ تمہارا کام ہے اس کیسے انسان سے ان کاغذات پر سائن کرواؤ، پیار کے کھیل میں بھی وہ ہاتھ نہیں آیا مجھے ہی گھر بٹھانے کے خواب دیکھ رہا ہے، میں نے اقبال سے شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ میں تمام جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھوں، میں نے اس جائیداد کے لیے اس اقبال سے شادی کی اور اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا، مجھے کیا خبر تھی کہ مرتے وقت اس کو اپنی چھوڑی ہوئی اولاد بھی یاد آ جائے گی، اگر مجھے پہلے اس کے بیٹے کی خبر ہوتی تو کب کی جان لے لیتی اس کی بھی۔“

چاندنی کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

روزے، رمضان کہتے کہتے عید بھی چلی گئی، امی نے تمام کام مکمل کر لیے تھے سردیوں کی آمد پر نئے لحاف بناؤں گی، مریم گرم گرم چائے کی ٹرے لیے چلی آئی، شام کی چائے پر سب ہی موجود تھے۔

”سچ کہوں بہن! میں نے تو مریم کو ہی اپنی بہو کے روپ میں دیکھا تھا، پر سمان نے سارے خواب چٹکنا چور کر دیے، وہ تو ماں کو بھی بھول گیا۔“ اماں جی اداسی سے بولیں۔

”آگے گا بہن! سمان واپس آئے گا۔“ ابو نے چائے کے کپ کو لبوں سے لگا لیا۔

”ہاں بھائی! دولت کا نشہ اتر جائے گا تو آ ہی جائے گا، یہ پیسہ وفادار نہیں ہے، تو دوسروں کو کیسے وفادار رکھے گا؟“

”ماں جی! آپ اکثر اس طرح کی باتیں کر کے خود

Hankies®

... absorbent
..... elegant
..... & luxury



Customer Service
H&P
Health & Hygiene Products

hankieshnp@yahoo.com, freedomhnp@yahoo.com

AKS DIGITAL

”چاندنی میڈم! یہ ہماری حقیقت جان گیا ہے، اس کو زندہ چھوڑنا خطرناک ہوگا۔“ شاہ کی بات پر سنان بے بس سا بولا۔
”نہیں میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا، تم لوگوں کی ہر بات بھول جاؤں گا۔“ سنان نے ہاتھ جوڑ دیئے۔
”تمہیں لگتا ہے شاہ! یہ ہمارے لیے خطرہ ہے؟“ چاندنی کی ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا۔

سردموسم کی پہلی بارش برسنے کو تیار تھی تب ہی امی نے اماں جی کو اطلاع دی کہ سنان آ گیا ہے۔ امی کی آواز اس کے کانوں سے نکل کرانی۔
”میں نے اپنا وعدہ پورا کیا، سردموسم کی پہلی برسات میرے ہاتھوں میں ہاتھ تھام کر برسنے کی۔“ گھر میں قدم رکھتے اس کو اپنا وعدہ یاد آ گیا، مریم بھاگ کر کمرے میں بند ہو گئی۔
”اب تو یہ غصہ ہاتھ مانتے پر ہی ختم ہوگا۔“ ☆.....☆.....☆

اولاد رزقا کا گھنٹہ کی طرف سے
بچوں کے لیے غمگین صورت نکال

گھنٹہ کی رت میں
بیت 150 ہے صالحو محمود

گھنٹہ کی رت میں
بیت 500 ہے صالحو محمود

گھنٹہ کی رت میں
بیت 500 ہے صالحو محمود

ویل کم بک پورٹ اردو بازار کراچی

کادل چلاتی ہیں۔“ اسد بھائی اماں جی کو سمجھانے لگے۔
”دولت کے ساتھ ساتھ وہ کوئی لڑکی ہے ناں چاندنی اس کا جادو چڑھ گیا ہے میرے بچے کو، ماں سے گھر سے جدا کر دیا۔“
”ماں جی! آپ دل چھوٹا نہ کریں۔“ مریم نے چائے کا کپ ان کی جانب بڑھا دیا۔ ☆.....☆.....☆

”مجھے نفرت ہے ذلیل عورت تم سے، تم نے دولت کے لیے میرے باپ سے شادی کی، ان کا قتل کیا، تم کتنی مکار عورت ہو، اب تم چاہتی ہو میں اپنے حصے میں آئی دولت بھی تمہارے نام کر دوں تاکہ تم اپنی بے حیائی کے ساتھ میرے باپ کی دولت پر عیش کر سکو۔“ رسیوں سے بندھا ہوا بچہ رہا تھا۔

”تمہارا باپ بھی کوئی شریف انسان نہ تھا سمجھتا ناں، اگر ہوتا بھی تو مجھ جیسی کو اپنا نہ بناتا، جو کیا اس نے میرے ساتھ اس کے بدلے میرا نت بناتا ہے کہ اس کی دولت پر عیش کروں، اور تم کیا جانتے ہو اپنے باپ کو، اس نے تو تمہیں اس وقت چھوڑا جب تم دنیا میں آئے تک نہ تھے، اگر تم سیدھی طرح کاغذات پر سنان نہیں کرتے تو ٹھیک ہے، شاہ! اپنے لڑکوں کو تیار کرو، ان سے کہو اس کی ماں کو اس کے گھر میں موجود ہر ایک انسان کو جان سے مار دیں، اس ملک میں اتنے لوگ روز مرتے ہیں، پر کسی کا ثبوت نہیں ملتا۔“ چاندنی نے حکم سنا دیا۔

”نہیں... نہیں خدا کے لیے انہیں کچھ مت کہنا، میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے آگے، میرے گناہ کی سزا ان لوگوں کو کیسے مل سکتی ہے، پہلے ہی اپنی ماں کادل دکھایا ہے اپنی محبت مریم کادل دکھایا، اسے چھوڑ بیٹھا دولت کے لیے، تمہارے جیسی عورت کے لیے، اب اور تکلیف نہیں دے سکتا، میں اپنے نام تمام جائیداد تمہارے نام لکھ دوں گا، میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں، میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔“ سنان نے اعتراف کیا۔

ثوبیہ ملک

افسانہ

سافسوجی کی سارا

شہزادی سرودی کی اولین شامیں تھیں، چرند، برند بادلوں میں چھپتا چاند عجیب آنکھ چھوٹی کھیل رہا تھا، وہ کب کے اپنے گھونسلوں میں جا کے چھپ چکے تھے، ہر چیز سے بے نیاز میرس پر کھڑی بادلوں کی اوٹ



اس نے تو بہت بڑا گناہ کیا تھا اور جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

☆.....☆.....☆

”انفال یار! بات سنو! میرے پیچھے سر پر ہیں اور تمہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے، ویسے تجھے ہو کی بھی کیوں، تیرا کزن ہے ناں، تجھے ٹیوشن پڑھانے کے لیے۔“

”وہ اور مجھے پڑھائے گا، کم آن شانزے! ٹو جانتی ہے اچھی طرح سے کہ وہ تو میں صرف امی کی وجہ سے اس کے پاس پڑھ لیتی ہوں، ورنہ میں خود

میں چاند کو دیکھ رہی تھی، کتنی عجیب بات تھی ناں، کبھی وہ بھی چاند کی تمنائی تھی پر اس کے ہاتھ میں آ کر بھی اس نے اسے خود گنوا دیا تھا، اب اس کی زندگی میں صرف اندھیرا تھا، یوں لگتا تھا جیسے تیز روشنی نے اس کے وجود کو جلا کر خاکستر کر دیا ہو۔

ہلکی ہلکی بوند باندی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے موٹی قطرہ قطرہ کر کے گر رہے تھے، پر اب ان آنسوؤں کا کیا فائدہ؟ یہ تو اب اس نے ساری زندگی بہانے تھے کہ شاید اس سے ہی وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے، لیکن



اتنی ذہین ہوں کہ اس جیسے میرے آگے پیچھے پھریں۔ اور وہ شاید کہتی بھی ٹھیک تھی خدا نے جہاں اسے حسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا وہیں ذہانت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس کا اسے بہ خوبی اندازہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ درجہ مغرور اور تک چڑی تھی۔

”اچھا اب بس بھی کرو، تم تو ہر وقت اس بے چارے کو برا بھلا کہتی ہو، آخر اس نے تمہارا بگاڑ کیا ہے؟“ شانزے بولی۔

”شانزے! اگر تم نے مزید اس کی شان میں قصیدے پڑھنے ہیں تو پڑھو، میں تو جاری ہوں کینٹین، اگر چلنا ہے تو چلو، ورنہ مرضی ہے تمہاری۔“ وہ منہ بسورتی تیز قدموں سے لائبریری سے نکل آئی، مجبوراً شانزے کو بھی اس کے پیچھے قدم بڑھانے پڑے۔

☆ ☆ ☆
”امی... امی!“ وہ بری طرح چلائی، آنسو بیگم اس کے سر پر کھڑی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے انفال! کیا شور مچا رکھا ہے؟ کبھی تو سکون کا سانس لینے دیا کرو مجھے۔“

”ٹھیک کہا آپ نے عذاب ہوں ناں آپ کے لیے تو مار ڈالیں، کم از کم آپ کو اور آپ کے بھانجے کو سکون ملے گا۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”اچھا بس کرو، جاؤ اپنے کمرے میں، میں سمجھا دوں گی جبران کو، لیکن تم اب اس سے لڑو گی نہیں۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ وہ غصے سے چیر پختی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

”خالہ جانی پلیز! آپ میری بات مان کیوں نہیں لیتیں؟ آپ کو پتا تو ہے اگر میں اس کی یونی میں اسے لینے گیا، تو وہ ہنگامہ کھڑا کروے گی۔“ جبران بولا۔

”ارے کچھ نہیں کرتی، تم جاؤ لینے اسے، اگر کچھ ہوا تو میں سنبھال لوں گی۔“ وہ گہری سانس لینا خاموشی سے یونی جانے کے لیے تیار ہو گیا، جانتا تھا ایک بار خالہ نے جو کہہ دیا تو پھر وہ پتھر پر لکیر ہوئے کے مترادف تھا۔

”انفال! تجھے کوئی لینے آیا ہے، جاؤ وہ کینٹین کے پاس تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ اس کی دوست نے اسے کہا۔

”تم اور یہاں... تمہیں کس نے اجازت دی کہ مجھے لینے آؤ؟“ وہ مزید کچھ بولتی کہ شانزے کو قریب آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”انفال! کہیں تمہارا وہی کزن تو نہیں، جس کی ٹو ہر وقت تعریفیں کرتی رہتی ہے؟ اچھا خیر مسٹر جبران! میں ہوں شانزے، یعنی انفال کی بیٹ فریڈ اور آپ کو تو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ اب وہ انفال کے کان میں مکی جبران کی تعریف کر رہی تھی۔

”آف... اتنا پنڈم... ٹو تو اندھی ہے ایسا خوبصورت انسان میں نے تو آج تک نہیں دیکھا، چل میری بات کرو اس سے پلیز!“ وہ جھٹک گھور کر رہ گئی اسے۔

”تجھے تو میں کل بات کرتی ہوں، فی الحال تو مجھے دیر ہو رہی ہے، چلیں اب جبران صاحب ہم؟“ وہ طنز بہ بولی۔

”بات سنو! اپنے سر کو ڈھانپ لو، موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں لگ رہے۔“

”کیوں تمہیں اس سے کیا، میں نے کہا تھا تمہیں کہ تم اس موسم میں ہیرو بن کر مجھے لینے آؤ؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”میں بھی کوئی مرانہیں جا رہا تھا، خالہ نے کہا تو آ گیا، اور ویسے بھی تم کوئی اتنی حسد نہیں ہو، چھٹا تک بھر کی تو ہوتی۔“ ابھی وہ بول ہی رہا تھا کہ بجلی زور سے

کڑی تھی اور انفال سدا کی ڈرپوک اس کے سینے میں بری طرح ڈر کر چھپ گئی تھی، اور یہی وہ لمحہ تھا جس نے جبران جیسے مضبوط بندے کی دنیا تہہ وبالا کر دی تھی، کافی دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا اور انفال کو خود سے الگ کیا۔

”بس کرو ایسے تو بچے بھی نہیں کرتے دیکھو! کیسے لوگ گھور کر ہمیں دیکھ رہے ہیں۔“ انفال انتہائی خفت و شرمندگی سے اسے دیکھ رہی تھی اور زبان تو ایسے بند تھی جیسے گوگی ہو گئی ہو، اور وہ اس کی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا تا زور سے نفس دیا۔

☆ ☆ ☆

رات آہستہ آہستہ یقینی جاری تھی، لیکن اس کی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی، اس نے دل کو بار بار سمجھایا تھا۔

”جس کو ٹو پھول سمجھ رہا ہے وہی تجھے زخمی کر دے گا۔“ مگر دل نے پہلے کب سنی تھی؟ وہ تو بس ایک ہی طلب کر رہا تھا کہ مجھے انفال چاہیے۔

”کاش! آج میں اسے لینے نہ جاتا تو میں یوں بے اختیار نہ رہتا، یہ کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے؟ میں تو تمہیں اپنی نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا اسی کی سزا ملی ہے مجھے۔“ نہ جانے کب تک وہ اس کے تصور سے باتیں کرتا سو گیا۔

☆ ☆ ☆

”انفال! جاؤ بیٹا! دیکھو جبران کو، ابھی تک سویا ہوا ہے، ایسا تو بھی نہیں ہوا کہ وہ دیر تک سوتا رہے۔“

”اچھا امی! جاتی ہوں۔“ دو سے تین بار دستک دینے پر بھی جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ اندر چلی آئی۔

”جبران! امی بلا رہی ہیں، جلدی آ کر ناشتہ کرلو۔“ وہ تیزی سے بولی۔

لیکن وہ تو لگتا تھا کچھ پی کر سو گیا ہے، آخر تک آ کر اس نے زور سے مکمل اتار پھینکا تھا اور وہ جو

رات تک اس کے تصور میں گم تھا، اسے بھی کوئی حسین خواب سمجھا، زور سے اس کا ہاتھ کھینچتا اپنی جانب گرایا وہ جو اپنے خیال میں تھی، اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی نتیجتاً اس پر پڑی۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟ شرم نہیں آتی تمہیں، انتہائی گھٹیا ہوتی۔“

”سوری انفال! مجھے پتا نہیں چلا، پلیز معاف کر دو مجھے۔“

”اوٹ اپ! بھاڑ میں جاؤ تم، میں نفرت کرتی ہوں تم سے، پتا نہیں امی کو تم میں کیا نظر آیا کہ اٹھا کر لے آ میں تمہیں، مجھے یہ گھر کم اور یتیم خانہ زیادہ لگتا ہے، ایک تو مفت کی روٹی کھاتے ہو اوپر سے خرے بھی دکھاتے ہو، انتہائی لوڑ کر کیکٹر کے!“ ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہو پائی تھی کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے گال کو سرخ کر گیا تھا۔

”اس سے آگے ایک لفظ بھی نہیں برداشت کروں گا، مجھے کیا ہو خود کو؟ اگر چاہوں تو تمہارے ساتھ ہر حد پار کر سکتا ہوں اور تمہیں اتنا موقع بھی نہیں ملے گا کہ تم کسی کو مدد کے لیے بلا سکو، نکل جاؤ میرے کمرے سے، آئی سے گیٹ آؤ!“ وہ ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر بھاگ گئی تھی، اور وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

”انفال! وہ دیکھ سامنے جو لڑکا آ رہا ہے ناں، بہت ہی مغرور ہے، کسی سے بات ہی نہیں کرتا اور لڑکیوں کو تو اپنی جونی کی نوک پر رکھتا ہے۔“ شانزے بولی۔

”ٹو یہاں رک، دیکھ میں کیا کرتی ہوں۔“

انفال بولی۔ وہ اس کی بات سنے بغیر اس لڑکے کی طرف چل دی۔

وہ اندھا دھند بھاگ کر گئی تھی جس کی وجہ سے اس سے زور سے ٹکرائی تھی اس سے پہلے کہ وہ زمین

بوس ہوتی، اس لڑکے نے نہایت نرمی سے اسے کھڑا کیا تھا۔

”محترمہ! خدا نے آپ کو اتنی خوبصورت آنکھیں دی ہیں، ان کا استعمال بھی کیا کریں، اگر ایسے ہی لگرائی رہیں ناں آپ تو دوسروں کے ہوش و حواس گنوا دیں گی۔“

”سوری وہ میں ذرا جلدی میں تھی، اصل میں میری دین نے آنا ہے تو اگر وہ مس ہوگئی تو پھر اگلے ایک گھنٹے تک مجھے خوار ہونا پڑے گا۔“ انفال بولی۔

”اچھا اگر یہ بات ہے تو آئیے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔“ وہ نو جوان دھیرے سے بولا۔

”ارے نہیں شکریہ! میں چلی جاؤں گی، ویسے میں کیا آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟“

”او... یس شیورا! مجھے شازم کہتے ہیں، ابھی کچھ دن ہوئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے، اصل میں مجھے انگلش میں ماسٹر کرنے کا شوق ہے، تو اسی شوق نے مجھے یہاں لاکھڑا کر دیا، لو... میں اپنا ہی بتاتا چلا جا رہا ہوں آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیے؟“

وہ اس سے بولا۔

”میرا نام انفال ہے اور میں ایم بی اے کر رہی ہوں، اور کچھ خاص نہیں خیر میں چلتی ہوں پھر ملیں گے۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

”کیوں... پھر مانتی ہے ناں؟ کیسے پاگل بنایا میں نے شازم کو؟“ انفال پلٹ کر بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے انفال! لیکن اتنی جلدی کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اور وہ تو ہے بھی بہت زیادہ امیر، ایسے لوگ ہم جیسے مڈل کلاس کے لوگوں کو چارہ نہیں ڈالتے اور مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تو نے اسے اپنے بارے میں ٹھیک سے بتایا کیوں نہیں؟“

شازم نے بولی۔

”قسم سے شازم! مجھے تو لگتا ہے کہ تو چاہتی

ہی نہیں کہ میں امیر ہوں۔“

”انفال! مجھے لگتا ہے کہ جبران تجھے چاہتا ہے اس دن جب وہ آیا تھا نا یہاں تو تو نے کتنا کچھ کہا تھا اور جواب میں اس کے لب سلے ہوئے تھے، لگتا تھا اس کی سدھ بدھ کھو گئی ہو۔“ شازم نے بولی، اور وہ اس کی بات سن کر ہنسی ہی چلی گئی۔

”اوہ گاڈ! شازم! اگر وہ میری زندگی میں آخری شخص ہوگا ناں تب بھی اس سے شادی نہیں کروں گی، کیا دے سکتا ہے وہ مجھے؟ محض دو کمرے کا گھر، بلکہ گھر کہنا بھی تو ہیں ہوگا، کیاڑکوں تو زیادہ اچھے رہے گا، دم گھٹتا ہے میرا وہاں اور امی ہیں کہ اسے جنت سے کم نہیں سمجھتیں، کبھی میرا دل چاہتا ہے آگ لگا دوں اس گھر کو، مجھے ہمیشہ سے نفرت رہی ہے جبران سے، اگر امی کا خیال نہ ہوتا تو کب کی اسے شوٹ کر چکی ہوتی، یعنی خس کم جہاں پاک۔“ وہ نفرت سے بولی۔ شازم نے شخص اسے تاسف سے دیکھ کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

یونیورسٹی میں تقاریر اور شاعری کا مقابلہ منعقد کیا گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کی تیاری مکمل ہی نہیں ہو رہی تھی، مکمل بلیک کمر کے سوٹ میں وہ غضب ڈھا رہی تھی، آج تو اس کی چھب ہی نہ رہی تھی، جبران جو کسی کام سے وہاں سے گزر رہا تھا اس کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا، خوبصورت تو وہ پہلے بھی تھی لیکن آج تو وہ کوئی اسپر الگ رہی تھی۔

”انفال! ایک بات بولوں، اگر برائہ نا تو تو...؟“

جبران قریب آ کر بولا۔

”پلیز کوئی نصیحت مت کرنے بیٹھ جانا، کیوں کہ آج میں بہت خوش ہوں اور کم از کم اس وقت میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔“

”او کے تمہاری مرضی، جیسے تم مناسب سمجھو، لیکن خیال سے جانا کیوں کہ تم بہت خاص ہو۔“ وہ یہ

کہتا آ نہ بیگم کی طرف چلا گیا جبکہ وہ اس کی بات پر الجھتی اپنی تیاری کو آخری سچ دینے میں مصروف ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

اس نے ایک ایک لفظ اتنی خوبصورتی سے ادا کیا تھا پورے ہال میں سکوت چھا گیا تھا، اس کے نظم ختم کرتے ہی پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور پہلا انعام ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس کے حصے میں آیا تھا۔

”مبارک ہو انفال! بہت بہت، کیا خوب شاعری پڑھتی ہو۔“

”شکریہ شازم!“

”اب اس خوشی میں آؤ تمہیں میں اچھی سی جگہ لے چلتا ہوں، اور آج تو تم غضب ڈھا رہی ہو، چلو آؤ لاگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔“ وہ بولا، وہ جو اس کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس کی گاڑی میں بیٹھنے والی تھی قریب آتے جبران کو دیکھ کر جی بھر کر بے مزہ ہو کر رہ گئی۔

”اف... یہ شخص کبھی بھی مجھے خوش ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔“

”انفال! جلدی چلو خالہ جانی کی طبیعت بہت خراب ہے، وہ تمہیں بلارہی ہیں۔“ جبران بولا۔

”انفال! یہ کون ہے؟“ شازم نے چونک کر پوچھا۔

”مسٹر ذیشان! میں بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں؟“ جبران آگے بڑھ کر بولا۔

”دیکھیے! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میرا نام ذیشان نہیں شازم ہے۔“

”اوہ اچھا... واقعی! اور کتنے نام بدلیں گے آپ ذرا بتانا پسند کریں گے؟“ وہ غصے سے انفال کا ہاتھ چھپتا چل دیا۔

☆.....☆.....☆

”خالہ! پلیز اپنی لاڈلی نوکام ڈال کر رہیں، بہت اونچے اونچے خواب دیکھ رہی ہے، جانتی نہیں کہ جب یہ ٹوٹتے ہیں تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔“

”بند کر دو اپنی بکواس تم، امی! اس ذلیل انسان نے میری سب کے سامنے بے عزتی کی ہے، یہ ہوتا کون ہے مجھ پر حکم چلانے والا، پتا نہیں شازم کیا سوچ رہا ہوگا میرے بارے میں۔“ انفال غصے سے بولی۔

”بند کر اپنی بکواس، اور جا اپنے کمرے میں، دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔“ آنرے بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”خالہ جانی! بس کریں وہ بچی ہے ابھی، سمجھ جائے گی۔“

”تو مجھے یہ بتا کہ آخر ہوا کیا ہے جو تجھے اس پر غصہ ہے؟“ انہوں نے جبران سے پوچھا۔

”جانے دیں خالہ! لیکن اب آپ اسے یونی نہیں جانے دیتیے گا۔“

”مگر بیٹا! وہ بھی تو پتہ چلے؟“

”خالہ! یہ جس لڑکے کے ساتھ تھی وہ اس جیسی لڑکیوں کو بے وقوف بنا کر ان کی قیمت وصول کرتا ہے۔“ جبران غصے سے بولا۔

”کیا کہہ رہا ہے تو؟“ آنرے بیگم تو صدمے سے ڈھس گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”امی پلیز! ایک بار جانے دیں مجھے صرف ایک بار، پھر آپ جو بولیں گی میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ انفال ان کی خوشامد کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہے مگر تو اکیلی نہیں جائے گی، جبران تیرے ساتھ جائے گا اور ایک بات سن لے تو، میں تیرا کھل ہی نکاح کروا دوں گی۔“ آنرے بیگم بولیں۔

”امی! آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟ دم کریں مجھ پر۔“ وہ روتے روتے ماں کے قدموں پر گر گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ماں تھیں، بیٹی کی التجا پر دل پہنچ گیا تھا۔
”چل اٹھ منہ ہاتھ دھو لے، کیا حال بنا رکھا ہے
تُو نے، چل میری بچی! اپنی حالت ٹھیک کر۔“ وہ
خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور
شازم کا نمبر ملانے لگی۔

”ہیلو شازم! میری بات غور سے سنو! میری امی
کل شام میرا نکاح کرنا چاہتی ہیں اور تم جانتے ہو
اچھی طرح سے کہ میں صرف تمہیں چاہتی ہوں، اور
تمہارے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ وہ
روتے ہوئے بولی۔

”تو ٹھیک ہے انفال! تم کل صبح مجھ سے ملو، ہم
کورٹ میں میرج کر لیتے ہیں۔“
”لیکن تمہیں میری دو شرطیں مانی ہوں گی۔“

انفال بولی۔
”ہاں بولو! میں ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہوں
تمہاری۔“ شازم بولا۔

”تمہیں اپنی کوشی اور آدمی جانید امیرے نام
کرنی ہوگی، تم یہ مت سمجھنا کہ میں یہ سب پیسے کے
لیے کر رہی ہوں، بلکہ یہ سمجھو کہ یہ ہمارے پیار کی
آزمائش ہے اب تم پر ہے کہ تم اس پر کیسے پورا اترتے
ہو۔“ وہ بولی، دوسری طرف کچھ دیر خاموشی چھائی
رہی۔

”ٹھیک ہے انفال! میں تیار ہوں۔“ جب کہ وہ
بے انتہا خوش تھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے قارون کا خزانہ
ہاتھ آیا ہو، اس نے ہمیشہ سے ہی تو دولت کی چاہ کی
تھی اور اب اس کی منزل بہت زیادہ قریب تھی یا پھر
شاید!...

☆.....☆.....☆
”امی! ابھی تو صرف دس بجے ہیں، اور آپ
نے اتھا دیا، میں نے آپ کو کہا بھی تھا کہ بارہ بجے
تک مجھ کو ڈسٹرب نہ کریں۔“
”ارے میری چندا! بس کر، چل اٹھ کر دیکھ تو

سہی میں تیرے لیے کیا لائی ہوں۔“ وہ پیار سے
بولیں، وہ کسمندی سے آنکھیں مسکتی تھیں، لیکن
بند پر بکھری چیزیں دیکھ کر اس کے چودہ طبق روشن
ہو گئے تھے۔

”امی! یہ سب کیا ہے، یہ سرخ جوڑا، یہ زیور اور
یہ باقی سب آخر کیا ہے آپ نے کہا تھا کہ میری ہر
بات مانیں گی تو پھر...؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں میں نے کہا تھا لیکن ابھی اٹھو اور جلدی
سے تیار ہو جاؤ! اسی وقت تمہارا نکاح ہوگا، پھر جہاں
جانا ہوگا اپنے شوہر کے ساتھ جانا۔“

”مگر امی! آخر آپ کس سے میرا نکاح کر رہی
ہیں؟“

”ابھی کچھ دیر بعد تمہیں پتا چل جائے گا۔“
آنرے بیگم غلت میں کہتیں چلی گئیں اور وہ تو اس آنے
والے طوفان کو محض دیکھ کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆
نکاح خواں تین بار اپنے لفظ دہرا چکا تھا مگر وہ تو
لفظ جبران پر ہی اپنے ہوش گنوا بیٹھی تھی، یہ کیسے ہو سکتا
تھا بھلا جس شخص کو اس نے برسوں نفرت سے دیکھا
ہو وہ بھلا کیسے اس کا شوہر ہو سکتا تھا؟ دل تو چاہ رہا تھا
خود سمیت پوری دنیا کو آگ لگا دے، مگر امی کے
جوڑے ہاتھ اسے مجبور کر گئے تھے اور وہ انفال شاہ
سے انفال جبران ہو گئی تھی۔

”آہ...! یہ تھا میرا نصیب۔“

☆.....☆.....☆
کمرہ نہایت خوبصورتی اور نفاست سے سجایا گیا
تھا جگہ جگہ جا بجا سرخ گلابوں کی پیتاں بکھری ہوئی
تھیں اور وہ ان تمام پھولوں سے زیادہ نازک لگ
رہی تھی، دل میں اٹھتی درد کی ٹیس دبائے وہ آنے
والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی، وہ
سوچ چکی تھی کہ اسے آگے کیا کرنا ہے وہ کسی صورت
بھی جبران کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں تھی،

ابھی نہ جانے وہ اور بھی سوچتی مگر دروازہ کھلنے کی
آواز پر سیدی ہو کر بیٹھ گئی۔

”ویسے انفال بی بی! کتنا غصہ آ رہا ہوگا ناں
تمہیں، تمہارا بس نہیں چل رہا ہوگا کہ تم مجھے قتل کرو،
تم نے سوچا ہوگا کہ میری جگہ آج تم شازم کے ساتھ
ہوئیں مگر واہ! ارے قسمت۔“ وہ ہنستا ہی چلا گیا تھا۔

”بند کر دو ابی بکواس، تم کیا سمجھتے ہو کہ تم نے مجھے
پالیا ہے، دو کوڑی کی اوقات ہے تمہاری، نفرت کرتی
ہوں میں تم سے اور یاد رکھنا کہ میں بہت جلد چھٹکارا پا
لوں گی تم سے اور رہی بات شازم کی تو وہ نہیں تو کوئی
اور سہی مگر میں کم از کم اب اس چڑیا کے گھونسلے میں
رہنا پسند نہیں کروں گی۔“ وہ نفرت سے بولی۔

”بکواس! بند کر دو ابی۔“

”نہیں ڈرتی میں تم سے اور یاد رکھو! تم مجھے پا کر
بھی ادھر سے رہو گے، زندگی بھر بتائیں امی کو تم میں
کیا نظر آیا جو باندھ دیا تمہارے ساتھ اور جو تم خود کو
پاک باز سمجھتے ہو ناں دنیا کے سامنے تمہارا کردار کھول
کے رکھ دوں گی۔“

”بس، بہت بول چکیں تم۔“ وہ زور سے غرایا تھا۔
”اور یاد رکھنا اگر تم نے اس گھر کی دہلیز پار کی تو
مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا، اٹھو یہاں سے مجھے سونا
ہے، تمہارا جہاں دل چاہے جا کر مرو۔“ وہ انتہائی
سفاکی سے بولتا خود پر کمر بٹان کر سو گیا تھا اور وہ اپنی
قسمت کے اس روپ پر سسک اٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆
ان کی شادی کو ایک مہینہ ہو چکا تھا مگر دونوں میں
لگتا تھا کبھی شناسائی ہی نہیں تھی، پچھلے چار روز سے
آنرے بیگم کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ سانس لینا مشکل
ہو گیا تھا۔

”انفال! میری بچی! تُو کیوں ایسا کر رہی ہے
اپنے ساتھ؟ تُو ایسی تو بھی نہیں تھی۔“
”امی! میں ایسی ہی تھی، ہمیشہ سے پتا ہے جب

میں چھوٹی سی تھی تو اس شخص نے مجھ سے آپ کا پیار
چھین لیا، اپنے گھر پر رہنے کے طعنے دیتا، لیکن اب
اور نہیں، میں شازم سے بات کر چکی ہوں، وہ میرا
باسپورٹ تیار کر دیا چکا ہے اور ہم بہت جلد یہاں سے
نکل جائیں گے۔“ وہ ابھی مزید بولتی مگر آنرے بیگم کی
اکھڑی سانسیں اسے بدحواس کر گئیں۔

”امی! آنکھیں کھولیں... جبران! پلیز جلدی
آئیں، دیکھیں ناں ابی بات نہیں کر رہیں مجھ سے۔“
”خالہ! کیا ہوا آپ کو؟“ وہ آنرے بیگم کی دل کی
دھڑکنیں چیک کرنے لگا جو کہ اب بالکل خاموش
ہو گئی تھیں۔

”انفال! خالہ ہمیں چھوڑ گئی ہیں۔“ اور وہ تو یہ خبر
سن کر شاکد رہ گئی۔

☆.....☆.....☆
اس کی ماں کو گئے ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے،
اس وقت وہ شازم کے ساتھ جانے کے لیے مکمل تیار
تھی، بس کچھ شاپنگ رہتی تھی کرنے والی، جس کے
لیے وہ جبران کی منت سماجت کے بعد اسے ساتھ
لے جانے پر راضی ہو گئی تھی۔

ابھی وہ شاپنگ مال میں داخل ہی ہوئے تھے کہ
شازم کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔
”شازم! یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟“

”ایک سیکڑی زی! میں آپ کو نہیں جانتا اور آپ سے
کس نے کہا کہ میں شازم ہوں، میرا نام ذیشان حیدر
ہے، آپ کو شرم نہیں آتی لڑکوں کا راستہ روکتے ہوئے
انتہائی گھٹیا ہیں آپ۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا
جبران نے ایک زوردار پھڑپھڑ سید کہا تھا اسے۔

”تمہیں کس نے حق دیا کہ میری بیوی سے ایسے
بات کرو، آئندہ اپنی حد میں رہنا، چلو انفال! میرے
ساتھ۔“ گھر آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی کوئی اتنا
بڑا دھوکہ دیتا رہا اور اسے پتا بھی نہ چلا، جس شخص کی
خاطر اس نے اپنے شوہر کو ناراض کیا، وہی اسے

نفاست اور سہولت موویٹا ٹشو کی بدولت

VIRGIN PULP سے تیار کردہ پاکستان کا واحد پرنٹڈ ٹشو پیپر
ایکسٹر لائٹ، ایکسٹر اعلیٰ صحت، ایکسٹر سہولت، جذب کرنے آسانی سے صاف کر دہائی سے

MOVETA
کی تمام شاخوں کا واحد پاکستانی دستیاب ہے



MOVETA®
Super Soft

MOVETA Big
Perfumed & Printed Tissue
پاکستان کا واحد پرنٹڈ ٹشو پیپر

Super Soft
زیادہ سہولت... زیادہ نفاست
Perfumed Sandoog
دکانوں سے ملنے والا ٹشو



Mod Nap
کم خرچ والا ٹشو پیپر
صرف روپے میں 150 ٹشو

Party Pack
گھر اور تقریبات کے لئے سب سے زیادہ ترس

MOVETA
Super Soft Roll & Kitchen Roll
ضرورت بھی... سہولت بھی

MOVETA آپ کا لائف سٹائل

برائے سیکڑ اور ڈسٹری بیوٹن پاکستان کے تمام شہروں کیلئے مالی طور پر مستحکم پرائیویٹ ٹوری راولپنڈی

MOVEETA INTERNATIONAL MADE UNDER LICENCE IN PAKISTAN BY, K.B. TRADERS
P.O.BOX 2223 KARACHI - 74600. PH. OFF: (021) 6609032, 6623757, FAX: (021) 6623513
E-mail: moveeta@cyber.net.pk E-mail: moveetatissuepaper@hotmail.com

پچھانے سے انکار کرنے لگا، لیکن اس سب کے باوجود بھی جبران نے ایک لفظ شکایت کا نہیں کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ دیکھ رہا تھا کہ جب سے شازم والا واقعہ ہوا ہے، اس میں کافی تبدیلی آگئی ہے، اس وقت بھی وہ مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی، لیکن جب بھی وہ دیکھتا وہ انجان بن جاتی، دروازے پر ہونی دستک نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”انفال!“ وہ بے پناہ سرور تھا۔

”یہ دیکھو! تم جو چاہتی تھیں وہ سب تمہیں مل گیا ہے میں نے ڈیفنس میں تمہارے نام سے کوئی خرید لی ہے، اب یہ گھر صرف تمہارا ہے، میں نے بابا کی ساری پارٹی بیچ دی ہے اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، چلو آؤ میں تمہیں گھر دکھاتا ہوں۔“ جبران بولا۔

”مجھے معاف کر دو جبران پلیز! میں نے تمہیں بہت دکھ دیے ہیں ناں، مجھے کچھ نہیں چاہیے، بس تمہارا پیار چاہیے۔“ وہ بری طرح اس کے سینے سے لگی سسک رہی تھی۔

”اور میری جان! کو کیا چاہیے؟ بس پیار... ارے تم جو مانگو گی میں تمہیں دوں گا، اچھا تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں ذرا پارٹی ڈیسک مل کر ایک گھنٹے میں آتا ہوں، پھر اپنی خیر منانا، آج تو تم مجھے ملی ہو اور اس خوشی میں تمہارا فرض بنتا ہے تم مجھے ٹریٹ دو، لیکن وہ ابھی نہیں۔“

”تو پھر کب؟“ وہ تاجی کے عالم میں بولی۔
”یارا رات میں۔“ وہ اس کے کان میں سرگوشی سے بولا، جب کہ وہ اس کا مطلب پا کر کانوں کی لوڈوں تک سرخ ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

مکمل بلیک ساڑھی میں ملبوس وہ بے انتہا خوبصورت لگ رہی تھی، پچھلے چار گھنٹوں سے وہ

جبران کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ تو آ کر نہیں دے رہا تھا، اس کے دل کو بے شمار خیالات ستا رہے تھے، بے چینی تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی، باہر سے آتی ایپولنس کی آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے وہ بھاگ کر گیت کھولنے آئی تھی۔
”آپ ہیں مسز جبران کیا؟“
”جی...!“

”سوری آپ کے شوہر اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“ وہ اور بھی بہت کچھ بول رہا تھا مگر اسے تو کفن میں لپٹا صرف جبران کا چہرہ نظر آ رہا تھا، اس کے بعد کیا ہوا وہ نہیں جانتی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کی سیاہی ختم ہو چکی تھی اور وہ ابھی تک باضی کے دھندلوں میں گم تھی، نہ جانے وہ کتنا روٹی تھی پوری رات، مگر اذیت کم ہی نہیں ہو رہی تھی، اس وقت شازم اس سے ملنے آئی تھی۔

”انفال! کب تک یوں رہو گی، رحم کر خود پر۔“

”جانتی ہو رحم کے معنی شازم؟ میری خود غرضی نے اسے مار دیا، میں دولت کی ہوس میں اندھی ہو گئی تھی، اس نے میری خاطر اپنا گردہ بیچا اور مجھے بتایا بھی نہیں، پتا ہے اس نے کیا کہا کہ میں نے پرانا گھر بیچا ہے، وہ مجھے اتنا چاہتا تھا اور میں...!“

”بس کرا انفال! اللہ سے معافی مانگ اور دیکھ اگر ٹو ایسے ہی رہے گی تو جبران کی روح کو تکلیف پہنچے گی، تو چاہتی ہے کہ وہ وہاں بھی سکون سے نہ رہے؟“

”نہیں شازم! میں اسے سکون پہنچانا چاہتی ہوں، میں نے وہ کوئی بیچ کر سارے پیسے ایڈجسٹمنٹ کو دے دیے ہیں، شاید اس سے میرے گناہوں کا کفارہ ادا ہو سکے۔“ وہ ایک بار پھر شازم کے کاندھے سے لگی سسک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

سلسلے وار ناول

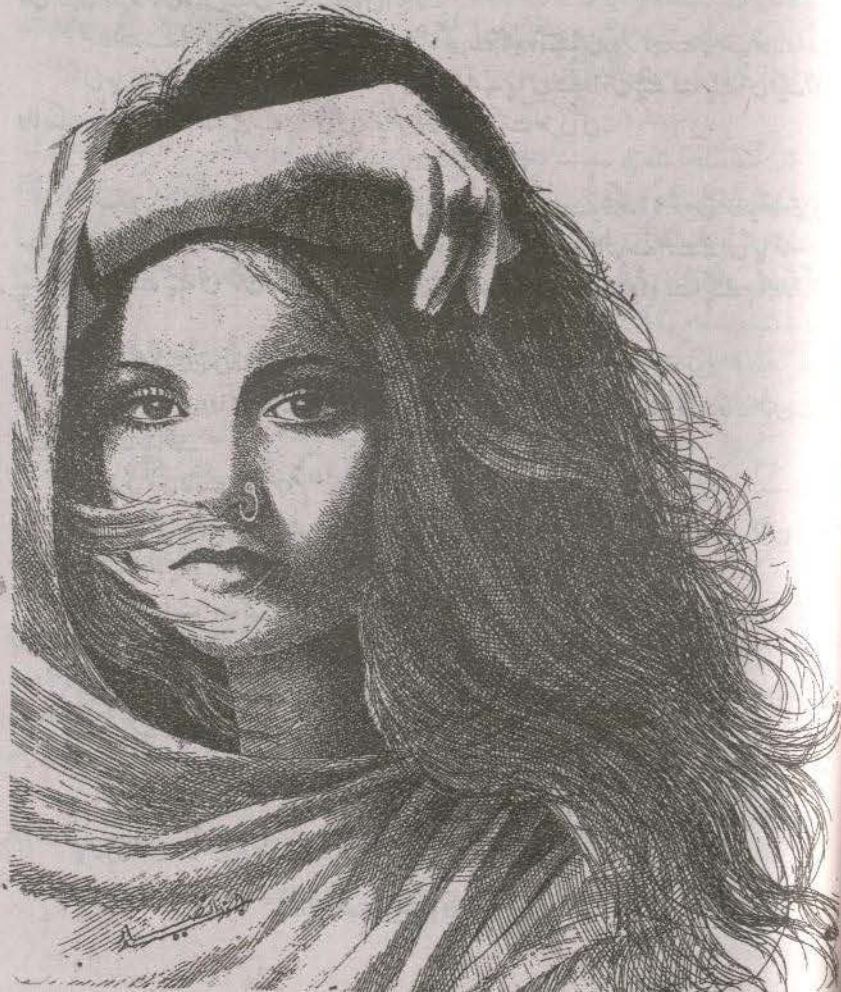
ہر عیش میں عیشی اور عیش ملی جمانے

”میں کیا چھپاؤں گی، اور مجھے اس سے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اس کے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا، صبح انسٹیٹیوٹ کے لیے نکلتا ہے تو شام تک آتا ہے، کچھ دیر کی ہی نیند لے پاتا ہے اس کے بعد عجلت میں ہی ریڈیو



انشین جانے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے، رات گئے جب واپس آتا ہے تو اتنا تھک چکا ہوتا ہے کہ کھانے کے درمیان ہی ہم کچھ باتیں کر لیتے ہیں، اس کے بعد تو وہ نیچے پر سر رکھتے ہی سو جاتا ہے، خرمن! مجھے بہت تکلیف دیتا ہے یہ سب، ایسا لگتا ہے کہ میری وجہ سے اس کی زندگی بہت مشکل اور دشوار ہو گئی ہے، دو دو جاہز کی ذمہ داریوں کے درمیان جب میگزین کے لیے اس کے فوٹو شوٹ کی ڈیٹ آ جاتی ہے تو وہ مزید گھن چکر بن جاتا ہے، وہ مجھے بالکل ایک مشین کی طرح دکھائی دینے لگا ہے اور میں اسے اس طرح نہیں دیکھ سکتی۔ شدید تاسف کے ساتھ بولتے ہوئے پیلانے نظر اس لیے بھکائے رکھی تاکہ خرمن اس کی آنکھوں میں پھیلتی نمی نہ دیکھ سکے۔

”یہ سوچنا چھوڑ دو کہ تمہاری وجہ سے اس کے ساتھ یہ ہوا یا وہ ہو رہا ہے، اگر وہ محنت کر رہا ہے تو اپنا مستقبل ہی سنوار رہا ہے، کیا دنیا کے اور مرد محنت نہیں کرتے؟ عارض بھی تو اپنی جاب کے ساتھ ساتھ انسٹیٹیوٹ کو سنبھال رہا ہے، کبھی کبھی تو وہ شام کو بھی گھر نہیں آتا، آفس سے سیدھا انسٹیٹیوٹ روانہ ہو جاتا ہے، ہر ذمہ دار مرد انتھک محنت کرتا ہے نہ صرف اپنے لیے بلکہ ان کے لیے بھی جو اس پر انحصار کرتے ہیں، عثمان اپنے لیے اور تمہیں



سپورٹ کرنے کے لیے دن رات ایک کر رہا ہے، تو یہ اس کا فرض ہے، اسے اپنے پیر زمین پر مضبوطی سے جمانے کے لیے اس محنت کی ضرورت ہے، اسے خود کو استیصال کرتا ہے اور تم بھی ہمدردی میں اس حد تک مت جانا کہ اس کے ارادے کمزور کر دو، 9 سے 5 کی جاب کے بعد تمہارے قدموں میں وقت گزار کر اسے کچھ حاصل نہیں ہونے والا، ابھی اسے تمہارے لیے ایک ذاتی گھر بنانا ہے، اپنی اور تمہاری زندگی کو بہتر سے بہتر بنانا ہے، کل اس کی ڈے داریوں میں مزید اضافہ بھی ہوگا، مگر بہتر یہی ہے کہ ابھی وہ خود کو کسی قابل بنائے، خود کو تیار کرے آگے آنے والی ڈے داریوں کے لیے، اس سب میں تم نے ہی اس کا ساتھ دینا ہے، لہذا جب تک اس سے اپنے تعلقات کو تم اسی طرح محدود رکھو جس طرح رکھے ہوئے ہو، خرمن کے تنہی لہجے میں کچھ تھا کہ بیلا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”مجھے امید ہے تم میری بات اور اس کے مقصد کو سمجھ چکی ہوگی، ابھی تم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے“۔ خرمن نے سنجیدگی سے بولتے ہوئے کچھ چونک کر بیلا کے بدلتے تاثرات کو دیکھا تھا اور پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں گردن موڑ کر عثمان کو جو پتہ نہیں کس وقت وہاں آیا تھا۔

”کتنا وقت لگے گا؟ عارش گھر جانے کا کہہ رہا ہے“۔ گہرے سنجیدہ لہجے میں وہ خرمن سے مخاطب تھا۔

”بس چائے تیار ہے، 2 منٹ لگیں گے“۔ خرمن کے جواب پر اس نے واپس پلٹنے سے پہلے بس ایک نگاہ بیلا کے سرخ ہو جانے والے چہرے پر ڈالی تھی، جو نظر جھکائے ساکت کھڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈرائنگ روم کی ڈسٹنگ سے ابھی وہ فارغ ہوئی تھی جب اس کے فون نے چنگھاڑنا شروع کر دیا تھا، تیزی سے بیڈروم میں آ کر اس نے سائیز ٹیبل سے فون اٹھایا تھا، اس وقت عثمان کی کال نے اسے حیران کیا تھا، اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عثمان نے فر فر جو خبر سنائی تھی وہ اسے پہلے دنگ اور پھر خوشی سے اچھلنے پر مجبور کر گئی تھی۔

”عثمان! مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا، تم نے اچھی طرح کفرم کیا ہے؟“

”ظاہر ہے دعائیں دو اس بندے کو جسے پتہ ہی نہیں ہوگا کہ تم اس کی کتنی مٹی پلید کر چکی ہو“۔ عثمان نے اسے شرمندہ کرنا چاہا تھا۔

”اب میری خوشی عارت مت کرو تم“۔ وہ جھلائی تھی۔

”عارش تک بھی یہ خبر پہنچا دو پہلے، بیلا اور منیزہ چڑیل کو پہلے فون کرنے کھڑی نہ ہو جانا“۔ عثمان کے گھر کنے والے انداز پر وہ ہلکھلائی تھی، مگر اس نے عثمان کی ہدایت پر عمل ضرور کیا تھا۔

”خرمن! کیا ہوا ہے سب خیریت تو ہے؟“۔ خرمن کی کال ریسپو کرتے ہی وہ جس طرح پریشان انداز میں بولا تھا خرمن حیران ہو گئی تھی۔

”سب خیریت ہی ہے، اتنا پریشان کیوں ہو گئے؟“ اس کے سوال پر وہ ایک پل کے لیے خاموش ہوا تھا۔

”سب خیریت ہے تو پھر کال کرنے کی وجہ؟“

”خیریت نہ ہونے پر ہی میں تمہیں کال کر سکتی ہوں کیا؟“۔ خرمن کو اس کا سوال ناگوار گزارا تھا۔

”یہ تم زیادہ بہتر جانتی ہو، میں کیا کہہ سکتا ہوں“۔ پتہ نہیں عارش کا لہجہ واقعی سرد تھا یا اسے ہی محسوس ہوا تھا۔

”کیا میری کال نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا ہے؟“

”بالکل نہیں مگر میں کال کرنے کا سبب جانتا چاہتا ہوں“۔

”کیا بغیر کسی سبب کے میں تمہیں فون نہیں کر سکتی؟“۔ خرمن کے لہجے میں ناگواری درآئی تھی۔

”کیوں نہیں، بالکل کر سکتی ہو مگر کرنی نہیں ہو“۔

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

”میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، بس تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ کبھی تم نے کسی ضرورت کے لیے بھی مجھے اس طرح اچانک کال نہیں کی ہے“۔ عارش کے گہرے سنجیدہ لہجے میں کچھ تھا جو اس کا چہرہ پاٹ ہو گیا تھا۔

”اس لیے آفس میں پہلی بار تمہاری کال ریسپو کرتے ہوئے میں پریشان ہوا تھا کہ یقیناً کوئی پرابلم ہے ورنہ تمہارے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ میری آواز سننے کے لیے ہی مجھے فون کرو“۔ اس کے سرد لہجے میں جو کچھ تھا وہ خرمن کو بھڑکانے کے لیے کافی تھا مگر اس نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔

”میں نے اس وقت بھی تمہاری آواز سننے کے لیے فون نہیں کیا ہے، ابھی عثمان کی کال آئی تھی اس کے بارے میں ہی تمہیں بتانا چاہتی تھی“۔ مٹی سے بولتے ہوئے اس نے مختصر آرڈر میں اپنے سلیکشن کی نیوز اسے دی تھی اور اسے کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر لائن ڈسکلیٹ کر ڈالی تھی۔ عارش نے فوراً ہی کال بیک کی تھی جسے نظر انداز کرتی وہ بیڈروم سے نکل گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈرائنگ کے سامنے چہرے کے گرد اس کا فون کوٹھیک کرتی وہ چونک کر وال کلاک کی طرف متوجہ ہوئی تھی، شام کے 6 بج چکے تھے، گہری سانس لے کر شانے پر دوپٹہ درست کرتی وہ کمرے سے نکلی تھی، گیٹ کھول کر پلٹتے ہوئے اس نے ایک نگاہ بھی عارش کو نہیں دیکھا تھا، مگر عارش نے ایک نگاہ میں ہی اس کے تیروں کو بھانپ لیا تھا، سو وہ رکے بغیر ہی اس کے پیچھے بچن میں آ گیا تھا، سینڈوچ میکر کھولتے ہوئے خرمن نے رک کر اپنی آنکھوں کے سامنے لہراتے سرخ گلابوں کو دیکھا تھا۔

”پہلی کامیابی کی مبارکباد وصول نہیں کرو گی؟“ اس کے شانے پر جھکاؤ مسکراتے لہجے میں بولا تھا، جواباً خرمن نے نہ اپنا رخ اس کی جانب موڑا تھا اور نہ ہی اسے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

”شکریہ!“ بے دلی کے ساتھ خرمن نے فلاورز اس سے لے کر کاؤنٹر پر ڈال دیئے تھے اگلے ہی پل وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی جب عارش نے اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے اسے شانوں سے تمام لیا تھا۔

”کس بات کا شکریہ؟ ہمارے درمیان یہ فارمیٹی کب سے آگئی؟“ اس کے سوال پر خرمن نے بس تیز نگاہوں سے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تھا۔

”تم غصے میں اور بھی زیادہ قیامت خیز لگتی ہو“۔ پر شوخ نگاہوں سے اس کے تاثرات دیکھتے عارش نے اس کے چہرے کو چھوا تھا، مگر اگلے ہی پل وہ دنگ رہ گیا تھا جب خرمن نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ الگ ہٹایا تھا۔

”سانپ کی طرح کینپلی بدلنا تو کوئی تم سے سیکھے، میری آنکھوں کے سامنے محبت کے راک ختم نہیں ہوتے تمہارے اور جب آنکھ سے اوصل ہوتے ہو تو مجھ سے زیادہ برا کوئی نہیں ہوتا تمہارے لیے“۔ اس کے زہر خند لہجے پر عارش کے تاثرات بدلے تھے۔

”ہاں، سچ کہا تم نے، ابھی بھی تو واقعی مجھے بھی یہ لگتا ہے کہ تم سے زیادہ برا کوئی نہیں کیونکہ ایک تم ہی ہو جو

مکمل مجھے اپنے بس میں کر چکی ہو، میرے سارے اختیارات اپنی منہمی میں لے چکی ہو، مجھ سے راضی ہوتی ہو تو اس طرح کہ سانس لینا مشکل کر دیتی ہو اور ناراض ہوتی ہو تو اس طرح کہ جینا دو بھر کر دیتی ہو۔ مجھے لہجے میں بولتا وہ شکایتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جس کے تیور مزید بگڑ رہے تھے۔

”تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو کر مجھی میں دیا ہی ہوں جیسا کہ اس وقت تمہارے سامنے ہوں، میں تمہارے قریب رہوں یا دور مگر میرے دل میں تمہاری محبت کا سمندر بھی خشک نہیں ہو سکتا اور اسے تمہاری محبت کی بارشوں کی محتاجی بھی نہیں ہے مگر چاہت ضرور ہے۔“

”میں اب تمہارے راگ نہیں سننے والی، فون پر جس لہجے میں تم نے مجھ سے بات کی تھی اس کے بعد تم مزید میری آنکھوں میں مٹی ڈالنے کی کوشش مت کرو، میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری محبت پر، کیا ہے یہ محبت، بس چند گھنٹوں یا دنوں کا خبط اس کے بعد دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے سب۔“

”ایک لفظ اور مت کہنا تم۔“ سرخ چہرے کے ساتھ عارش نے اس کی بات کاٹی تھی۔

”جس جذبے سے تم عاری ہو، انجان ہواں کے پارے میں اتنی بے ہودہ بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے تمہیں، میں کتنی بار ہوں تم سے، مجھے محبت کے قابل تم نہ سمجھو مگر میری محبت کے بے قدری مت کیا کرو، مت شک کیا کرو میری نیت پر میرے جذبول پر مگر تم مجھ پر نرم نہیں کر سکتیں کیونکہ تمہارے پاس احساس نام کی کوئی چیز کم از کم میرے لیے نہیں ہے۔“

”جب سب کچھ جانتے ہو تو کیوں میرے سر پر مسلط ہو، کیوں قبول نہیں کر لیتے کہ مجھے اپنا کراب تم پہنچتا رہے ہو؟ تم قبول نہ کرو مگر تمہارا لہجہ سب کچھ عیاں کر رہا ہے مجھ پر۔“ خرمن نے شدید طیش میں اس کی بات کاٹی تھی۔

”تم پر بس وہی کچھ عیاں ہو سکتا ہے جو تم دیکھنا چاہتی ہو، میرے لہجے کا تو صرف بہانہ ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ تم مجھ سے دور جانا چاہتی ہو، مجھ سے جان چھڑانا چاہتی ہو۔“ اس کی بلند آواز پر خرمن دنگ نظروں سے اس کے بھڑکتے چہرے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

”کبھی اپنے لہجے پر غور کیا ہے تم نے، کس طرح تم ایک سیکنڈ میں اپنے اور میرے درمیان دیوار کھڑی کر لیتی ہو، کس طرح تمہارا لہجہ اچھی لہجہ، رو بہ برداشت کرنا پڑتا ہے مجھے، کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں ہے کہ میں تم سے شکایت کروں، کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم نے بھی فون کر کے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ گھر سے نکلنے کے بعد میں زندہ بھی ہوں یا کسی حادثے کی نظر ہو گیا ہوں، کبھی تم نے فون کر کے یہ تک نہیں پوچھا کہ میں نے بچ کیا ہے یا نہیں، مگر سے نکلنے کے بعد میں کب واپس آؤں گا تمہیں اس سے بھی کوئی سروکار نہیں ہوتا، تم نے غلطی سے بھی کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں گھر دیر سے کیوں آیا ہوں کیونکہ تمہیں میری پرواہ نہیں ہے اور یہ تم مجھے بہت پہلے ہی بتا چکی ہو، میں ہی اپنی حیثیت بھول کر تم سے شکایت کر جاتا ہوں، تمہارے پاس میرے لیے وقت ہی کہاں ہوتا ہے، گھر میں بہت سارے گھمیلوں کے درمیان تمہیں چھوڑ کر نہیں جاتا مگر پھر بھی مجھے سوچنے کے لیے بھی تمہارے پاس وقت نہیں ہوتا، تم سے بات کرنے کے لیے مجھے پہلے تمہارے حزان کو جانچنا پڑتا ہے، تمہارے سائے کو چھونے کے لیے بھی مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت ہوتی ہے، ایک گلاس پانی کے لیے بھی تمہیں کہنا پڑتا ہے۔“ سانس روکے وہ اسے دیکھ اور سن رہی تھی جو گزرے دنوں کا سارا غبار آج نکالنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”تم نے مجھے پہلے یہ حیثیت کیوں نہیں بتائی کہ میں سانپ کی طرح کپکپی بدلتا ہوں، میری ایک شکایت

برداشت نہیں ہوئی تم سے، مگر میں اس وقت بھی اپنی محبت کی تحقیر برداشت کرنے پر مجبور ہوں، وہ محبت جو تمہارے نزدیک صرف چند گھنٹوں اور دنوں کی عیاشی ہے، مگر میرے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے، میں تمہارا بولنے فریضہ نہیں ہوں جو تمہارے ساتھ اس گھر کو، پین کو اور بیک کو شیر کر رہا ہوں، اپنے اور میرے رشتے کو تم نہیں پہچانا چاہتیں تو مت پہچانو، مگر خدا کے لیے میرے جذبات کی تحقیر مت کیا کرو، میری عزت نفس کی دھجیاں مت اڑایا کرو۔“ ساکت نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی جو انگاروں کی طرح دہکتے چہرے کے ساتھ اپنی شکست فاش نظریں اس پر سے ہٹاتا جا رہا تھا قدموں سے پکڑنے سے نکل گیا تھا، دھماکے سے بند ہوتے مین گیٹ کی آواز نے اطلاع دے دی تھی کہ وہ گھر سے بھی نکل چکا ہے۔

☆.....☆.....☆

”کہاں رہ گئے تھے، میری کال بھی ریسیو نہیں کی تم نے، میں عارش کو کال کرنے والی تھی۔“ اسے اندر آنے کا راستہ دیتی وہ شدید پریشان لہجے میں بولی تھی، جو اب عثمان نے خاموشی سے گیٹ لاک کیا تھا اور اس کی جانب دیکھے بغیر سیدھا کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا، اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے بیلا کی آنکھوں میں دھواں بھرنے لگا تھا، گزرے تین دنوں سے عثمان کی خاموشی اور لا تعلقی کو وہ محسوس کر رہی تھی، وہ اتنے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا تھا کہ بیلا کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی وجہ جاننے کی، تین دن پہلے تک ایسا بالکل نہیں تھا۔

ہر صبح وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ اسے خدا حافظ کہہ کر نکلتا تھا، اور واپس آنے پر بھی اس کا موڈ خوشگوار ہی ہوتا، سارا دن کی مصروفیات کی کوئی تحکین بیلا کو اس کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی مگر اب ایسا نہیں تھا، بیلا کے لیے تو یہ بھی برداشت کرنا مشکل تھا کہ وہ اس کی جانب دیکھ بھی نہیں رہا ہے، مخاطب بھی نہیں کر رہا ہے، اس کے گھر سے جانے کے بعد بیلا کو ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کہ اسے کال کرے وہ خود ہی ہر ایک یاد دہکنے بعد اسے کال کر کے اس کی خیریت دریافت کرتا تھا، یہ کالز چند منٹ کی ہوتی تھیں مگر ان دنوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر رکھتی تھیں، بیلا کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ کس وقت کہاں ہے بالکل اسی طرح عثمان کو بھی معلوم ہوتا تھا کہ بیلا گھر میں کس وقت کیا کر رہی ہوگی، دوپہر کے ایک مخصوص وقت میں وہ گھر پر کال اس لیے نہیں کرتا تھا کہ اسے پتہ ہوتا تھا کہ بیلا اس وقت سو رہی ہوگی، مگر اب اتنے گہرے تعلق کی موجودگی میں عثمان کا یہ اٹھا رو یہ بیلا کو شدید اضطراب میں مبتلا کر گیا تھا، گزرے تین دنوں میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ بیلا نے خود اسے کال کی، پتہ نہیں کس خوف کے باعث وہ سوال نہیں کر سکی تھی کہ کیوں وہ اسے کال کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکا، مگر اس کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ عثمان نے خود ہی بتا دیا تھا کہ مصروفیات کے باعث وہ اسے فون نہیں کر سکا، اس کا یہ رسمی انداز بیلا کی زبان مکمل بند کر گیا تھا، مگر یہ سوال اس کے دل و دماغ کو مسلسل ایڈیٹ پہنچا رہا تھا کہ عثمان کے لیے باہر کی مصروفیات اس سے زیادہ اہم کیسے اور کب ہو گئیں؟ آج تو حد ہو گئی تھی، رات کے 2 بجے وہ واپس آیا تھا، نہ فون پر اسے وجہ بتانے کی زحمت کی نہ اس کی کال ریسیو کی، اور اب کسی بھی بات کا جواب دینا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا، ایسا کون سا گناہ سرزد ہو چکا تھا اس سے کہ وہ ایک چھت کے نیچے بھی اس کے لیے اجنبی بن گیا تھا، اس کا ضبط ٹوٹنے لگا تھا، وہ اس پر چیخنا چاہتی تھی، اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ کس قدر اسے پریشان کر چکا ہے مگر.... اس وقت وہ صرف یہی چاہتی تھی کہ کھانے پر کوئی بد مزہ نہ ہو۔ یہ ایک وقت کا کھانا ہی ان دونوں کو ساتھ کھانے کا موقع ملا تھا، کل بھی عثمان نے ٹھیک طرح کھانا نہیں کھایا تھا لہذا آج خاص طور پر بیلا نے کھانے میں اس کی پسند کا خیال رکھا تھا۔

نہیں پر کھانا لگا کر وہ کچن سے نکلتی کمرے تک آئی تھی مگر اگلے ہی بل وہ بری طرح دنگ ہوئی تھی، اسے تو یہی لگا تھا کہ عثمان ہاتھ لے چکا ہوگا، مگر وہ تو جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا، آہٹ پر بھی اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر پیلہ کو نہیں دیکھا۔

”مان! کیا ہوا ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ تشویش ناک نظروں سے اسے دیکھتی وہ قریب گئی تھی مگر عثمان نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

”میں نے کھانا لگا دیا ہے، کھانے کے بعد سو جانا۔“ بیلا کے مزید کہنے پر اس بار عثمان نے اسے دیکھا تھا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے، تم کھانا کھاؤ۔“ سرد لہجے میں بولتا وہ اٹھ بیٹھا تھا اور خاموشی سے اپنے جوتے اتارنے شروع کر دیئے تھے۔

”تم نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا، تم مجھے بتا دو کہ مجھ سے غلطی کیا ہوئی ہے مگر اس طرح گھر میں کھانا پینا چھوڑ کر مجھے اذیت مت دو۔“ اس کے لرزے لہجے پر عثمان نے اسے دیکھا تھا۔

”کیا صرف تم ہی اذیت میں ہو؟“ ایک جھٹکے سے اٹھتا وہ اس کے مقابل آیا تھا۔

”انسان اپنے گھر میں کیا صرف کھانے پینے کے لیے آتا ہے، اگر ایسا ہے تو یہ گھر بھی گھر نہیں، میرے لیے ایک سرانے ہے، کھانے اور سونے کے لیے میں اس گھر میں آتا ہوں، کیا یہی ضرورتیں ہیں میری؟ اگر یہ سچ ہے تو غلط بھی نہیں ہے، اس گھر میں اور رکھا ہی کیا ہے میرے لیے جس کے لیے میں لوٹ کر یہاں واپس آؤں؟“ اس کے یکدم ہی بھڑک اٹھنے پر بیلا کی آنکھیں ہی نہیں چہرہ بھی دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

”ٹھیک کہا تم نے، اس گھر میں رکھا ہی کیا ہے تمہارے لیے جس کے لیے تم یہاں آنا چاہو گے۔“ دھندلائی نظروں سے اسے دیکھتی وہ واپس جانے کے لیے پلٹی تھی جب عثمان نے سرعت سے اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ اپنے سامنے کیا تھا۔

”اپنے آنسو اس کو دکھاؤ جس کے پڑھائے گئے سبق تمہیں ازبر ہو چکے ہیں، جس کی پڑھائی گئی پٹیاں تم آنکھوں پر چڑھا کر میرے ساتھ زندگی گزار رہی ہو اور انہیں اپنی آنکھوں پر باندھ کر ان پر عمل بھی کر رہی ہو۔“

عصیلی نظروں سے اسے دیکھتا وہ بولا تھا۔

”اگر تمہیں خرمن کی بات اتنی ہی بری لگی تھی تو تم نے پہلے مجھ سے اس بارے میں بات کیوں نہیں کی؟ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے مجھے دوسروں کے بتائے گئے مشوروں پر عمل کرنے کا شوق ہے؟“ بیلا نے شدید صدمے سے اسے دیکھا تھا۔

”مجھے ایسا سوچنے پر تم نے مجبور کیا ہے، تم خاموشی سے اس کی ہدایتیں سن رہی تھیں۔“ اس بار عثمان کا لہجہ بلند نہیں تھا مگر اس میں شکوے ضرور تھے۔

”اگر میں خاموش تھی تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں اس کی ہر بات سے متفق تھی، یہ میں اور تم جانتے ہیں کہ خرمن ہمارے ساتھ مخلص ہے، اس کے مشورے صرف ہماری بھلائی کے لیے ہوتے ہیں۔“

”کتنا اچھا مشورہ دیا تھا اس نے، وہ کون ہوتی ہے میرے اور تمہارے درمیان حدیں لگانے والی؟“ عثمان کے لہجے میں ناگوارگی تھی۔

”اس نے ایسی کوئی حد نہیں لگائی ہے، اسے میری نہیں تمہاری فکر ہے، وہ چاہتی ہے کہ تم اپنی ساری توجہ اپنا کیمرہ بنانے پر رکھو، اسے خدشہ ہے کہ کل مجھ پر کوئی یہ الزام عائد نہ کرے کہ میری وجہ سے تمہارا مستقبل تباہ ہوا

ہے یا تم پر یہ الزام نہ لگے کہ تم مجھے بہتر زندگی نہیں دے سکے، اگر تمہیں اس کی کوئی بات ناگوار گزری ہے تو پہلے اس بات کے مقصد پر غور تو کرو، کیوں تم اس کی مخلصی پر شک کر رہے ہو، اسے میرے اور تمہارے لیے جو بہتر لگتا ہے وہ کہتی ہے مگر اس نے یہ نہیں کہا کہ ہم وہی کریں جو اسے ٹھیک لگتا ہے، وہ بے وقوف نہیں ہے، جانتی ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان کیا رشتہ ہے، وہ یا کوئی اور ہمارے درمیان حد نہیں لگا سکتا۔“ شدید تاسف سے اسے دیکھتی وہ بولی تھی۔

”میں جانتا ہوں کہ خرمن اور عارش سب سے زیادہ ہم سے مخلص ہیں، میں ان دونوں کا احسان مند ہوں مگر میں کسی کو یہ اجازت نہیں دوں گا کہ وہ مجھے اور تمہیں حدوں تک محدود رکھنے کی بات بھی کریں۔“ اس کے کٹھنی لہجے پر بیلا نے اسے دیکھا تھا۔

”اس گھر کے اندر تمہارے ساتھ ایک حد کے اندر اگر میں زندگی گزار رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں یہ بھولنے پر مجبور ہوں کہ تم میری بیوی ہو۔“ اس کے سنجیدہ لہجے پر بیلا اس کی جانب نہیں دیکھ سکی تھی۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں کس ذہنی اذیت سے گزر کر مجھ تک آنا پڑا ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد اس اذیت سے نجات حاصل کرو، صرف اپنے اور میرے بارے میں سوچو، اس گھر میں اس نئی زندگی میں ایڈجسٹ ہونے کے لیے تمہیں وقت چاہیے جو کہ میں تمہیں دے رہا ہوں، میں فرشتہ نہیں ہوں، ایک انسان ہوں، میں تمہارے ساتھ اپنی نارمل زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ تم ہر طرح سے نارمل ہو جاؤ اور صرف میرے بارے میں سوچو، جو کہ اس وقت تو تم نہیں سوچتیں۔“ بغور اس کے چہرے پر لہراتے سائے دیکھتا وہ بولا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ میں نارمل نہیں ہوں؟“ اس کی جانب دیکھے بغیر وہ پوچھ رہی تھی۔

”مجھے معاف کر دو، اپنی ناراضی میں، میں نے تمہیں بہت پریشان کیا ہے، آئندہ مجھ سے یہ غلطی نہیں ہوگی۔“ اس کا سوال نظر انداز کر تا وہ شرمندہ لہجے میں بولا تھا۔

”آئندہ اگر تمہیں کوئی چیز ڈسٹرب کرے تو تم مجھ سے اس بارے میں بات کر لیتا، اس طرح خاموشی اختیار کر لینے سے بدگمانیاں مزید بڑھتی ہیں، میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر تمہاری لافلتی نہیں۔“

”میں واقعی شرمندہ ہوں۔“ عثمان درمیان میں بولا تھا۔

”مجھے کھانا دوبارہ گرم کرنا پڑے گا، تم پیچھے کر کے جلدی آؤ۔“ سنجیدگی سے اسے ہدایت دیتی وہ دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

”پتہ نہیں، مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے میرا انتظار ختم ہو چکا ہے، تم میرے ساتھ اس گھر میں ایڈجسٹ کر چکی ہو۔“ وارڈروب کی جانب بڑھتے ہوئے عثمان نے مسکرائی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”شاید یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔“ بمشکل مسکراہٹ چھپائے بولتی وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

لفٹ سے باہر نکلتے ہی ایک بار پھر اس نے احمد حسین کی کال ریسیو کی تھی، وہ یقیناً اس کے گھر پہنچ جانے کا یقین کرنا چاہتے تھے۔

”میں گھر پہنچ گیا ہوں ماموں جان! بلکہ گھر میں ہی ہوں۔“ گھر میں داخل ہوتے ہوئے عارش نے ایک

اجتنی نگاہ خرمین بر ڈالی تھی، اس کی سرخ آنکھوں نے عارش کو حیران نہیں کیا تھا۔
”آپ کو یقین نہیں تو خود خرمین سے بات کر لیں۔“ عارش کی آواز پر وہ کچن کی طرف جاتی ایک پل کوری تھی۔

”مجھے بات نہیں کرنی۔“ اس کی جانب دیکھے بغیر بولتی وہ سرعت سے آگے بڑھ گئی تھی یہ اور بات کہ اس کی بھیگی ناراض آواز احمد حسین تک بخوبی پہنچ چکی تھی۔
شاہر لینے کے بعد اس کی ناراضی بھی مکمل دور ہو گئی تھی اور غصہ تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب ڈرائیو کے دوران احمد حسین نے اسے کال کی تھی، احمد حسین سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کھانا کھائے بغیر نہیں سوئے گا اور یہ بھی کہ کھانا اسے خرمین کے ساتھ ہی کھانا ہے۔

کچن میں داخل ہوتے ہوئے اسے حیرت نہیں ہوئی تھی کہ خرمین ٹیبل کے گرد بیٹھی کھانے پر اس کا انتظار کر رہی تھی، یقیناً احمد حسین نے اس سے بھی کوئی وعدہ لیا تھا جب ہی تو وہ اتنی شانت اور خاموش تھی ورنہ کچ تو یہ تھا کہ اپنے دل کا غبار نکالنے کے بعد وہ اس چیز کے لیے پریشان تھا کہ گھر واپس جا کر خرمین کے رد عمل کو کس طرح فیس کرے گا، اس کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرتے کرتے وہ شاید آدھی رات ہی باہر کمرہ دیتا، اگر احمد حسین کی مداخلت نہ ہوتی۔ اس وقت وہ دل سے ان کا ممنون تھا۔

کھانے کے دوران وہ چور نظروں سے اس کے تاثرات نوٹ کرتا رہا تھا جو کہ ساٹ ہی تھے۔ پیشانی تک گرے پنک دوپٹے میں اس کی ستواں ناک اور آنکھیں بھی پنک ہو رہی تھیں، اندازہ لگا نامشکل نہیں تھا کہ وہ خوب روٹی ہے، بے دلی سے کھانا ختم کرتے ہوئے وہ اب ندامت محسوس کر رہا تھا، دوسری جانب خرمین بھی پلیٹ میں موجود بہت تھوڑی مقدار کے چاولوں میں چھپا دھرا دھرا کرتی رہی تھی۔

بہت خاموشی کے ساتھ کھانا ختم کرنے کے بعد عارش نے ٹیبل سے کھانے کے برتن سینے میں اس کی مدد کی تھی، عموماً وہ کام نہیں کرتا تھا، مگر اس وقت اپنی ہمدردی کا اظہار وہ اسی طرح کر سکتا تھا، ویسے خرمین سے اسے اس بے وقوفی کی توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی اور اپنی ناراضی کی وجوہات سے احمد حسین کو باخبر کر دے گی، مگر اسے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوا ہے اور اس میں تو کوئی شک نہیں رہا تھا کہ احمد حسین نے اس سے سختی سے باز پرس کی ہوگی۔

حسب معمول بیڈ پر جانے سے پہلے اس نے برش کیا تھا اور جب واش روم سے باہر نکلتا بھی خرمین کی آنکھیں ہونٹ تھی، کچھ سوچ کر وہ بیڈ روم سے باہر آ گیا تھا، کچن لائٹ آف تھی، لاؤنج میں بس فینسی لائٹ کی مدھم روشنی پھیلی تھی، میسر پر آتے ہوئے وہ بس ایک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا، موسم بدل رہا تھا اور رات کے اس پہر میں ہوا بھی کافی خشک ہو چکی تھی۔ لیکن وہ ہر چیز سے بے نیاز میسر کے آہنی جینگلے سے پشت لگائے ماربل کے چھتے بن بست فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔
شانے سے پھسلتا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے خرمین نے اسے بس ایک نظر دیکھا تھا جو اس کے قریب ہی آ بیٹھا تھا۔

”ماموں جان کو کیوں بتا دیا تھا سب کچھ؟“ مدھم لہجے میں بولتے ہوئے عارش نے اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی جو ہوا سے بکھرتے تراشیدہ بالوں کی اوٹ میں تھا۔
”انھوں نے فون کیا تھا، میں نے ان سے ایسی کوئی بات نہیں کی مگر جب انھوں نے تمہارا پوچھا تو میں

جھوٹ نہیں بول سکی، تم اتنی رات تک باہر نہیں رہتے ہو وہ تم سے بات کرنا چاہ رہے تھے اس لیے مجھے سب بتانا پڑا تھا۔“ رات کی تاریکی میں مدھم ہوتیں ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتی وہ ہلکی آواز میں بولی تھی۔
”مجھے بہت شرمندگی ہے خرمین! میں نے اوور ری ایکٹ کیا تھا، میں بہت خوش تھا تمہارے لیے، مگر میں نے اپنے ساتھ ساتھ تمہاری خوشی کو بھی ملیا میٹ کر دیا۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ اتنا ہی بول سکا تھا۔

”تم نے کچھ غلط نہیں کہا تھا، اسی دن کے لیے میں نے چاہا تھا کہ تم اپنا فیصلہ بدل ڈالو، آج پچھتانے سے تو بہتر تھا کہ تم...!“

”ایسا تم کو خرمین!“ اسے دھچکا لگا تھا جو فوراً اسے روک گیا تھا۔
”میں مانتا ہوں کہ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا مگر جن سے محبت ہوتی ہے شکایت بھی تو ان سے ہی کی جاتی ہے۔“

”مجھے کیا معلوم محبت میں کیا ہوتا ہے کیا نہیں، میں کیا جانوں ان جذلوں کو؟“ تن لہجے میں بولتے ہوئے اس نے عارش کو دیکھا تھا۔
”بھی کبھی سوچتا ہوں کہ اچھا ہی ہے کہ تم انجان ہو محبت کے اندھیرے جالوں سے، تمہاری زندگی تمہاری سانسوں پر صرف تمہارا اختیار ہے۔“ مدھم لہجے میں بولتا وہ اس کی پیشانی پر بکھرتے سیاہ ریشمی پردے سمیٹ رہا تھا۔

”اور کبھی شدت سے چاہت ہوتی ہے تمہاری آنکھوں میں اس جذبے کی تڑپ دیکھنے کے لیے جو میرے دل میں تمہارے لیے ہے۔“ بے پردہ مہانیم کو آنکھوں سے چومتا وہ بے اختیار ہورہا تھا۔
”بھی تو میرے دل میں جھانکنے کی کوشش کرو، کبھی تو خود میری دھڑکنوں میں شامل ہونے کا ارادہ کرو، تم مجھے یہ یقین دو کہ میں وہی خواب ہوں جو کبھی تم نے دیکھا اور خود سے بھی چھپا کر رکھا ہے۔“ اس کے چہرے کو نرمی سے چھوتا وہ اس کی سانسیں روک رہا تھا، بشکل اس سے نظر چراتے ہوئے وہ چہرے کا رخ بدل گئی تھی، گہری سانس لے کر عارش نے اس کا سر دھاتھ تھام لیا تھا۔

”اب یہاں سے اٹھو، یہ ٹھنڈا تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔“ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ اسے بھی اٹھنے پر مجبور کر گیا تھا۔
”اگر میں نے ریڈ بوجز ان کر لیا تو تمہیں نہیں لگتا کہ گھر کا نظام ڈسٹر ب ہو جائے گا۔“ کبل خود پر پھیلاتے ہوئے خرمین نے اسے دیکھا تھا جو لائٹ آف کرتا ڈریسنگ کی سمت جا رہا تھا۔
”گھر کا نظام تو ساری زندگی سنبھالتے ہی رہتا ہے، خود بخود سب سیٹ ہوتا چلا جائے گا، ہاں مگر تمہیں میری ڈسٹربنس کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے۔“ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے اس نے مسکرائی نظروں سے آئینے میں ابھرتے خرمین کے عکس کو دیکھا تھا۔
”امی تو بہت ناراض ہو رہی ہیں، انھیں لگتا ہے کہ تمہیں کہیں یہ سب ناگوار نہ گزرے۔“ بیک کراؤن سے پشت لگاتے ہوئے وہ تنجیدگی سے بولی تھی۔

”ان کا ناراض ہونا فطری ہے، تم ان کی فکر نہ کرو، میں اور ماموں جان ان کو سنبھال سکتے ہیں، تم بس اس ذمہ داری کے لیے خود کو تیار رکھو جو تمہارے سر پر آنے والی ہے۔“ عارش کے تسلی دینے پر وہ بس خاموشی سے

اسے دیکھتی رہی تھی، پر فہم کا سپرے خود پر کرنے کے بعد وہ بیڈ کی سمت آ رہا تھا۔
 ”دیر سے سو رہا ہوں، اس لیے صبح واک کے لیے تو بالکل نہیں جاؤں گا، لہذا مجھے جلدی مت جگانا اور تم بھی اب سو جاؤ، مجھے ایسی خطرناک نظروں سے دیکھنا بند کرو۔“ نیکیے پرسر رکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔
 ”سو نے سے پہلے ہیڑش کیوں کرتے ہو؟“ خرمن نے پوچھا تھا۔
 ”اس لیے کہ نیند سے جب اچانک تمہاری آنکھیں کھلیں اور تم میری طرف دیکھو تو میرے خوبصورت میئر اسٹائل سے تم نظر نہ ہٹا سکو، تمہیں امپریس کرنے کا کوئی موقع میں ہاتھ سے جانے نہیں دینے والا۔“ ایک مسکراتی نظر عارش نے اس پر ڈالی تھی جو دھیرے سے ہنسی مٹی، اگلے ہی پل وہ عارش کو حیران کر گئی تھی جب اس کے قریب ہو کر خرمن نے اس کے شانے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں۔
 ”شب بخیر!“ اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے عارش نے سرگوشی کی تھی اور پھر اپنے سینے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے پرسکون انداز میں آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☆.....☆.....☆

مغرب کا وقت سر پر آپہنچا تھا، گھر میں داخل ہوتا وہ بری طرح حواس باختہ تھا، فاروق آفس سے لوٹ آئے ہوں گے اور یقیناً عروسہ نے اس کی کشدگی کا واویلا ان کے سامنے بچا رکھا ہوگا، اب اسے اپنے باپ کے عتاب سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔
 آج کا سچ سے فری ہو کر وہ سیدھا بیلا کی طرف چلا گیا تھا، راستے میں اس نے عروسہ کو فون کر دیا تھا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ کسی کام سے جا رہا ہے، غلطی یہ ہوئی کہ بیلا کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا سیل فون آف کر دیا تھا، کیونکہ بغیر کسی ڈسٹرنس کے وہ بیلا کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔
 فاروق کی آمد کی خبر بیلا کو بھی، لہذا اس نے لپٹ پر اہتمام کر لیا تھا، دونوں نے ساتھ کھانا کھایا اور اس کے بعد دیر تک بیلا سے باتیں کرتے ہوئے جانے کس وقت وہ گہری نیند سو گیا تھا، اس کی نیند ہمیشہ سے ہی خطرناک حد تک گہری ہوتی تھی سر ہانے ڈھول تاشے بھی بچتے رہیں تو اسے کوئی خبر نہ ہوتی، گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے بیلا نے چند بار اسے جگانے کی کوشش کی تھی مگر بے سود، شام کو گھر پر عثمان کی آمد ہوئی تو اس نے ہی فاروق کو بیدار کر کے گہری طرف واپس دوڑایا تھا۔

”کہاں تھے تم اب تک، تمہیں ذرا اندازہ نہیں ہوا وقت گزرنے کا، میں یہاں فکر سے مر رہی ہوں اور تم اب آ رہے ہو؟“ عروسہ اسے دیکھتے ہی چیخ مچی تھیں مگر فاروق کا چہرہ ان کی وجہ سے تھا جو سامنے ہی کھڑے چبھتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”میں اپنے دوست کے ساتھ تھا، نظر جھکاتے وہ بمشکل بولا تھا۔

”جھوٹ مت بولو فاروق! تمہارے دوست خود تمہیں پوچھتے گھر تک آئے ہیں، ایسا کون سا دوست ہے تمہارا جس نے تمہیں گھر تک بھلا دیا۔“ عروسہ شدید غصے میں اس پر برسی تھیں۔
 ”شہر کے حالات پہلے ہی بگڑے ہوئے ہیں، میری جان اب تک سو لی پر لگی ہے، فاروق تمہاری تلاش میں تمہارے دوستوں کے گھر تک گئے ہیں، فون کیوں آف تھا تمہارا؟“

”میرا فون خود بخود آف ہو گیا تھا۔“ سر جھکائے وہ بولا تھا۔

”فاروق! مجھے سچ بتاؤ تم کہاں تھے اب تک، ورنہ میں تمہارا حشر بگاڑ دوں گی۔“ عروسہ غصے میں چیخی

تھیں۔

”کیوں سوال پر سوال کر رہی ہو اس سے؟“ فاروق کے سخت لہجے پر فاروق ان کی جانب نہیں دیکھ سکا تھا۔
 ”تم سوال کرتی رہو گی اور یہ جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہے گا، اس کے چہرے پر لکھا ہے کہ یہ کہاں تھا اور کہاں سے واپس آ رہا ہے۔“ فاروق کے ناگوار لہجے پر عروسہ نے چونک کر فاروق کو دیکھا تھا۔

”میرا ایک بات غور سے سن لو فاروق!“ فاروق کا تینہمی لہجہ مدھم مگر جدار تھا۔
 ”میرے منع کرنے کے باوجود اگر تمہیں ان دونوں سے تعلق رکھنا ہے تو اس سے پہلے کہ میں تمہیں اس گھر سے بے دخل کروں تم خود اپنا سامان سمیٹ کر ہمیشہ کے لیے ان دونوں کے پاس چلے جاؤ جو میری عزت کی دھجیاں اڑا چکے ہیں، اس گھر کے کسی فرد کو ان دونوں سے تعلق رکھنے کی اجازت میں نہیں دوں گا، جسے من مانی کرنی ہے اس کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں، یہ سب میں دہراؤں گا نہیں۔“ عیسیٰ نظروں سے اس کے جھکے سر کو دیکھتے وہ لاؤنج سے نکل گئے تھے۔

”کیوں گئے تھے تم وہاں؟ یہاں پہلے ہی کوئی سکون میں نہیں ہے، اپنے باپ کی نافرمانی کر کے تم کیوں میرا حینا حرام کر رہے ہو؟“ اس کا بازو جھوڑتے ہوئے عروسہ پھر چیخ مچی تھیں۔
 ”آپ اپنا بدل پتھر کرنے پر مجبور ہیں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا لیکن جو بد احتیاجی آج مجھ سے ہو گئی ہے آئندہ نہیں ہوگی، آپ پایا سے کہیں کہ میں شرمندہ ہوں وہ مجھے معاف کر دیں۔“ کچھ خود سری اور کچھ التجائی لہجے میں وہ ان کو راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو شدید اضطراب میں مبتلا ہو چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

شاید بی بی کے والیوم نے اس کی نیند میں خلل ڈالا تھا، غنودگی میں کروٹ لیتے ہوئے اس کی آنکھیں ذرا کھلیں اور اگلے ہی پل وہ دھک سے رہ گئی تھی، ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے اس نے اپنے ارد گرد دیکھا تھا، وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی، بلکہ کمرے سے باہر صوفے پر موجود مگر وہ یہاں تک کب اور کیسے آ پہنچی؟ حق درق نظروں سے اس نے خالی میٹرز کو دیکھا تھا، عثمان یقیناً بیدار ہو چکا تھا کیونکہ مکن سے ٹھٹ پٹ کی آوازیں ابھر رہی تھیں، غائب دماغی سے چلتی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی پہلی نظر بیڈ تک گئی تھی، نیکیے کے پاس رکھا اس کا دوپٹا اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ حسب معمول کل رات بھی سوئے سے پہلے اس نے دوپٹا اپنے سر ہانے رکھا تھا اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ بیڈ پر ہی سوئی تھی اس میں کوئی شک نہیں تھا، اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔

بھاپ اڑاتی چائے کنگ گلاس ٹیبل پر رکھنے کے بعد اس نے ٹیبل صوفے کے قریب سرکائی تھی، اور پھر ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی جو بالکل بے تاثر چہرے کے ساتھ کمرے سے باہر آ رہی تھی۔

”آج تم دیر تک سوئیں، میں نے سوچا تمہیں ڈسٹرب کرنے کے بجائے خود ہی ناشتہ تیار کر لوں، اب تم یہ آلیٹ کھاؤ اور پھر بتاؤ کیا بتا ہے؟“ خوشگوار انداز میں بولتے ہوئے عثمان نے پلیٹ اس کے سامنے کی تھی جو گہری خاموشی کے ساتھ صوفے کے کنارے ٹک گئی تھی، بی بی اسکرین کی جانب بظاہر وہ متوجہ تھا مگر اس کی ساری توجہ بیلا کی طرف تھی، جس کی غیر معمولی خاموشی کو آسانی سے محسوس کیا جاسکتا تھا، چائے کے سب لیتے ہوئے بھی وہ جانے کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”کل رات بہت جس تھا، شاید تم بھی گری سے گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔“ عثمان کے سرسری

”عارش اس وقت مل سکتے ہیں یا نہیں؟“ ہارون کے خشک لہجے نے میزہ کو کچھ خائف کیا تھا۔
 ”آئیے...“ کچھ روکھاں سے بولتی وہ آگے بڑھ گئی تھی، جبکہ ان دونوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔
 آفس میں اس وقت عثمان بھی موجود تھا، عارش نے ان دونوں کا بہت گرجوٹی سے استقبال کیا تھا، اور اس
 اچانک آمد پر خوشگوار حیرت کا اظہار بھی۔

”ایک یہاں آنے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا مگر میں نے اسے کہا تھا کہ میرے ساتھ چلنا، آج
 میرے پاس ٹائم تھا سو تمہیں ڈسٹرب کرنے سے بچنا۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے عارش سے کہا تھا۔
 ”کوئی ڈسٹرب نہیں کیا، ایک کے بہانے آپ کو بھی یہاں دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا ہے۔“ عارش نے کہا
 تھا۔

”میں تو آپ کو یہاں دیکھ کر حیران ہوں، کم از کم آپ میرے دیدار کے لیے یہاں تک نہیں آ سکتے تھے۔“
 عثمان نے کہا تھا۔

”تمہارا دیدار تو ہم روز ہی ریڈیو پر کرتے ہیں، تم تو وہاں کی رونق ہو مگر یہاں ہمارے آنے کی وجہ چھوٹے
 بجائی صاحب بنے ہیں، یہ عارش کو اپنی دوستی کا اعزاز دے چکے ہیں۔“

”اچھا تو تم مجھ سے میرا دوست چھیننے کی نیت رکھتے ہو۔“ عثمان نے خشکیں نظروں سے ایک کو دیکھا تھا۔
 ”آپ ایسا ہی سمجھ لیجیے۔ ایک ہٹا تھا۔“

”کیا خیال ہے ایک! یہاں ایڈیشن لینے کا ارادہ ہے؟ ہماری دوستی اور مضبوط ہو جائے گی۔“ عارش نے
 پوچھا تھا۔

”ہرگز نہیں، پھر تو مجھے آپ کا بہت زیادہ احترام کرنا پڑے گا۔“ ایک نے فوراً کہا تھا۔
 ”عارش! میری طرف سے تو تم زبردستی اسے یہاں ایڈجسٹ کر لو، کوئی تو ڈھنگ کا کام کرے گا یہ۔“

ہارون نے کہا تھا۔
 ”وہی میں اس بارے میں سوچ سکتا ہوں، کیونکہ اس انٹینیوٹ کا ماحول بہت انٹرننگ بھی ہے اور کافی
 کرفل بھی۔“ شرارتی لہجے میں بولتے ہوئے ایک نے ایک نگاہ دائیں جانب گلاس ٹیبل کے گرد بیٹھی میزہ کو

دیکھا تھا جبکہ عارش کے ساتھ عثمان نے بھی حیران نظروں سے اس کی نظروں کے تعاقب میں میزہ کو دیکھا تھا جو
 اپنے پیچہ زکوٰۃ تیب دینے میں الجھی ہوئی تھی۔

”ایک! بہت زیادہ بولتے ہو تم، تہذیب کے دائرے میں رہو۔“ ہارون نے اس کی بے باکی پر شرمندہ
 ہو کر ڈانٹا تھا۔

”آپ میرے دوست کو مت ڈانٹیں کیونکہ مجھے صرف اس کا مسکراتا چہرہ اچھا لگتا ہے۔“ ایک کے لٹکے
 چہرے پر عارش نے ہارون کو تلقین کی تھی اور دوبارہ ایک کو دیکھا تھا۔

”وہ میری کزن ہیں۔“ عارش کی اطلاع ایک کا رنگ اڑا گئی تھی۔
 ”آئی ایم سوری!“ اس نے فوراً معذرت کی تھی۔

”ہارون! آپ کے پاس ایسے کتنے بھائی ہیں؟“ عثمان نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔
 پیچہ زکوٰۃ تیب دیتے ہوئے وہ ان چاروں کی آوازیں بھی سن رہی تھی جو صوفوں پر براجمان باتوں میں
 مشغول تھے تب ہی ایک بار پھر اسے اپنے چہرے پر کوئی چیز محسوس ہوئی تھی، چونکہ کراس نے سر اٹھایا تھا پہلی

لہجے پر بری طرح چوکتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگی تھی، عثمان نے خاص طور پر اس کے بدلتے تاثرات نوٹ کیے
 تھے۔

”ہاں، بہت گھٹن محسوس ہو رہی تھی کمرے میں۔“ اس سے نظر ملائے بغیر وہ کھٹی کھٹی آواز میں بولی تھی، چند
 لمحوں کے لیے عثمان اس کے زرد ہوتے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا تھا، ایک پل کو اس نے چاہا تھا کہ وہ بیلا سے
 پوچھے کہ وہ کیوں جھوٹ بولنے پر مجبور ہے؟ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا، کل رات موسم میں زدہ بالکل نہیں تھا۔

کل رات میں یہ تیسری بار تھا کہ جس میں اس نے بیلا کو نیند میں چلتے دیکھا تھا، پچھلی بار کی طرح کل رات
 بھی اس نے کمرے کا ایک چکر لگا یا تھا، عثمان خاموشی سے اس کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا تھا، کل رات بس یہ
 ہوا تھا کہ وہ واپس اپنے کمرے کی طرف نہیں گئی تھی، وہیں صوفے پر دراز ہو گئی تھی، یہ اتفاق ہی تھا کہ عثمان صحن

کے باوجود فوراً نہیں سو سکا تھا اسی لیے یہ سب اس کی نظروں میں پہلے کی طرح کل رات بھی آ گیا تھا، پہلی بار
 کے بعد عثمان نے دوبارہ اسے نیند میں چلتے دیکھ کر مخاطب نہیں کیا تھا، کل رات اسے صوفے سے اٹھا کر واپس
 کمرے میں پہنچانے کا ارادہ بھی اس نے ترک کر دیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ بیلا خود اس چیز کو محسوس کرے، اپنی پرابلیم

کو اس سے شیئر کرے مگر اس وقت عثمان کو یقین تھا کہ بیلا کو اگر وہ اس بارے میں کچھ بتائے گا تو آج بھی وہ
 اسے غلط قرار دے ڈالے گی، حالانکہ اس کے چہرے سے اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ اپنے بارے میں بہت
 مفلوک ہو چکی ہے، مگر وہ اس کے سامنے حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نظر نہیں آ رہی تھی، وہ حقیقت جسے یہ نہیں

وہ خود سے چھپائے رکھنا چاہتی تھی یا پھر عثمان سے، بہر حال جو بھی تھا عثمان اس کے لیے پہلے سے زیادہ تشویش
 میں مبتلا ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆
 اسٹیرز سے اترتے چند اسٹوڈنٹس سے نظر ہٹا کر اس نے ریپشن کی جانب دیکھا تھا۔

”ریپشن تو خالی ہے، اب کیا کریں؟“ ایک نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی
 سامنے لپ کے کھلتے گلاس ڈور کی جانب جہاں سے وہ کافی تعداد میں پرنٹ آؤٹس ہاتھوں میں سنبھالے باہر
 نکل رہی تھی۔

”ایکسپوزی؟“ عقب سے ابھرتی بھاری گھیسر آواز پر وہ بری طرح چونک کر پلٹتی ان دونوں کی طرف متوجہ
 ہوئی تھی، ایک کی پر شوخ نگاہیں میزہ کا جائزہ لے رہی تھیں جبکہ وہ خود سیاہ لباس میں ملیوں ہارون کی رعب دار
 شخصیت سے مرعوب ہوئی اس کی جانب متوجہ تھی۔

”یہاں ان کا ایڈیشن کروانا ہے، اس کے لیے کس سے ملنا ہوگا ہمیں؟“ ہارون کی سمت اشارہ کرتے
 ہوئے ایک یقیناً غیر سنجیدہ تھا جبکہ میزہ نے حیران نظروں سے اس بلند قامت شخص کو دیکھا تھا۔

”عارش سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ ایک خشکیں نگاہ ایک پر ڈال کر وہ میزہ سے مخاطب ہوا تھا، جس نے
 کچھ الجھ کر ایک کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تھا۔

”ایڈیشن کے لیے آپ کو سراسر سے ملنا پڑے گا مگر ابھی وہ گلاس لے رہے ہیں، آپ کو کس کو رس کے لیے
 ایڈیشن لینا ہے؟“ سنجیدہ سوالیہ نظروں سے میزہ نے ان دونوں کو ہی دیکھا تھا۔

”وہی کورس جس کی کلاسز آپ لیتی ہیں۔“ ایک فوراً ہی بولتا اسے دنگ کر گیا تھا۔
 ”تم خاموش رہو گے یا نہیں؟“ اس بار ہارون نے ایک کو گھر کننا ضروری سمجھا تھا۔

☆.....☆.....☆
 ایڈیشن لینے کے لیے آپ کو سراسر سے ملنا پڑے گا مگر ابھی وہ گلاس لے رہے ہیں، آپ کو کس کو رس کے لیے

ایڈیشن لینا ہے؟“ سنجیدہ سوالیہ نظروں سے میزہ نے ان دونوں کو ہی دیکھا تھا۔
 ”وہی کورس جس کی کلاسز آپ لیتی ہیں۔“ ایک فوراً ہی بولتا اسے دنگ کر گیا تھا۔
 ”تم خاموش رہو گے یا نہیں؟“ اس بار ہارون نے ایک کو گھر کننا ضروری سمجھا تھا۔

نظر اس مقام پر کشش رکھنے والے شخص پر ہی گئی تھی، مگر ان چاروں میں سے کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ سرجھٹکتے ہوئے وہ دوبارہ پیچر کی طرف متوجہ ہو گئی تھی، کچھ دیر بعد عثمان اس کی طرف آیا تھا اور کوئلہ ڈرنک کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”کیا یاد کرو گی، اپنا دل مار کر میں نے آدھا گلاس بچایا ہے تمہارے لیے۔“

”اس احسان کی بھی کیا ضرورت تھی، یہ بھی انڈیل لو اپنے حلق میں۔“ میزہ نے خشکیں نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”ایسی غیروں والی باتیں مت کرو میزہ! تکلیف ہوتی ہے دل کو۔“ اس کے غیر سنجیدہ انداز پر میزہ نے اسے دیکھا تھا جو جانے کے لیے پلٹ چکا تھا۔

”ڈوب کر مر جاؤ۔“ بے ساختہ بپتے ہوئے میزہ یکدم رکی تھی، ہارون کی نظریں اپنے چہرے کی جانب دیکھ کر اس کی ہنسی غائب ہوئی تھی، وہ فوراً ہی عثمان کی جانب متوجہ ہو گیا تھا، مگر میزہ کو اب تک کوئی چیز اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی، یقیناً وہی پریش نگاہیں جو کچھ دیر پہلے بھی اسے چوکنے پر مجبور کرتی رہی تھیں، دھڑکتے دل کے ساتھ وہ کسی بھی جانب دیکھے بغیر آس سے نکل گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

میرس کی نیم تاریکی میں سرد ہوا کے جھوٹے اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے اس نے آسمان کو دیکھا تھا، آدھا چاند اسے ہر طرح سے مکمل روشن اور جگمگاہیں لٹاتا دکھائی دے رہا تھا، آسمان پر بچے لائق دستارے اسے آہستہ آہستہ اتر کر اپنے ارد گرد فضا کرتے دکھائی دے رہے تھے، پہلی بار اسے یہ دنیا بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی، شاید اس لیے کہ اس کے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔

”بس آج کی رات گمنامی کی ایک آخری رات ہوگی، بس آج کی رات اور محرومیوں میں سانس لے لوں، اس کے بعد کبھی پلٹ کر ان بے نام و نشان راستوں پر اپنے قدموں کے نقش تلاش نہیں کروں گی۔“ دل کو یقین دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی چمک اٹھی تھی۔

”اس رات کے اختتام تک تمام محرومیاں تمام دکھ درد مجھے ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دینے پر مجبور ہوں گے، کل کا سورج ایک نئے طور سے طلوع ہو کر میری دنیا میں اپنی کرنیں بکیرے گا، اس دنیا میں سب کچھ ہوگا جو مجھے بھی اذیت میں مبتلا نہیں کرے گا، وہ سب کچھ ہوگا میرے لیے جس کے خواب دو عظیم مہربان ہستیوں نے میرے لیے دیکھ رکھے ہیں۔“ وہی دو محبتوں اور شفقتوں کے پیکر جو دور ہو کر بھی اس کے دل کے ہر کونے میں موجود تھے، ان کا دیا ہوا اعتماد ان کی دعا کی ہر لمحہ اس کے ساتھ رہنے والی تھیں۔

گہری پرسکون سانس لے کر اس نے دوبارہ آسمان کی رونقوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا، آج اسے یقین تھا کہ اس کی زندگی اس کا وجود باعثِ ذلت نہیں، قابلِ فخر ہے، یہ زندگی اس کے لیے ایک نعمت اور اللہ کا تحفہ ہے اور اب اسے اس تحفے کی قدر کرنی تھی۔

”بابا! آپ کی بیٹی کے پاس آپ جیسا دل اور حوصلہ نہیں ہے مگر آپ جیسا عزم ضرور ہے۔“ دل ہی دل میں وہ احمد حسین سے مخاطب تھی۔

”آپ جیت گئے، آخر کار آپ نے میرے قدموں کو دنیا کے ساتھ چلنا سکھا ہی دیا۔“

آؤیشن میں سلیکٹ ہو جانا اس کے لیے حیران کن تھا، بلاشبہ اس کا میاں میں اس کی محنت سے زیادہ عثمان

کی سپورٹ نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا، آج اس کی ٹریننگ مکمل ہو گئی تھی، تمام اسرار اور رموز اسے ازبر ہو چکے تھے، بہت اچھے ماحول کو آ پٹیو اسٹاف سے اس کا سابقہ بڑا تھا، اس کی ڈائرکٹر بھی اسے بہت پسند کرنے لگی تھیں، چند ہی دنوں میں وہ اس ریڈیو اسٹیشن میں سب سے کھل گئی تھی مگر ایک شخص کے علاوہ۔ ہارون نے اس کا آؤیشن لیا تھا اور اپنے انداز سے اس کی رہنمائی کرنے کے بعد اس کے لیے ناپسندیدہ ہستی بھی بن چکا تھا، ٹریننگ کے دوران چند ایک بار سرسری سا آمینا سامنا ہارون سے ہوا تھا، مگر ہر بار ہی اس پر نظر پڑتے ہی وہ عجیب جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہوتی تھی، وہ دیکھ چکی تھی کہ عثمان سے ہارون کے تعلقات کتنے اچھے ہیں اور اسے یہ بھی پسند نہیں آیا تھا، لیکن وہ نظر انداز کر کے اس کام کی طرف متوجہ رہی تھی جس کے لیے اسے ریڈیو بلایا گیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خرمن بس اسے دیکھ کر رہ گئی تھی جو ہنوز سلیپنگ ایکسپریس میں سوار جانے کہاں سے کہاں نکل چکا تھا۔

وہ آج بہت خوش اس لیے بھی تھی کہ کل اس کا پہلا پروگرام آن ایئر جانے والا تھا، اسٹوڈیو کی ہاٹ سیٹ اور مائیک اس کے منظر تھے، عارش جانتا تھا کہ وہ بہت خوش ہے، وہ اس کی خوشی میں شریک اس کا حوصلہ بھی بڑھاتا رہا تھا، مگر نیند کو خود پر حاوی ہونے سے روک نہیں سکا تھا، قصور خرمن کا ہی تھا، ریڈیو سے واپس آ کر وہ اتنی تفصیل سے سب کچھ اس کے گوش گزار کرتی کہ اسے روز سننے سننے عارش اب واقعی اس ریڈیو نامے سے بیزار ہو چکا تھا، آج تو حد ہو گئی تھی، گھر میں داخل ہوتے ہی عارش کو اندازہ ہو گیا تھا کہ خرمن بہت زیادہ ایکسائٹڈ ہے اپنے کل کے لائیو شو کے لیے کھانے کے دوران وہ بے مکان بولتی رہی تھی، اپنے گھومتے سر کو سنبھالتے ہوئے وہ توجہ سے اسے سنتے ہوئے فیصلہ کر چکا تھا کہ مناسب یہی ہے کہ وقت سے پہلے سو جانا چاہیے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا، نیند کی وادی میں اترتے ہوئے بھی اس کی سماعتوں سے خرمن کی جوبات مگر ان کی وہ یقیناً ریڈیو کے حوالے سے ہی تھی۔

اسے تو نیند آنی مشکل تھی مگر کروت بدلتے ہوئے اسے عارش پر شدید تاؤ آیا تھا، اس کی گہری نیند نے خرمن کو جلیس کر دیا تھا، ایک پل کو تو جی چاہا تھا کہ اسے جھجھوڑ کر جگادے مگر مدھم سرخ روشنی میں بے سدھ گہری نیند میں ڈوبا وہ اتنا معصوم اور اچھا لگ رہا تھا کہ خرمن کو اس پر رحم آ گیا تھا اور شاید پیار بھی، اس کے شانے پر دھیرے سے سر رکھتے ہوئے وہ خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس کا سارا جوش و خروش اس وقت مانند پڑ گیا تھا جب پروگرام شروع ہونے سے چند منٹ پہلے ہی اس نے ہارون کو وہاں موجود پایا تھا، مگر اسے کسی بھی طرح نظر انداز کر کے خرمن کو خود کو کمزور کھنا تھا کہ بہر حال یہاں اس کے ساتھ ساتھ عثمان کی عزت کا بھی سوال تھا، بہت ساری بیسٹ و شزر کے ساتھ بلا خراس نے اسٹوڈیو میں اپنا پہلا قدم رکھ دیا تھا، کل ہی اس نے عثمان کے مشوروں کے ساتھ آج کے پروگرام کے لیے ایک بہت اچھا اور دلچسپ ٹاپک بھی رکھ لیا تھا، وہ ہر طرح سے تیار اپنا مائیک آن کر چکی تھی، بیک گراؤنڈ میوزک اشارت کرتے ہوئے اس نے اپنا ہیڈ فون ٹھیک کرتے ہوئے شیشے کے پار آریٹنگ روم میں موجود عثمان کو سب ٹھیک ہے کا اشارہ دیا تھا، وہاں ہارون بھی موجود تھا مگر خود کو لائق ہی ظاہر کر رہا تھا، خرمن کے گریز اور اسے لیے اس کی ناپسندیدگی کو وہ محسوس کرتا تھا اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ خرمن اس کی وجہ سے ڈسٹرب یا کنفیوژ ہو، لیکن پھر بھی وہ خرمن کی جانب متوجہ ہونے سے آج بھی خود کو روک نہیں پا رہا تھا، آؤیشن کے دن پہلی بار اسے دیکھنے کے بعد

UHU®

stic glue stick

The exclusive
screw cap
prevents
the glue
from drying.

UHU®
stic
glue stick
lapiz
adhesivo

solvent
free
sin
disolven-
tes

UHU The World of Adhesives

سے اب تک وہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس لڑکی میں ایسی کون سی کشش ہے جو اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، اس وقت بھی اسلن کمر کے نفیس اسکارف میں قید اس کا چہرہ ہارون کو کسی اور جانب دیکھنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا، ہارون کے لیے یہ سچ بے چینی کا سبب بھی تھا کہ ریڈیو اسٹیشن سے باہر یہاں تک کہ اپنے گھر میں بھی وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا تھا، خرمن کے بارے میں اسے بس اتنا پتا چلا تھا کہ وہ عثمان کی ریشمی بیوی ہے، مگر وہ اس کے بارے میں اور بھی زیادہ جاننا چاہتا تھا، شاید وہ اس کے لیے دنیا میں واحد ایک ایسی لڑکی تھی، جس سے بات کرنے کے لیے وہ بے تاب تھا، مگر فطری جھجک اور اپنی ریزرو سچر کے باعث وہ خود سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا، جبکہ اسے اندازہ بھی تھا کہ خرمن جان بوجھ کر کتراتا ہے، آج وہ خاص طور پر خرمن کے پہلے پروگرام کی وجہ سے یہاں آیا تھا مگر وہ تو اس کی جانب دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔

بہت کامیابی کے ساتھ اس نے شو کے دو گھنٹے مکمل کیے تھے، ٹاپک سے ہٹ کر بھی لسرز کا بہت زبردست رسپانس ملا تھا، آج اسے کالز نہیں لینی تھیں، مگر میسجز لائیو پڑھتے ہوئے اس کا اعتماد مزید بڑھ گیا تھا، پلے لسٹ اس کے لیے عثمان نے ہی ترتیب دے رکھی تھی، سائن آؤٹ کر کے جب وہ اسٹوڈیو سے باہر آئی تو اس کے قدم زمین پر نہیں تھے، سب سے مبارکباد وصول کرتے ہوئے اس نے عثمان کی تلاش میں نظریں دوڑائی تھیں، آپریٹنگ روم سے وہ ہارون کے ساتھ ہی اس کی طرف آ رہا تھا۔

”کتنا پوٹی ہو تم، آدھے شہر کو پکا دیا تم نے“۔ عثمان جس طرح بولا تھا وہ اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھی جبکہ ہارون کی نظریں اس کے ہنستے چہرے پر ساکت ہو گئی تھیں۔

”بہت اچھا شو گیا ہے آپ کا، مجھے یقین ہے کہ آپ کے لسرز میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا“۔ سنجیدگی سے مسکراہٹ کے ساتھ ہارون نے اسے مخاطب کیا تھا۔

”تھینک یو!“ زبردستی کی خوش اخلاقی سے خرمن نے اتنا ہی کہا تھا اور فوراً ہی سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

”شرمندہ کر دیا تم نے مجھے ہارون کے سامنے، کیا ہو جاتا اگر تم کچھ دیر اس سے بات کر لیتیں؟ آخر وہ تمہاری وجہ سے یہاں آیا تھا مگر تم نے ابھی سے پروفیشنل جیسی اپنے اور اس کے درمیان کھڑی کر دی ہے“۔

لفٹ سے باہر آتے ہوئے بھی عثمان مسلسل اس پر ناراض ہو رہا تھا۔

”مجھے اس سے کوئی جیسی وغیرہ نہیں ہے، مجھے یہاں کس سے کتنی بات کرنی ہے میں جانتی ہوں، نہ میں کسی کی خوشامد اس لیے کر سکتی ہوں کہ وہ مجھ سے کتنا سینئر ہے نہ ہی اس لیے کسی کے آگے پیچھے پھر سکتی ہوں کہ وہ فیورٹ بر سیلٹیٹی ہے“۔ وہ ناگواری سے بولتی عثمان کو زچ کر گئی تھی۔

پارکنگ میں عارش کے ہمراہ پیلا اور نیزہ بھی اس کے استقبال کے لیے موجود تھیں، خرمن سے پہلے ہی وہ اس تک پہنچ گئی تھیں۔

”دل خوش کر دیا تم نے، ہم تمہارا پروگرام سنتے ہوئے ہی یہاں تک آئے ہیں“۔ نیزہ اس کے گلے لگتی

خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

”خرمن! میں تو تمہاری آواز ہی نہیں پہچان سکتی تھی، کتنا زبردست ساؤنڈ کر رہی تھی“۔ پیلا مزید بھی کچھ کہہ

رہی تھی جسے سنتے ہوئے خرمن کی نظر عارش تک گئی تھی جو سینے پر ہاتھ باندھے لیوں پہ دم مسکراہٹ سجائے جگمگاتی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا، وہ اب اپنے سیل فون پر آئی کال ریسپونڈ کر رہی تھی جبکہ عارش اپنی طرف

آتے عثمان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

(جاری ہے.....)

میں پیشیا کی قیرا



سڑک کے کنارے واقعہ چائے کے ہوٹل میں بیٹھے اس وقت یہ لوگ تاش کے پتے کھینے میں مشغول تھے، خالد کی انٹری پر ان لوگوں کو اپنا کھیل روکنا پڑا۔

”یہ دیکھو کیا لایا ہوں میں۔“ خالد نے بڑے فخر سے ارشد کی طرف کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”واہ... میرے یار! تو نے کمال کر دیا۔“ ارشد نے کاغذ پر نظر دوڑا کے جوش سے کہا۔

”مگر تجھے اتنے سارے نمبرز ملے کہاں سے؟“ وہ حیرانگی سے بولا۔

”اف... ایک تو ارشد! تو بھی ناں، آم کھا پیڑ کیوں گن رہا ہے؟“ خالد نے لا پرواہی سے کہا۔

”صرف یہ عنایت ارشد پر ہی... ہم بے چاروں کا آخر کیا قصور ہے؟“ عرفان نے اپنی اور سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خالد سے شکوہ کیا۔

”ارے نہیں یار! 15/16 نمبرز ہیں ہم چاروں آپس میں مل بانٹ کر کام چلائیں گے۔“ خالد نے اپنی ایک آنکھ دباتے ہوئے جواب دیا، اس کی کام چلانے والی بات پر ان لوگوں نے ایک جاندار ہتھکڑی لگا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”اور سنا! کیسا ہے، سب ٹھیک چل رہا ہے ناں؟“ آج بھی یہ دونوں اپنے من پسند چائے کے ہوٹل پر مخصوص ٹیبل پر براجمان تھے۔

”یار! باقی دو نے شروع میں نخرے دکھائے، مگر اب میسج کا Reply کر دیتی ہیں، کچھ ہی دنوں میں پوری طرح لائن پر آ جائیں گی، مگر ایک بڑی ہی ڈھیٹ ہے، پچھلے پندرہ دنوں سے لگا تار میسج کر رہا ہوں، موبائل آن ہے مگر پھر بھی

اب تک نو رسپانس۔“ ارشد، خالد کے سوال کا اشارہ سمجھتے ہوئے بتانے لگا۔

”کیا یار! تو ابھی تک بچوں کو نہیں پٹا سکا۔“ خالد نے حیرانگی سے کہا۔

”میں تو آج تم لوگوں کے لیے اور نئے نمبرز لایا تھا، میں سمجھا تھا تم لوگ بور ہو گئے ہو گے، پرانی والیوں سے، مگر یہاں تو پرانی والی ہی نہیں پٹیں۔“ خالد نے بیزارگی سے کہا۔

”میری والیاں تو ایسی چپکلی ہیں، میں تو پریشان ہو گیا ہوں، سمجھ ہی نہیں آتا، کس نام کس سے بات کروں، تم لوگوں کے بھائی کے پیچھے بچیاں پاگل ہیں۔“ اس نے اپنے کارل اوپن کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو اب اپنا دل چھوٹا نہ کر، آ جائے گی تیری وہ خرابی پری بھی قابو میں، میں چائے منگواتا ہوں۔“

”خالد! جانی یار! تو مجھے دے نئی بچیوں کے نمبرز، میں تو ان پرانی والیوں سے سخت بیزار آ گیا ہوں۔“ سلیم نے برا سامنے بناتے ہوئے کہا۔

”یہ لے میرے یار! کیا یاد کرے گا، کس دوست سے پالا پڑا ہے۔“ خالد نے اپنی جیب سے کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔

”ویسے یار! تو سچ بتا آخر تیری یہ لائری نکل کہاں سے رہی ہے؟“ کاغذ پر درج کئی نئے نمبرز دیکھتے ہوئے سلیم نے حیرانی سے پوچھا۔

”یار! پہلے تو ہوا میں تیر چھوڑتے تھے، Wrong Calls کرتے تھے، تب جا کے کسی لڑکی کا پتہ چلتا تھا، پھر کہیں جا کے ہم بے چاروں کا کام بنتا تھا، مگر اب اپنے محلے کی بیٹنس لوڈ کرنے والی دکان سے سینگ کر لی ہے، بس کچھ پیسوں میں اب اپنا پکا کام ہو جاتا ہے۔“ وہ

چوڑا ہو کے اپنا کارنامہ ان لوگوں کو بتا رہا تھا۔
 ”واہ یار! تو تو چیتا نکلا“۔ سلیم نے پر جوش انداز میں اس کا کندھا تپتہ کیا۔
 ”بس جانی! ہماری لمپنی میں رہو گے تو مزے ہی مزے“۔

☆.....☆.....☆

”شاء! تم مجھے بہت دنوں سے پریشان لگ رہی ہو، کیا بات ہے یار؟“ حریم پچھلے کئی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ شاء کچھ پریشان ہے۔
 ”حریم! اوہ.....! شاء کہتے کہتے رکی۔“

”کیا بات ہے مجھ سے ڈسکس کرو“۔ حریم نے اسے ہمت بندھاتے ہوئے کہا، وہ جانتی تھی شاء بہت کم گولڑکی ہے، یہ دونوں بہت اچھی دوستیں تھیں، مگر پھر بھی حریم کو شاء کی اکثر باتیں خود ہی سمجھنی پڑتی تھیں، اسے اپنی feelings شیئر کرنا نہیں آتی تھیں، نہ ہی وہ کسی سے اپنی پرابلمز خود ڈسکس کر سکتی تھی۔

”حریم! پچھلے کچھ دنوں سے مجھے Wrong Calls آ رہی ہیں، میں تنگ آ گئی ہوں، دن میں کئی کئی فون کالز پتہ نہیں کتنے میسجز آ رہے ہیں اور پھر اسے یہ بھی پتہ ہے کہ میں لڑکی ہوں اور کس محلے میں رہتی ہوں“۔ جب سے Wrong Calls اور میسجز کا سلسلہ شروع ہوا تھا، تب سے وہ بہت پریشان تھی، وہ ذرا ذرا سی بات پر کانپ جانے والی لڑکی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، بھائی سے بات کرے تو پتہ نہیں ان کا کیاری ایکشن ہو، اور ای کو بتا کر وہ انھیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، آج مریم نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے اپنی عادت کے برخلاف فوراً ہی وجہ بتادی۔

”اف... پاگل لڑکی! تم اتنی سی بات پر اتنا

پریشان ہو، اتنی سی بات کے لیے تم نے اپنا خون خشک کر رکھا ہے“۔ حریم نے غصے اور دکھ کا ملا جلا تاثر لیے اسے گھورا۔

”آج کل تو یہ بہت عام سی بات ہے، آوارہ لڑکوں کا کام ہی یہی ہے، دوسروں کی بہنوں اور بیٹیوں کی زندگی عاجز کرنا، کوئی ان کی بہنوں کے ساتھ ایسا کرے تب انھیں پتہ چلے“۔ حریم نے تلخ ہوتے ہوئے کہا۔

”یار! اسے یہ بھی پتہ ہے کہ میں لڑکی ہوں اور کہاں رہتی ہوں“۔ شاء کو ابھی تک اسی بات کی پریشانی لاحق تھی۔

”یار! تم اسے کوئی Response نہیں دے رہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ تم ایک لڑکی ہو، کوئی لڑکا تو اس طرح ڈر کے نہیں بیٹھ سکتا، اور رہی بات تمہارے محلے کا پتہ ہونے کی تو سوطریقے ہیں نمبر اور لوکیشن ٹریس کرنے کے، تم پریشان مت ہو، غلطی سے بھی Reply نہ کرنا، جب تم کوئی Response نہیں دو گی، تو خود ہی تھک ہار کے تمہیں تنگ کرنا بند کرو گے گا اور اب اپنا موڈ اچھا کرو اور جلدی سے اٹھو! بریک ختم ہونے والی ہے، ہم نے ابھی تک لٹج بھی نہیں کیا ہے اور ہمیں فون نو کا پی شاپ سے نوٹس بھی لینے ہیں“۔ حریم نے اسے تسلی دیتے ہوئے ریلیکس کرنے کی کوشش کی تھی۔

کینٹین سے لٹج لے کر ان دونوں نے فون نو کا پی شاپ کی طرف دوڑ لگائی تھی، کیونکہ اگلا لیکچر شروع ہونے میں بہت کم ٹائم باقی تھا۔

☆.....☆.....☆

”اور شا! کیا حال ہے میرے یار! سب سیٹ چل رہا ہے نا؟“

”کہاں یار! بڑی ہی ڈھیٹ لڑکی ہے، ایک مہینہ ہو گیا ہے، مگر مجال ہے جو محترمہ نے

Response دیا ہو، ہونہہ..... پتہ نہیں خود کو سمجھتی کیا ہے“۔ ارشد نے جل کر کہا۔

”اوہ... تو اس کا مطلب ہے محترمہ اب تک لائن پر نہیں آئی ہیں، تو ایسا کر مجھے بتا اس کا نمبر، پھر دیکھ کیسے آتی ہے لائن پر خربلی پری، جب تک ٹو باقیوں سے ٹائم پاس کر، انجوائے کر میرے یار! خالد نے خواست سے ہنستے ہوئے کہا۔

آج بھی یہ لوگ اپنے من پسند چائے کے ہوٹل میں اپنی مخصوص ٹیبل پر براجمان تھے، ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ اسی طرح کی بے ہودہ گفتگو میں مصروف تھے۔

☆.....☆.....☆

”حریم! میرا جینا حرام کر رکھا ہے ان لوگوں نے، پہلے صرف ایک نمبر سے کال اور میسجز آتے تھے، اب کئی نمبرز سے آ رہے ہیں، سارا دن میرا موبائل بجتا رہتا ہے، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، کچھ غلط ہو گیا تو“۔ شاء، حریم کا ہاتھ پکڑے روتے ہوئے بتا رہی تھی، خوف اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

”بے وقوف لڑکی! رو رو کے اس طرح خود کو ہلکان مت کرو، کچھ نہیں ہوتا“۔ حریم نے ڈپٹے ہوئے کہا۔

”حریم! میں کیا کروں، مجھے واقعی بہت ڈر لگ رہا ہے“۔

”اوہو... شا! پلیز تم رونا بند کرو“۔ حریم نے عاجز ہوتے ہوئے کہا۔

”تم اس طرح اپنا حشر کر کے اپنا ہی نقصان کر رہی ہو، ان بے حس لوگوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں، ان کو بس اپنی انٹرٹینمنٹ چاہیے، تم ایک کام کرو، فوراً اپنا نمبر چینج کر لو، میں بھی تمھی تمہارے رسپانس نہ دینے پر خود ہی چھوڑ دے گا، مگر وہ تو اور ہی ہو گیا ہے، اللہ حساب لے ان

آوارہ لوگوں سے“۔ حریم آج شاء کو اس طرح روتے ہوئے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

”مگر میں یار! اچانک اس طرح نمبر کیسے چینج کر لوں، ابھی تو کیا تھا چینج“۔

”تم کہہ دینا کہ اس سم میں نیٹ ورک پر اہم ہو رہی ہے“۔ حریم نے حل پیش کیا۔

”ایک بات بتاؤ! تم نے کیا بھی اپنے محلے کی دکان سے بیلنس لوڈ کروایا تھا؟“ حریم نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں! میں تو اکثر محلے کی ہی دکان سے بیلنس لوڈ کرواتی ہوں“۔

”بس تو پھر اس لیے اس شخص کو یہ پتہ ہے کہ تم کس محلے میں رہتی ہو“۔ حریم نے معاملے کی تہہ تک پہنچتے ہوئے کہا۔

”مطلب وہ کیسے؟“ شاء نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”بھئی! یا تو وہ دکان دار خود ہے یا پھر اس نے تمہارا نمبر محلے کے کسی لفتنے کو بیچا ہے“۔

”کیا... ایسا بھی ہوتا ہے؟“ شاء نے حیرانگی سے کہا۔

”ہاں یار! یہاں سب کچھ ہوتا ہے، چند پیسوں کی خاطر لوگ اپنا ایمان بیچ دیتے ہیں، بے ایمانی کا بازار سرگرم ہے ہمارے معاشرے میں، پھر کہتے ہیں کہ اتنی بیماریاں کیوں آتی ہیں، مصائب کیوں ہمارے گھر کا در نہیں چھوڑتے، زلزلے کیوں اتنے آ رہے ہیں، قتل و غارت کیوں عام ہے، بے امنی کیوں پھیلی ہوئی ہے، ارے یہ سب ہمارے اعمال کا ہی نتیجہ ہے، اللہ سے سوال کرنے لگتے ہیں، مگر یہ نہیں دیکھتے کہ خود کیا کر رہے ہیں“۔ حریم ایک بار پھر رخ ہو گئی تھی۔

”اور سنو! آئندہ تم خود ان محلوں کی دکانوں

سے بلینس لوڈ نہیں کروانا، بھائی سے کہہ دینا یا آنٹی سے کہہ دینا۔“ حریم اسے تنبیہ کرنے لگی۔
”مگر یار! جب بھائی گھر پر نہیں ہوتے، تو مجبوراً مجھے خود ہی کروانا پڑتا ہے، امی کو تنگ کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

”تمہاری بات صحیح ہے، مگر یہاں لوگ دوسروں کی مجبوری سے ہی فائدہ اٹھا کے لطف اندوز ہوتے ہیں، اپنے وقتی مزے اور انجوائمنٹ کے لیے یہ لوگ دوسروں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں، ان لوگوں کی وجہ سے کتنے گھروں میں لڑائیاں ہو جاتی ہیں، بھائی اور شوہر اپنی بہن، بیوی پر شک کرنے لگتا ہے، باپ کے دل میں اپنی بیٹی کے لیے شک کا بال آ جاتا ہے، بس یار! تم آئندہ احتیاط کرنا، اور چلو! سر عمران کی کلاس کا نام ہو گیا ہے۔“ حریم نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا، پھر وہ دونوں اپنی کتابیں اور بیگ اٹھا کر کلاس روم کی طرف چل دیں۔

☆.....☆.....☆
”کب سے تمہارا فون بج رہا ہے، اٹھا کیوں نہیں رہی ہو تم؟“ ثناء کے فون پر مستقل کالز آتی دیکھ کر اس نے الجھن سے کہا۔
”وہ... وہ... بھائی! حریم کا آ رہا ہے، میں ابھی بڑی ہوں بعد میں بات کروں گی۔“ اس سے بھائی کے اس طرح پوچھ لینے پر اس کی جان نکل گئی تھی، خود کو بشکل سنبھالتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”تو تم اسے بتا دو کہ بعد میں کرو گی۔“
”جی بھائی! کہتی ہوں۔“ ثناء نے دھیمی آواز میں کہا، پھر وہ موبائل ہاتھ میں لے کے ایسے ظاہر کرنے لگی جیسے بیچ ٹائپ کر رہی ہو۔
سعیدہ بیگم (ثناء کی امی) اپنی بہن کے پاس کوئٹہ گئی ہوئی تھیں، وہ اپنے ساتھ ثناء کا نمبر لے

گئی تھیں، جس کی وجہ سے ثناء کو مجبوراً اپنا وہی نمبر آن کرنا پڑا تھا جس پر اسے Wrong Calls آ رہی تھیں، اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہ نمبر آن کیا تھا، کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے وہ موبائل سائلینٹ پر لگانا بھول گئی، اسے اس بات کی امید نہیں تھی کہ دوبارہ Wrong Calls آنا شروع ہو جائیں گی، پچھلے تین ماہ سے اس نے یہ نمبر بند کیا ہوا تھا، مگر آج اس کے دوبارہ آن کرتے ہی دوبارہ سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا، بھائی کے سامنے یہ سب ہونے پر ثناء کی جان پر بن گئی تھی، دوبارہ سے اسے پریشانی نے آن گھیرا تھا، وہ ڈھیلے قدموں سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆
”ارشدا! سن اس خربلی پری کا نمبر آن ہے آج۔“ بڑی خوشی سے اسے یہ خبر دی گئی تھی۔
”دیکھ! مجبور ہو گئی ناں نمبر آن کرنے پر، اب دیکھ کیسے لائن پر آتی ہے۔“ یہ خربلی پری ان لوگوں کے لیے باعث تجسس بنی ہوئی تھی، جہاں بھی یہ لوگ ٹرائی کرتے تو بات تو انھیں جھاڑ دیا جاتا تھا یا پھر بھرپور رسپانس ملتا، مگر یہاں معاملہ الگ تھا، یہاں مستقل خاموشی اختیار کی گئی تھی، اسی لیے ان لوگوں کا تجسس عروج پر تھا۔ اب ارشد بھی زور آزمائی شروع کر چکا تھا، مگر ہمیشہ کی طرح نورپانس مل رہا تھا۔

☆.....☆.....☆
ثناء نے انتہائی پریشانی کی حالت میں بھائی کے کمرے کی طرف رخ کیا تھا، کمرے کا دروازہ کھول کر وہ سیدھی اندر داخل ہو گئی۔
”کیا ہوا ہے ثناء! سب ٹھیک تو ہے ناں، تم رو کیوں رہی ہو؟“ ثناء کے اس طرح اچانک کمرے میں آ جانے پر اور پھر اتنی بری طرح

رونے پر وہ ٹپٹا گیا تھا، موبائل سائلینٹ پر رکھ کر ٹی وی آف کر کے وہ ثناء کی طرف متوجہ ہوا۔
نمبر دوبارہ آن کرنے کے بعد سے میسرز اور کالز میں تیزی آ گئی تھی، اب تو یہ بھی دھمکی دی جا رہی تھی کہ اگر اس نے جواب نہیں دیا، تو وہ لوگ اس کے گھر تک پہنچ جائیں گے، ثناء نے دھمکی سے خوفزدہ ہو کر بھائی کو بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔
”بھائی! وہ...!“ ثناء کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح بات شروع کرے۔

”بولو ثناء! آخر بات کیا ہے؟“
”بھائی! کوئی مجھے تنگ کر رہا ہے، پچھلے کچھ ماہ سے مجھے رائگ کالز اور میسرز آ رہے ہیں، بھائی! وہ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں لڑکی ہوں اور کہاں رہتی ہوں، بھائی! وہ لوگ یہ دھمکی دے رہے ہیں کہ وہ گھر پر آ جائیں گے، بھائی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ بشکل انک انک کر اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

”بھائی! یہ ہیں وہ نمبرز...!“ وہ ابھی ثناء کی بات سمجھنے کی ہی کوشش کر رہا تھا کہ ثناء نے اپنے موبائل کی اسکرین اس کے آگے کر دی، اسکرین پر نظر پڑتے ہی ارشد کے پیروں تلے زمین نکل گئی، ثناء کی موبائل اسکرین پر اس کا نمبر چمک رہا تھا، وہ خربلی پری کوئی اور نہیں اس کی اپنی سکی بہن تھی۔

ارشدا کا یہ نمبر وہ تھا، جو اس نے صرف اسی کام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا، چونکہ ثناء نے حریم کے کہنے پر اچھے پیکیج کے چکر میں غی سم لی تھی، ابھی اس نے یہ نمبر سب کو دیا ہی نہیں تھا کہ Wrong Calls کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اسی وجہ سے وہ دونوں اس تلخ حقیقت سے نا آشنا تھے۔

ارشدا آج الٹے منہ گرا تھا، بھائی بہنوں کا

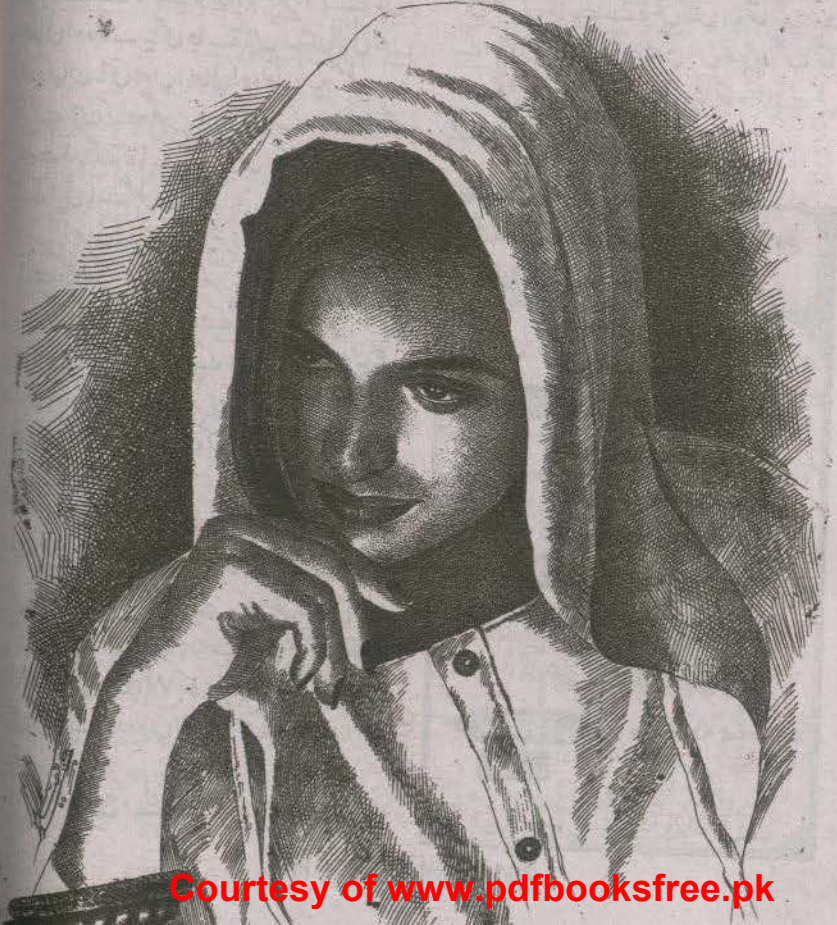
مان ہوتے ہیں، بھائی بہنوں کے تحفظ کی علامت ہوتے ہیں، گروہ تو اپنی ہی ماں جانی کی زندگی اجیرن کر رہا تھا، یہ سوچ کر ہی اس کے رونے کھڑے ہو رہے تھے کہ وہ اتنے اخلاق سے گرے ہوئے اور واہیات میسرز اپنی بہن کو کرتا تھا، اس نے کیسے اپنی بہن کا نمبر اپنے غلیظ دوستوں میں بڑے مزے سے بانٹا تھا، کیسا بے غیرت بھائی تھا وہ، آج وہ ندامت کے ایسے گڑھے میں جا گرا تھا جہاں سے اس کا اٹھنا مشکل تھا، ارشد کے ضمیر پر ایسا بوجھ آن پڑا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی بہن سے تو کیا خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا، ندامت کے سایوں نے ساری زندگی اس کا پیچھا کرنا تھا، اسے ندامت کے بوجھ تلے جینا تھا، جو اسے پل پل مارے گا۔

☆.....☆.....☆

لواؤ رڈا ڈائجسٹ کی طرف سے
ہفتوں کے لیے غریب صورت ناکوں
جنگی ہوئی رت میں
ت 150 روپے صالحو محمود
جنگی گلیاں آگلن کی
ت 500 روپے صالحو محمود
تم میرے ہو گے رہو
ت 500 روپے صالحو محمود
ویل کم بک پورٹ اردو بازار کراچی

اعتبار دہی آئی بھائی کا

”احتشام سمجھدار لڑکا ہے، میں نے اسے ساری بات بتادی تھی، اس نے یقیناً رانی کے رویے کو محسوس کرنے کے باوجود اسے درگزر کر دیا ہوگا، کل آپ خود اس سے بات کیجیے گا اور کسی طرح گھر لے آئیے گا، کیا



سوچیں گے بھائی اور بھابی کے بیٹا پہلی بار چچا کے گھر گیا تھا اور وہ اسے ٹھہرا نہیں سکے۔“ نصرت نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں بات کروں گا احتشام سے مگر تم تو رانی کی خبر لو، اس وقت سے بھوک پیاسی کمرے میں بند ہے، ذرا پیار سے سمجھاؤ اسے اور کھانا کھاؤ۔“

”جویریہ گئی تو ہے کھانا لے کر، میں دیکھتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر رانی کے کمرے کی جانب آئیں، تو جویریہ کو پانی کا گلاس لے جاتے دیکھ کر واپس پلٹ گئیں، جویریہ بھابی سے اس کی دوستی بھی بہت تھی، اس لیے انہیں یقین تھا کہ وہ اس کی بات مان جائے گی۔

”رانی! کھانا تو کھاؤ۔“ جویریہ بھابی اس کے بالوں کو سمیٹتے ہوئے پیار سے بولیں۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”بھوک تو لگ رہی ہوگی ہے ناں؟“ وہ مسکرائیں تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔



نیو کی لائبریری اینڈ فرنیچر پوائنٹ
ساؤتھسٹم اور جلد سازی کی ہولت موجود ہے
نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 13 احمدیہ لائبریری، لاہور

دوستانہ انداز میں کہا۔

”لڑکیاں بندوں پر مرمی ہیں تو اس کے بعد وہ بندے انھیں بھی تو مار دیتے ہیں، وہ ہر روز مرمی ہیں، لوجھ مرمی ہیں، ایسے شاندار بندوں کے ظلم سہہ کر۔“ رابی نے نئی سے کہا تو جویریہ بھابی نے اسے مزید کچھ سمجھانا مناسب نہیں سمجھا اور اسے سونے کا کہہ کر اس کے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

فیضان صاحب نے احتشام سے ملاقات کر کے معذرت کی اور گھر آنے پر اصرار کیا، مگر انھوں نے سہولت سے انھیں انکار کر دیا، البتہ رات کا کھانا ان کے ہاں کھانے کا وعدہ کر لیا، اور انھیں یقین دلا کر بھیجا کہ وہ ان سے رابی کے رویے کی وجہ سے ناراض نہیں ہیں، نصرت نے سنا تو خوشی خوشی رات کے کھانے کا انتظام کرنے لگیں، شازیہ اور نازیہ بھی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں، جبکہ رابی گھر میں بنے چھوٹے سے لان میں پانی لگا رہی تھی، یہ لان اس نے بہت محنت اور شوق سے بنایا تھا، گری اور دھوئیں کے باعث پھول پودے کھلا کر رہ جاتے تھے، اسی لیے وہ شام کو پانی دینے کی ڈیوٹی ادا کرتی تھی، امتحانوں کے دوران بھی اس کے ایک ہاتھ میں کتاب ہوتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا پائپ، وہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ پودوں کو پانی بھی دیتی جاتی تھی، یہ پھول، پودے اسے اپنے جتنے بھی کی طرح ہی عزیز تھے۔

”السلام علیکم!“ وہ گلاب کے پودے کو پانی دے رہی تھی کہ احتشام کی آواز نے اسے چونکا دیا، وہ جھٹ سے دائیں جانب مڑی، آسانی رنگ کی شرٹ اور سفید پینٹ میں ملبوس بلند قامت وجیہہ احتشام بہت پر خلوص مکان لمبوں پر سجائے اسے دیکھ رہے تھے۔

”بندہ تو اسارٹ ہے۔“ رابی نے دل میں ان کے دلکش سراپے کو سراہا اور پھر سلام کا جواب نرم لہجے میں دیا۔

”وعلیکم السلام!“

”کیسی ہیں آپ؟“ انھوں نے اس کے سنہری چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں ایسی ہی ہوں جیسی کہ آپ کو دکھائی دے رہی ہوں۔“ رابی نے رکھائی سے جواب دیا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے مس رابی! انسان کو اندر باہر سے ایک سا ہی ہونا چاہیے، لوگوں کی اکثریت بظاہر جو دکھائی دیتی ہے، اندر سے ویسی نہیں ہوتی، دوغلا پن انسان کی شخصیت کا حسن زائل کر دیتا ہے۔“

احتشام نے اس کے لہجے کی ناگواریت کو فراخ دلی سے نظر انداز کرتے ہوئے بہت نرم اور دھم لہجے میں کہا۔

”سنر! کیا نام ہے آپ کا، بہر حال آپ کا جو بھی نام ہے، میں کل والے رویے پر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں، غلط فہمی ہو ہی جایا کرتی ہے، لیکن ہر شخص کو غلط نہیں سمجھنا چاہیے، اس دنیا میں اچھے مرد بھی موجود ہیں۔“ انھوں نے نرمی سے جواب دیا۔

”تو ہوا کریں میری ملا سے، میں نے ان کا چار ڈالنا ہے؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی تو انھیں ہنسی آ گئی، رابی نے مسکاتی نظروں سے انھیں دیکھا تو وہ یکدم سنجیدہ ہو کر بولے۔

”مس رابی! مجھے بے حد افسوس ہے جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا برا ہوا، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ اپنے اوپر خوشیوں کے دروازے بند کر لیں، اور اس حادثے کا سوگ منائی رہیں۔“

رداؤ انجسٹ [149] اپریل 2014ء

”تو چلو شاباش کھانا شروع کرو، تمہاری یہی سادگی اور صاف گوئی ہی تو مجھے پسند ہے۔“ جویریہ بھابی نے ہنس کر کہا اور نوالہ بنا کر اس کے منہ میں دے دیا، پھر وہ خود ہی کھانے لگی، اس کی پسند کا سالن پکا ہوا تھا، نرکی کو فٹے، اس نے بہت مزے سے اور سیر ہو کر کھانا کھایا، تو کہیں جا کر اس کے اوسان بھال ہوئے، جویریہ بھابی نے جان بوجھ کر اس سے کھانے کے دوران کوئی بات نہیں کی، اسی خیال سے کہ کہیں وہ پھر سے غصے میں نہ آ جائے اور کھانا بھی چھوڑ دے۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں بھابی؟“ رابی نے انھیں اپنی طرف متوجہ پا کر پوچھا۔

”میں یہ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں کہ کیا اسی رابی نے آج گھر آئے مہمان کو بے عزت کر کے اپنے کمرے سے نکالا تھا، یقیناً نہیں آتا کہ رابی! تم ایسا رویہ بھی اپنا سکتی ہو۔“

”وہ صاحب چلے گئے کیا؟“ رابی نے شرمندگی سے پوچھا۔

”ظاہر ہے اتنی انسٹل کروا کر وہ یہاں رہنے کی حماقت تو نہیں کر سکتے تھے، تم نے تو ہم سب کو شرمندہ کر دیا! ان کے سامنے، وہ تو بہت اچھے ہیں جو غصے ہوئے بغیر شکایت کیے بغیر ہمیں تسلی دے کر چلے گئے، رابی! ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا ناں کہ وہ تمہارے کمرے میں آرام کر رہے تھے، تو ظاہر تھا کہ امی کی اجازت اور مرضی سے ہی وہ وہاں تک پہنچے تھے، میں اور امی بچن میں دوپہر کا کھانا لپکانے میں مصروف تھیں اور تم خاموشی سے کالج سے آ گئیں اور یہ بھی کہ اپنے کمرے میں چلی آئیں، ورنہ ہمارا خیال تھا کہ تم کالج سے آؤ گی، تو ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تمہارا کمرہ مہمان کے لیے سیٹ کر دیا ہے، خیر! اب تو جو ہونا تھا ہو گیا، شام بھائی کی تم نے بہت انسٹل کی ہے۔“

”مجھے احساس ہے بھابی! مگر آپ جانتی ہیں کہ میں ایسی نہیں تھی، مجھے ایک اجنبی شخص کو اپنے کمرے میں دیکھ کر غصہ آ گیا تھا، میں اپنے آپے میں نہیں رہی تھی، میں کسی مرد سے اپنا نام شیر نہیں کرنا چاہتی وہ تو پھر بیڈ پر براجمان تھا، وہ مہمان نہ ہوتا تو شاید میں اسے قتل ہی کر دیتی۔“ وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”رابی!“ جویریہ بھابی کانپ کر رہ گئیں۔

”ایک مرد کی دھوکہ دہی کی سزا ہر مرد کو دینا اور ہر مرد کو مجید سمجھ کر دیکھنا اور سوچنا اچھی بات نہیں ہے رابی! تم سمجھدار ہو کر ایسی باتیں سوچتی رہتی ہو، اب جو ہوا اسے بھول جاؤ، اور اگر اب شام بھائی گھر آئیں تو ان سے معذرت کر لیتا۔“

”وہ عقلمند ہوئے تو دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے۔“ رابی نے ہنس کر کہا۔

”وہ اگر معاملہ فہم اور کشادہ ذہن و دل کے مالک ہوتے تو دوبارہ یہاں ضرور آئیں گے۔“ جویریہ بھابی نے بہت یقین سے کہا تو احتشام کی صورت کو یاد کر کے ہنسی چلی گئی، ایک ڈشنگ اور اسارٹ بندہ کیسا حیران پریشان ہو گیا تھا۔

”ہنس کیوں رہی ہو؟“ جویریہ بھابی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ان صاحب کی ہونٹوں جیسی شکل یاد کر کے ہنسی آرہی ہے، حیرت کا جسد لگ رہے تھے موصوف۔“

”وہ تو لگنے ہی تھے، تم نے جو آفت نازل کی تھی ان پر، ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا سلوک بھی ہو سکتا ہے، اور ہاں! اپنی نظیر بھی ٹیٹ کرواواتے خوبصورت شخص کی ہونٹوں جیسی شکل صرف تم ہی کو نظر آتی ہے، ارے لڑکیاں تو مرمی ہیں ایسے شاندار بندوں پر، ایک تم ہو۔“ جویریہ بھابی نے

رداؤ انجسٹ [148] اپریل 2012ء

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سزا تو آپ کو مجھ سے اظہار افسوس فرمانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی میں کوئی سوگ منا رہی ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ شخص میرے قابل ہی نہیں تھا، اس کے نہ ہونے سے میں بہت خوش اور مطمئن ہوں، اپنی تعلیم مکمل کر رہی ہوں، اس میں سوگ کا عنصر آپ کو کہاں نظر آ گیا، اور میں نے اپنے اوپر خوشیوں کے دروازے ہرگز بند نہیں کیے، میں تو دوسروں کی خوشیوں میں بھی اپنے لیے خوشی تلاش کر سکتی ہوں، اگر آپ کا اشارہ شادی کی جانب ہے تو میں نہیں سمجھتی کہ شادی سے انسان کی ساری خوشیاں وابستہ ہوتی ہیں، جولوگ کبھی شادی نہیں کرتے کیا وہ ناخوش رہتے ہیں؟ جی نہیں، خوش رہنے کے لیے شادی کرنا قطعی ضروری نہیں ہے، اس لیے میں مزید شادی جیسے تجربے سے نہیں گزرنا چاہتی، میرے نزدیک شادی محض چاروں کی چاندنی ہے اور پھر اندھیری رات، دکھوں، غموں اور آنسوؤں کی طویل رات، کیا دیتے ہیں آپ مرد لوگ عورت کو اس کی ساری خدمتوں، محبتوں اور ریاضتوں کے بدلے میں؟ نفرت، بے وفائی اور دھوکا؟“ رانی نے بے حد سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا وہ اس کے غصے سے سرخ ہوتے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے، کائنی رنگ کے لان کے سوٹ میں وہ حد درجہ مردم بے زار دکھائی دے رہی تھی، مگر اس میں ایک عجیب سی کشش تھی، جو احتشام کو اس کے غصے کے باوجود بات کرنے پر مسلسل اکسار رہی تھی، وہ اسے قائل کرنے والے انداز میں بولے۔

”مس رانی! مانا کہ ایسے برے مرد بھی اس معاشرے میں موجود ہیں، لیکن آپ سب مردوں کو ایک ہی کیٹگری میں شامل نہیں کر سکتیں، پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔“

”پانچوں انگلیاں مل کر ہی زہر کھوتی ہیں، تیل کے چولہے کو پھٹنے کے لیے تیل کرتی ہیں، تیلی جلاتی ہیں، دھوکے سے زمین اور جائیداد کی دستاویزات پر دستخط کرواتی ہیں، طلاق کے حرف لکھتی ہیں، تشدد کرتی ہیں، ایک ایک کیلنگ تو یہ سب نہیں کر سکتی، کہلاتی تو سب ہی انگلیاں ہیں ناں، وقت پڑنے پر کام بھی ایک ساتھ کرتی ہیں۔“ وہ تکی سے بولی۔

”نہیں مس رانی! آپ کا تجربہ سبھی لیکن سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے، صنف جنس ایک ضرور ہے، جیسے ہاتھ کی انگلیاں چھوٹی بڑی ہیں، ہیں تو سب ہی مرد، لیکن سب کی سوچ، طبیعت، مزاج، خیال، نیت، فطرت، صورت اور سیرت میں بے حد فرق اور تضاد ہوتا ہے، سب برے نہیں ہوتے اور سب اچھے بھی نہیں ہوتے، آپ کی جنس یعنی عورت میں بھی برائی موجود ہے، یہ سب جرائم یا الزامات جو آپ مرد پر عائد کر رہی ہیں عورت بھی آج کل ان میں ملوث پائی جاتی ہے۔“

”عورت کے اس روپ کے پیچھے بھی تو برے مرد کا ظلم کارفرما ہوتا ہے، مرد ہی عورت کو برا بننے پر مجبور کرتا ہے۔“ وہ ان کی بات کی طور ماننے کو تیار نہیں تھی، بحث پر اتر آئی اور وہ بھی چاہ رہے تھے کہ کسی طرح اس کے اندر کی تکی اور غبار باہر نکل جائے۔

”برے مرد کے پیچھے بھی تو کسی عورت کا دخل ہو سکتا ہے۔“ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں آپ سے مزید بحث نہیں کرنا چاہتی، میں نے آپ سے کل کے رویے پر معذرت کر لی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مجھے نصیحت کرنے کھڑے ہو جائیں، آپ اندر تشریف لے جائیں، اگر مجھ سے مزید کوئی گستاخی سرزد ہوگئی تو شاید آپ ڈنر کا ارادہ بھی ملتوی کر دیں اور یہاں سے چلتے بنیں۔“ اس نے سپاٹ اور تیز لہجے میں کہا۔

”گستاخی پر تو آپ مجھے اکسار ہی ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولے۔

”آپ...!“ اس نے انھیں غصے سے گھورا۔

”چلا جاتا ہوں اور جاتے جاتے اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر آج آپ نے مجھ سے معذرت کی ہے تو کل انشاء اللہ آپ محبت بھی کریں گی، آپ کو ایک وقادار اور قابل اعتبار مرد ضرور ملے گا، اور اس وقت میں آپ کو مبارک باد دینے ضرور آؤں گا۔“

”کی الحال تو آپ تشریف لے جائیے، ایسا نہ ہو کہ کوئی گملا آپ کے سر پر پھول کھلاتا ہو زمین بوس ہو جائے۔“ وہ غصے سے گلے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”جار ہا ہوں، تشدد پسند لڑکی!“ وہ ہنستے ہوئے بولے اور اندر چلے گئے۔

”سارے چہاں کو میری شادی اور بربادی کے قصے سنانا ضروری ہیں کیا؟“ وہ جویریہ بھابی کے سر پر کھڑی پوچھ رہی تھی، کیونکہ احتشام کو سب کچھ بتایا جو گیا تھا۔

”تمہارا اشارہ اگر شام بھابی کی جانب ہے تو وہ کوئی غیر نہیں ہیں اور تم نے جو سلوک ان کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد ہمیں اصل بات بتانا ہی پڑی، ورنہ شاید وہ یہاں اتنی آسانی سے نہیں آ جاتے، گھر بلا کر ٹھہرا کر مہمان کو خود ہی ذلیل کرنا بھلا کہاں کی شرافت ہے؟“ جویریہ بھابی نے تین سالہ نیہا کے بال سنوارتے ہوئے کہا تو وہ نادامی ہوگئی۔

”جویریہ بیٹی! امیز پر برتن لگا دو۔“ امی کی آواز پر وہ پکچن کی طرف چلی گئیں، وہ اپنے کمرے میں جانے لگی، تو امی نے اسے کھانے کے لیے روک لیا، وہ بھی اب ان کی مزید بے عزتی اور پریشانی کا باعث نہیں بن سکتی تھی، سو ڈانٹنگ ٹیبل پر آ گئی، فیضان صاحب اور امان بھابی کھانے کے دوران احتشام سے باتیں بھی کر رہے تھے، رانی کے ساتھ احتشام نے نہایت سنجیدگی سے شرارت کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا، وہ چادلوں کی ڈش اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھاتی تو احتشام فوراً ہاتھ بڑھا کر ڈش اٹھا لیتے۔ وہ سالن کے ڈونگے کی جانب دھبکتی تو انھیں بھی عین اسی وقت سالن کی ضرورت پیش آ جاتی، کباب اس کے من پسند تھے مگر اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آنے دی تھی احتشام نے اور کباب لینے کی غرض سے پوری پلیٹ ہی اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی تھی، وہ خالی روٹی اور سلاد لیے بیٹھی غصے سے انھیں گھور رہی تھی، اور وہ شاید محفوظ ہو رہے تھے اسے تنگ کر کے بھی مسکرا رہے تھے۔

”رانی! کھانا کھاؤ۔“ شازیہ نے آہستہ سے کہا۔

”تمہارے ان شام بھابی کے ہاتھوں کچھ نیچے گا تو کھاؤں گی ناں۔“ اس نے قصد آواز اتنی بلند رکھی کہ احتشام تک اس کی بات پہنچ سکے اور بات ان تک پہنچ بھی گئی، انھوں نے مسکراتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مزے سے پلاؤ اپنی پلیٹ میں نکالنے لگے۔

”پانی لانا نازی بیٹی!“ نصرت نے کہا۔

”امی! میں لے آئی ہوں، تم بیٹھو نازی!“ رانی، نازیہ کے اٹھنے سے پہلے ہی بول پڑی، اور اٹھ کر پکچن میں چلی آئی، جگ میں ٹھنڈا پانی بھرنے کے بعد اس نے پلیٹ اٹھائی اور پلاؤ، کباب، سالن اور رائیہ اس میں بھر کر پلیٹ اور جگ لیے ڈانٹنگ روم میں آ گئی، جگ نصرت کے قریب رکھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی اور لوازمات سے بھری ہوئی پلیٹ اپنے سامنے رکھ کر مزے سے کھانے لگی۔

”ملک کے مختلف حصوں میں جو خوراک کی کمی ہے اس کی وجہ اب میری سمجھ میں آئی ہے۔“ احتشام نے رانی کی لبالب بھری پلیٹ کی طرف دیکھ کر ذہنی بات کہی تو شازیہ، نازیہ اور جویریہ بھابی ان کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنس پڑیں، باقی سب اپنی باتوں میں لگے تھے۔

”میزبان کے منہ کا نوالہ چھیننے والے ندیدے مہمان کیسے ہوتے ہیں، میں نے بھی آج ہی زیارت کی ہے ان کی۔“ رانی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ ہنس کر شوخ لہجے میں بولے۔

”تو کیسے پسند آئے آپ کو یہ مہمان؟“

”پسند آئے ہیں، ہمیں یہ پکوان۔“ رانی نے کہا، تو وہ بمشکل اپنی ہنسی روک سکے، اس نے بات کو کس خوبصورتی سے سنبھالا تھا حاضر و ماضی وہ۔

”رانی! عقل کرو، مہمان کے ساتھ کھانے پر جھگڑ رہی ہو۔“ شازیہ نے اسے ٹوکا۔

”میں نہیں جھگڑ رہی، تمہارے یہ مہمان ہی بیوقوف قسم کے ہیں۔“ وہ پلاؤ کھاتے ہوئے بولی تو احتشام مسکرائے گئے، کھانے کے بعد رانی چائے بنا لائی اور احتشام کے کپ میں جان بوجھ کر چینی نہیں ڈالی، ان کی شرارت کا بدلہ جو لینا مقصود تھا۔

”آپ نے چائے بھی اپنے مزاج کی طرح پھینکی بنائی ہے، گھونٹ گھونٹ میں پھینکے پن کا احساس ہو رہا ہے۔“ احتشام نے چائے کے تین چار سپ لینے کے بعد موقع ملنے ہی مدھم آواز میں اس تک اپنی بات پہنچا دی، وہ جانتے تو تھے کہ اس نے جان بوجھ کر انھیں پھینکی چائے دی ہے۔

”مجھ سے آپ کو ہمیشہ یہی احساس ملے گا، لہذا مجھ سے ٹھٹھے پن کے احساس کی توقع رکھیے گا بھی مت۔“

رانی نے چائے کا سپ لے کر مدھم آواز میں جواب دیا۔

”میں توقع پر نہیں، عمل پر یقین رکھتا ہوں اور اس یقین سے کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کے اس پھینکے پن اور کڑواہٹ کو ٹھٹھے پن اور محبت میں تبدیل ہوتا ضرور دیکھوں گا۔“

”آپ کے یقین کی ایسی کی تیسری.... ہونہ۔۔۔!“ وہ قدرے تیز لہجے میں بولی اور فوراً وہاں سے اٹھ گئی، احتشام کے لبوں پر گہری اور پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆.....☆.....☆

دن گزرتے چلے گئے، افشین کی شادی میں وہ سب کراچی آئے ہوئے تھے، امان بھابی کو چھٹی نہیں مل سکی تھی اس وجہ سے وہ لاہور میں تھے اور جویریہ بھابی بھی ان کی وجہ سے رک گئی تھیں، شازیہ، نازیہ، راجہ، نصرت اور فیضان صاحب کے ساتھ امان بھابی کا پانچ سالہ بیٹا عمران بھی کراچی آیا تھا، نیہا، جویریہ بھابی کے بغیر رہتی نہیں تھی، لہذا وہ ان کے پاس ہی تھی، خاندان کے بڑے بوڑھے، بچیاں، بچے سب ہی اس کے قریب کو روتی بٹختے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے، دوپہر کو وہ لوگ ظفر صاحب کے ہاں پہنچے تھے، شام کو مہندی تھی، سب تیار یوں اور انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، بہت کرجموشی سے ان کا استقبال کیا گیا، دولہا والے چونکہ اسی شہر میں رہتے تھے، لہذا وہ مہندی لے کر آ رہے تھے، احتشام سے بڑے انعام بھائی تھے، ان کی بیگم ناہید اور بیٹیوں بچے بھی بہت ملتے تھے، رانی کو یہاں آ کر ان سب سے مل کر بہت مسرت ہوئی تھی، بہت عرصے سے اس نے کوئی میل ٹکٹنٹن نہیں کیا تھا، وہ لوگوں کی باتوں کے جواب میں اس کے پاس سوائے غصے کے کچھ نہیں ہوتا تھا اس لیے نصرت اور فیضان صاحب نے خود ہی اسے ایسی

تقریبات میں لے جانے سے گریز کرنا شروع کر دیا تھا، جن میں خاندان کے لوگ شریک ہوتے تھے، اب چونکہ ڈھائی سال کا عرصہ بیت چکا تھا اس واقعے کو، لہذا وہ بے خون اور خوشی سے اسے اپنے ساتھ اس تقریب میں شرکت کے لیے لائے تھے، رانی کو سیڑ کی وجہ سے کراچی ہی حد پسند تھا، پچھلے دنوں وہ کالج کے تفریحی ٹرپ کے ساتھ کراچی آئی تھی تو اس نے بہت انجوائے کیا تھا، مزارقہ انداز ساحل سمندر پر جانے کو اس کا دل بہت چلتا تھا، سو اس کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی تھی، کراچی ریڈیو اور ٹی وی سینٹر کی عمارات اور کراچی کے معروف بازار شاپنگ سینٹر ز اور پکنک اسپاٹ، فوڈ اسپاٹس ہر جگہ ٹی وی وہ اور راستوں سے بھی واقفیت ہو گئی تھی ایک ہفتے کے اس قیام میں، اور اب دوبارہ یہاں آ کر اس کے ذہن میں وہ یادیں تازہ ہو گئی تھیں، مہندی کا فنکشن شروع ہونے والا تھا کیونکہ لڑکے والے مہندی لے کر آ گئے تھے، مموئی مین کا کیمروہ آن ہو چکا تھا، احتشام کی کزنز اپنے اپنے کیمروں سے تصاویر کھینچنے کے لیے بے تاب تھیں، ڈھولک کی تھاپ پر مہندی کے گیت گائے جا رہے تھے، رانی بھی گیت گانے والی لڑکیوں میں شامل تھی، اس نے آکر گزرا کا دل کا مڈار سوٹ زیب تن کیا تھا، ہاتھوں میں گجرے پہنے، میچنگ چوڑیوں سے کلاسیاں سجائے، بالوں کی چوٹی میں گولڈن نگ سجائے، خوبصورت میک اپ میں وہ اس قدر حسین لگ رہی تھیں کہ نصرت نے تو دیکھتے ہی پانچ سو روپے اس کے سر سے وار کر ملازمہ کو دے دیئے تھے کہ کہیں ان کی بیٹی کو کسی کی نظر نہ لگ جائے، مموئی بنانے والا بھی جیسے اسی کے چہرے کی دلکشی اور سحر میں کھو گیا تھا، اس نے کیمروہ مسلسل رانی کے چہرے اور سراپے پر فوس کر رکھا تھا، اس کے تالی سجاتے ہاتھوں کو چہرے کو وہ بطور خاص کیمروہ میں محفوظ کر رہا تھا، رانی کو بھی احساس ہوا تو اس نے جگہ تبدیل کر لی، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا، وہ ادھر بھی آن پہنچا، کیمروہ پھر سے رانی کے چہرے پر تھا، اس نے بہت مشکل سے اپنے ناگوار تاثرات کو چھپایا، اور شازیہ، نازیہ اور دیگر کزنز کے ساتھ مل کر مہندی کا گیت گانے لگی۔

مہندی رچے گی تیرے ہاتھ ڈھولک بجے گی ساری رات
جا کے تم بچنا کے ساتھ بھول نہ جانا یہ دن رات

”پچھو! وہ لال کپڑوں والی آنٹی کہہ رہی ہیں کہ آپ یہاں سے اٹھ جائیں، کیونکہ آپ کا سایہ دلہن کے لیے منحوس ہوگا۔“ عمران نے رانی کے کان میں سرگوشی کی، تو اس نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی جانب دیکھا، سرخ کپڑوں میں کوئی عورت کھڑی تو تھی مگر اس کا رخ دوسری جانب تھا، رانی کا چہرہ بکا یک غصے سے تپ کر لال ہو گیا، وہ عمران کو لے کر وہاں سے نکل آئی، اتنے میں وہ عورت کہیں غائب ہوئی تھی۔

”عمران بیٹے! وہ کون آنٹی تھیں آپ جانتے ہو انھیں؟“ اس نے عمران سے پوچھا۔

”نہیں تو پچھو! میں تو انھیں نہیں جانتا، ہاں وہ آنٹی لڑکے والوں کی طرف سے آئی ہیں، وہ جو دولہا انکل ہیں ناں عارف انکل ان کے ساتھ ہی آئی تھیں۔“ عمران نے بتایا۔

”خیر ہوگی کوئی منحوس سوچ والی خاتون آنٹی ڈیم کیئر۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”ہیلو! رانی!“ احتشام کی دلکش اور اچانک بھری آواز اس کے قریب ابھری۔

”ہیلو!“ رانی نے نظریں اٹھا کر انھیں دیکھا، سفید کرتا شلوار پہنے گلے میں پیلے رنگ کا دوپٹہ ڈالے پاؤں میں کھسے پہنے وہ بہت مختلف اور خوبصورت لگے اسے، اس نے فوراً ہی نظروں کا زایہ بدل لیا، اپنی پسندیدگی ان پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی، جب سے وہ یہاں آئی تھی اب پہلی بار ان سے ملاقات ہو رہی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ احتشام نے پوچھا۔
 ”میں اب بھی ویسی ہی ہوں جیسی کے پہلے تھی۔ وہ اپنی چوڑیوں کو چھیڑتے ہوئے بولی۔
 ”تو گویا مستقل مزاج ہیں آپ۔“ وہ ہنس کر بولے۔
 ”مردوں سے اب بھی نفرت کرتی ہیں؟“
 ”میں مردوں کو اب نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتی، سمجھے آپ؟“ رابی نے سپاٹ لہجے میں کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

”اوہ گاڈ!“ انھوں نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کھلائی کی۔
 ”کیسے سمجھے گی یہ... اس عمر میں ایسی بے اعتباری اور بدگمانی، کیسے دور ہوگی رابی کی نفرت... ابھی تو ساری زندگی بڑی ہے اس لڑکی کے آگے، تھک جائے گی اکیلی اور تنہا چلتے چلتے۔“
 ”شام بھائی! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں، آئیں ادھر مہندی کی رسم شروع ہوگئی ہے۔“ ان کا ایک کزن انھیں ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلا اور ان کا بازو پکڑ کر کہا تو وہ چونکتے ہوئے بولے۔
 ”چلو یار مگر مہندی میں ہمارا کیا کام... یہ تو خالص عورتوں کا فنکشن ہے۔“
 ”آپ آئیں تو سہی، ہم عورتوں کو تھوڑی کچھ کہیں گے وہ جو دو لہا میاں کے ساتھ فوج آئی ہے، اس کی زیارت کریں گے، ایمان سے ایسے ایسے حسین چہرے ہیں کہ دل بے قابو ہو کر رہ گیا ہے، میں تو دو تین جگہ دے بھی آیا ہوں۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”شاپاش بیٹا! بہت ہی آوارہ مزاج دل ہے تمہارا، جو ایک جگہ تک نہیں سکتا، باز آ جاؤ وسم! کسی دن کسی ماہ رخ کے ہاتھوں پٹ گئے تال تو ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔“ احتشام نے اس کے سر پر ہلکا سا ہاتھ مار کر ہنس کر کہا۔

”نہیں شام بھائی! بددعا تو نہ دیں، قسم سے اس دفعہ تو خاصا سنجیدہ بیچ لڑا ہے دے آپ بھی تو کسی سبز پری سے باتیں کر رہے تھے، میں تو اس پر بھی مرتے مرتے بچا ہوں اف... کیا آفت لڑی تھی، لون بھی کیا نام تھا اس کا؟ بڑے غصے سے گئی تھی، آپ نے ایسا کیا کہہ دیا تھا اسے؟“ وسم تیزی سے شوخی سے بولنے چلا گیا۔
 ”وسم! تم کیا میری جاسوسی کر رہے تھے یہاں؟ اور وہ لڑکی جو بھی ہے اس سے تم دور ہی رہنا، ورنہ وہ تمہیں بیچ بیچ موت کے گھاٹ اتار دے گی، موصوفہ کو مردوں سے شدید الرجی ہے، بیچ! اپنی عزت اپنے ہاتھ ہی ہوتی ہے، اس لیے اپنی نظروں کا رخ اس کی طرف بھولے سے بھی نہیں کرنا ورنہ پچھتاؤ گے۔“
 احتشام نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا، تو وہ ہنس پڑا اور پھر شرارت سے بولا۔

”شام بھائی! کہیں آپ بھی پچھتاؤ نہیں رہے؟“
 ”تمہارے شام بھائی! ایسا کام کرتے ہی نہیں ہیں کہ بعد میں پچھتاؤ پڑے، ہم تو بہت فیئر گیم کھیلنے والے بندہ ہیں، ایک پری میں مریں گے اور ایک باری میں مریں گے، یہ لمحہ لمحہ محبوب بدلنا تمہارا ہی مشغلہ ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
 ”مشغلہ... آپ نے کچھ زیادہ ہی شرمندہ نہیں کر دیا مجھے؟“ وہ سر کھچاتا ہوا تجل ہو کر بولا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

سہاگنیں پہلے جوڑے میں ملیں افشین کو مہندی لگا چکیں، تو اس کی کزنز اور سہیلیاں بھی اس کے ہاتھ پر

مہندی رکھنے کے لیے باری باری اسٹیج پر آنے لگیں، رابی کسمیرہ لیے اپنی امی، بہنوں اور من پسند کزنز کی تصویریں بھیج رہی تھی، احتشام دور کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔
 ”رابی! تم بھی مہندی لگاؤ افشین کو۔“ ناہید بھائی نے اس سے کہا۔
 ”جی بہتر۔“ وہ کسمیرہ کلوز کرتے ہوئے بولی۔

”بہتر و بہتر کچھ نہیں ہے رابی بی بی! تم نحوست مت پھیلاؤ، اترو اسٹیج سے، جو لڑکی اپنا گھر نہ بسا سکی ہو اسے مہندی کی رسم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، طلاق یافتہ لڑکی کا تو سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے ہونے والی دہکن پر، اپنا گھر تو اجاڑ لیا اب کیا اس بچی کا گھر بھی!“
 ”خدا نہ کرے افشین کے نئے گھر میں کوئی بگاڑ پیدا ہو۔“ رابی نے سرخ لباس میں ملیں اس عورت کی بات کاٹ کر کہا۔

”بسن! اجڑنا سب قسمت کا کھیل ہے، منحوس اور مبارک کا فیصلہ آپ یا ہم نہیں کر سکتے، میں نے ایک جرائم پیشہ اور برے شخص سے طلاق لے کر کوئی گناہ نہیں کیا، ہاں اگر میرے مہندی لگانے سے کوئی بھونچال آنے کا اندیشہ ہے تو میں نہیں لگاتی مہندی، آپ خود لگائیں، بلکہ آپ تو لگانے ہی آئیں ہیں، جائیے افشین کو مہندی لگائیے، طلاق یافتہ لڑکی تو منحوس ہوتی ہے، شاید بیوہ اور دوسری شادی کی سہاگن کا مہندی لگانا مبارک ثابت ہو جائے دہکن کے لیے۔“ رابی نے اس عورت کو پہچان لیا تھا وہ ان کی دور پرے کی رشتے دار تھی، نام اس کا زلیخا تھا، پہلے شادی کی ایک سال بعد شوہر چل بسا، پھر تین سال بعد والدین نے دوسری شادی کر دی، وہ خاصی بددماغ مشہور تھیں، رشتے داروں میں لگائی بھائی کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، ان کے شوہر اور بچے بھی ان کی اس عادت سے عاجز تھے۔

”آئے ہائے... دیکھو تو سہی... ناہید بیٹی! کیسی زبان چلتی ہے اس لڑکی کی، بڑوں کا ادب لحاظ تو اسے چھو کر بھی نہیں گزرا، اچھا ہی ہوا جو اسے طلاق ہوگئی۔“ زلیخا بیگم بھنا کر بولیں۔
 ”طلاق ہونا اچھا عمل ہے، تو اللہ کرے کہ آپ کو بھی طلاق ہو جائے۔“ رابی نے بہت نارمل انداز میں بڑا چبھتا ہوا جواب دیا تو وہ بیچ و تاب کھانے لگیں۔

”تم...!“ وہ اتنا ہی بولی تھیں کہ رابی نے غصے سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
 ”تمیز سے خاتون! میں بہت لحاظ کر رہی ہوں آپ کا، آئیں بڑی بوڑھی گھوڑی لال لگام۔“
 ”سناتم نے ناہیدایہ کیا کہہ کر گئی ہے۔“ وہ رابی کو تیزی سے اسٹیج سے اتر کر جانا دیکھ کر سگلتے ہوئے بولیں، ناہید بھائی کی تو ہنسی چھوٹ گئی تھی، وہ رابی کے اس جواب پر دل ہی دل میں خوش ہوئی تھیں، کیونکہ زلیخا بیگم سب کو پریشان اور بے عزت کرتی تھیں آج پہلی بار ان کا وارنٹا ہو گیا تھا، انھیں رابی کا دل دیکھنے کا بھی افسوس تھا، اس معاملے میں وہ بھی رابی کو بے قصور سمجھتی تھیں، انھیں رابی سے دلی ہمدردی اور پیار تھا۔ ناہید بھائی تھیں بھی بہت شفیق، ہمدرد اور اپنوں سے پیار کرنے والی۔ رابی کا موڈ سخت آف ہو چکا تھا، غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کی سنہری رنگت دھک کر سرخ ہوگئی تھی، احتشام دور کھڑے اسے دیکھ رہے تھے، اس ساری صورتحال کو دیکھتے ہوئے اتنا تو وہ سمجھ گئے تھے کہ زلیخا بیگم نے اس سے کوئی سخت بات کہی ہے، کیا کہی ہے یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ ناہید بھائی سے پوچھنے کی غرض سے آگے بڑھ گئے، نظریں مسلسل رابی پر مرکوز تھیں، جو باوجود کوشش کے ان کی چہرہ شناس نظروں سے اپنے غصیلے تاثرات چھپا نہیں سکی تھی، اس نے شازیہ

گھر وندے کی بنیادوں میں شامل ہو جائے تو زمین اس کا مقدر بن جاتی ہے۔“ رابی نے گھر وندوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس قدر بزدل اور بے حوصلہ لڑکی ہیں۔“ اسے احتشام کی آواز اپنے سر پر سنائی دی، تو اس نے چونک کر نظریں اٹھا کر دیکھا، وہ بہت تاسف سے اسے دیکھ رہے تھے اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آئے تھے وہ۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس نے بیٹھے بیٹھے پوچھا۔
”زیلخا آئی کی بات نے یقیناً آپ کو ہرٹ کیا ہوگا، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ آپ میدان چھوڑ کر چلی آئیں۔“

”میں وہاں ہاکی یا کرکٹ نہیں کھیل رہی تھی، جو میدان چھوڑنے کی نوبت آتی، رہی بات زیلخا آئی کی تو مجھے اب ایسی باتوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔“ وہ کھڑے ہو کر سنجیدہ لہجے میں بولی۔
”تو آپ وہاں سے چلی کیوں آئیں؟“ وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

”مجھے ان خاتون کی فطرت اور عادت کا اندازہ تھا اس لیے چلی آئی، مجھے سب کے سامنے تماشا بننے کا کوئی شوق نہیں ہے اور ویسے بھی میں اپنی مرضی کی مالک ہوں، آپ کو اس سے کیا کہ میں وہاں سے کیوں چلی آئی، آپ کی بہن کی مہندی کا فنکشن میں اپنی وجہ سے خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

آئی ایم سوری مں رابی! میں زیلخا آئی کے رویے پر آپ سے شرمندہ ہوں۔“
”آپ کو ان کے رویے پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، وہ خود ہی کافی شرمندہ ہوئی ہوں گی میرا جواب سن کر۔“ وہ اسی تنبیہ سے بولی تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”یقیناً... خیر اب چلیے میرے ساتھ، سوا گیارہ بج رہے ہیں، آپ نے تو ہمیں پریشان کر دیا تھا۔“
”آپ کیوں میرے لیے پریشان ہونے لگے؟“
”کیونکہ آپ میری مہمان ہیں، میرے گھر سے گئی تھیں میری ذمہ داری تھیں اگر خدا نخواستہ آپ کو کچھ ہو جاتا تو...؟“

”تو میں آپ کو اس کا ذمہ دار نہ ٹھہراتی۔“
”آپ کے کہنے سے کیا ہوتا ہے، ذمہ دار اور قصور وار ہم ہی ٹھہرائے جاتے، شہر کے حالات کا، لوگوں کا کچھ بھروسہ نہیں ہے اور آپ کے لیے یہ شہر اجنبی ہے، آپ اکیلے گھر سے غصے میں نکل پڑیں کہیں بھٹک جائیں۔“

”میں بھٹک ہی نہیں سکتی تھی، کیونکہ آپ کا یہ شہر میرے لیے اجنبی نہیں ہے، چار ماہ پہلے میں کالج ٹرپ پر یہاں ایک ہفتے کے لیے آچکی ہوں، اور جتنی جگہیں میں نے اس وقت دیکھی تھیں وہ مجھے اپنے نام اور مقام سمیت اب تک یاد ہیں، میں ایسے ہی تو یہاں نہیں چلی آئی تھی۔“ رابی نے چلتے ہوئے بتایا تو انھوں نے حیران ہو کر اس کے چہرے کو دیکھا پھر بولے۔

”تعب ہے آپ یہاں آئیں بھی اور ہم سے ملے بغیر ہی چلی گئیں۔“
”میں نے بتایا ان کہ میں کالج ٹرپ پر آئی تھی اور ویسے بھی آپ لوگ کون سا کبھی ہمارے گھر آئے تھے یا ہم سے کوئی رابطہ رکھا تھا، کبھی فون کیا نہ خط لکھا تو میں ایوں آپ کے گھر چلی آئی؟“ اس نے صاف کوئی

کو کسمرہ دیا اور خود عمران کا ہاتھ پکڑ کر اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکا کر بیرونی راستے کی جانب قدم بڑھا دیے۔
احتشام اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں اسے روکنے کے لیے تو نہ جاسکے، البتہ ناہید بھابی سے اصل بات معلوم کر کے فکر مند ضرور ہو گئے، کیونکہ یہ غلط بات ان کے گھر میں ان کی مہمان نے رابی سے کہی تھی، وہ اس سے معذرت کرنا چاہتے تھے، سمجھنا چاہتے تھے اسے مگر وہ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے گیٹ عبور کر گئی تھی۔

”ٹھیک ہی کہتے ہیں مسٹر شام! کہ ہر عورت اچھی نہیں ہوتی، برائی تو عورت میں بھی ہے، عورت کے درد سے واقف ہونے کے باوجود ایک عورت دوسری عورت کو ذلیل کرنے، دکھ پہنچانے اس کے زخم کھینچنے سے باز نہیں آتی۔“ رابی کا داغ سوچوں کا تانا باننا رہا تھا، وہ عمران کا ہاتھ تھامے ایک ریٹائرمنٹ میں چلی آئی، عمران کو بھوک لگ رہی تھی سو اس نے اپنے اور عمران کے مین پسند کھانے کا آرڈر دے دیا۔

”شام بیٹے! ذرا بات سننا۔“ نصرت نے مہندی کا فنکشن ختم ہو جانے کے بعد انھیں آواز دے کر اپنے پاس بلایا۔
”جی آئی؟“ وہ فوراً ہی چلے آئے۔

”بیٹے! رابی کا کچھ بتائیں کہاں ہے وہ، عمران بھی اس کے ساتھ تھا، سارا فنکشن گزر گیا مہمان کھانا کھا کر چلے گئے مگر رابی کہیں نظر نہیں آ رہی، میں تو سمجھی تھی کہ مہمانوں میں کہیں گم ہوگی، اس کی سب سے کھل مل کر رہنے کی عادت بھی ہے، مگر وہ تو مہمانوں میں بھی نہیں تھی، نجانے کہاں ہوگی میری بچی اور عمران؟“

نصرت نے فکر مند لہجے میں مدھم آواز میں کہا۔
”آئی! آپ پریشان نہ ہوں، میں گاڑی لے کر جاتا ہوں، رابی اور عمران آئیں گے کھانے گئے تھے، قریب ہی کسی آئس کریم پارلر میں ہوں گے میں انھیں اپنے ساتھ لے کر آؤں گا، آپ دعا کیجیے کہ وہ راستہ نہ بھولی ہوں۔“ وہ انھیں تسلی دے کر بہانہ بنا کر مطمئن کر کے تو چلے آئے تھے، مگر خود اندر ہی اندر بے حد پریشان ہو رہے تھے، رابی کا غصہ، شہر کے راستوں سے ناواقفیت اور رات کا وقت انھیں ہولائے دے رہا تھا، ان کے خیال میں تو وہ پہلی بار ہی کراچی آئی تھی اسے یہاں کے راستوں کا علم نہیں ہوگا اور وہ راستہ بھول جائے گی، کسی آوارہ شخص کے ہاتھ لگ گئی تو...!

”اوہ... یہ میں کیا سوچ رہا ہوں، انشاء اللہ رابی خیریت سے ہوں گی اور عمران بھی۔“ احتشام گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہے تھے، اس تصور سے ہی کانپ اٹھے، ساحل سمندر پر کئی فیملیز چاندنی رات کا لطف اٹھانے اور وہاں پکنک منانے کے لیے آئی ہوئی تھیں، رات کے گیارہ بج رہے تھے اور ساحل سمندر پر دن کے گیارہ بجے کا سماں بندھا تھا، کہیں میوزک بج رہا تھا، کہیں فٹ بال اور لڈو کھیل جا رہی تھی، کہیں نوجوان لڑکے لڑکیاں بیت بازی اور گیت بازی کے مقابلے کر رہے تھے، بچے اور بڑے ہاتھوں میں برگر، چپس اور پیپسی لیے کھانے پینے اور ہنسنے بولنے میں مصروف تھے، سب کتنے خوش نظر آ رہے تھے، رابی نے ایک گہرا سانس اپنے لیوں سے خارج کیا اور ایک پتھر پہ بیٹھ گئی، عمران بھی وہاں موجود بچوں کے ساتھ مل کر ریت سے کھیلنے لگا، رابی نے دیکھا کہ ان میں جو بچیاں تھیں وہ ریت کے گھر وندے بنا رہی تھیں اور خوش ہو رہی تھیں۔

”ہم لڑکیاں ہمیشہ ریت کے گھر وندے بناتی ہیں، جیسی تو وہ جلد ٹوٹ بھی جاتے ہیں، مرد وہ سمندر ہے جس کی ایک ہی لہر تندر اور سر پھر لہر گھر وندے کو زمین بوس کر دیتی ہے، گھر وندے کے ساتھ وہ لڑکی بھی زندہ درگور ہو جاتی ہے جو نجانے کتنے اربانوں سے نیا گھر وندا بناتی ہے، بے یقینی، بے حسی اور بد اعتمادی کا پانی

سے کہا تو وہ شوقی سے بولے۔
 ”چلیے! اب تو رابطہ ہو گیا ہے ناں، ہم اب آپ کو فون بھی کریں گے اور خط بھی لکھیں گے۔“
 ”مجھے نہیں اپنے انکل آئی کو“۔ رابی نے وضاحت کی تو وہ ہنس پڑے۔
 ”چلیے! ان ہی سے سبھی بات بڑوں سے شروع ہونی چاہیے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولے، تو اس نے
 چونک کر ان کا چہرہ دیکھا اور تنک کر بولی۔
 ”کیا مطلب کیسی بات؟“

”ہر بات کا مطلب نہیں سمجھایا بتایا جاتا، کچھ مطلب خود بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ وہ اپنی گاڑی
 کے قریب آ کر رک کر مسکراتے ہوئے بولے، احتشام نے مسکراتے ہوئے اپنے موبائل پر گھر کا نمبر ڈائل
 کیا۔

”انکل، انکل! ہمیں ایئر پورٹ چھوڑ آئیں۔“ وہ فون پر رابی اور عمران کی خیریت کی اطلاع دے چکے تو
 عمران ہاتھ اور کپڑے جھاڑتا ان کے پاس آ کر بولا۔

”ایئر پورٹ کیوں بھی! آپ دونوں بیٹھیں گاڑی میں اور گھر چلیں میرے ساتھ۔“

”ہم آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔“ رابی نے کہا۔

”کیوں؟“ احتشام نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہماری مرضی۔“ اس نے بے نیازی سے کہا، تو وہ عمران سے مخاطب ہوئے۔

”عمران بیٹے! آپ گاڑی میں بیٹھیں۔“

”ٹھیک ہے انکل! عمران نے فوراً ٹیکس کی اور گاڑی کا بیک ڈور کھول کر اندر گھس گیا۔

”چلیے محترمہ! اب آپ بھی تشریف رکھیے۔“ احتشام نے رابی سے کہا۔

”میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ وہ یہ کہہ کر مڑی۔

”آپ میرے ساتھ ہی جائیں گی۔“ احتشام نے مجبوراً اسے بازوؤں سے پکڑا اور چیزیں سے گاڑی میں
 دھکیل دیا اور فوراً دروازہ بند کر کے خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھے، ان کی اس اچانک اور غیر متوقع حرکت
 نے اس کے حواس مٹ کر دیئے، وہ غصے سے بولی۔

”یہ کیا بدتمیزی تھی؟“

”سوری، آپ سیدھی طرح مان ہی نہیں رہی تھیں، اس لیے مجھے زبردستی کرنا پڑی۔“ وہ مسکرائے۔

”آپ مردوں کو زبردستی کرنے کے علاوہ اور آتا بھی کیا ہے؟“ وہ طنز سے بولی۔

”اور مردوں کا تو مجھے علم نہیں، ہاں البتہ اپنے متعلق میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے زبردستی
 کے علاوہ بہت کچھ کرنا آتا ہے۔“ وہ معنی خیز اور شریر لہجے میں بولے تو اس کا چہرہ غصے اور حیا سے گلنا ہو گیا۔

”پتا نہیں سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو۔“ وہ بڑبڑائی اور گاڑی کا دروازہ کھولنے لگی۔

”یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہ فوراً بولے ان کو خدشہ تھا کہ وہ گاڑی سے اتر ہی نہ جائے۔

”مجھے آپ کے برابر بیٹھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ وہ دروازہ کھول کر اتر گئی۔

”ہو جائے گا ایک دن۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

”خوش فہمی ہے آپ کی۔“ وہ پچھل سیٹ پر بیٹھے ہوئے طنز یہ لہجے میں بولی۔

”آں..... ہاں..... یقین ہے مجھے۔“ وہ بڑے اسٹائل سے اپنا رخ اس کی جانب کر کے بولے۔

”آپ ہمیں ایئر پورٹ لے چلیں، فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔“ اس نے نظر چرا کر کہا۔

”امان بھائی آ رہے ہیں انھیں لینے جانا ہے ہم نے۔“

”اچھا... مگر اس وقت تو کوئی فلائٹ نہیں آئی، البتہ کراچی سے لاہور جاتی ضرور ہے۔“ احتشام نے اپنی
 رست و اراج میں وقت دیکھتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا۔

”انکل! ہم بھی تو کراچی سے لاہور جانا چاہتے ہیں، اس فلائٹ کے ذریعے پھپھو نے میری اور اپنی سیٹ
 بک کر لیا تھی۔“ عمران نے فوراً بھانڈا پھوڑ دیا، رابی کو اس پر شدید غصہ آیا، احتشام کے سامنے شرمندگی الگ
 ہو رہی تھی۔

”اد آئی سی... تو آپ جھوٹ بھی بولتی ہیں۔“ احتشام نے رابی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ جیسے لوگ جب سیدھی طرح بات نہیں مانتے گے، تو مجھ جیسوں کو جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔“ وہ
 اپنی خجالت چھپاتے ہوئے ٹیکھے لہجے میں بولی۔

”مگر میں نے تو سنا تھا کہ بچے جھوٹ نہیں بولتے۔“ انھوں نے اسے زچ کرنے کے لیے مذاق سے کہا۔

”اسی لیے عمران نے سچ بولا ہے، اور میں بچی نہیں ہوں سمجھے آپ؟“ رابی نے ان کی بات کا مطلب

اچھی طرح سمجھ لیا تھا، جب ہی سلگ کر بولی تو وہ ہنس کر بولے۔

”میں سمجھ ہی تو گیا ہوں، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ اب بھی بچی ہیں، بڑی ہوتیں تو گھر سے یوں نہ

چلی آتیں۔“

”کس گھر کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ وہ تلخی اور کرب سے بولی۔

”اس گھر کی جہاں میرا جسم سگڑوں کے جلتے ہوئے ٹکڑوں سے داغا جاتا تھا یا اس گھر کی جہاں مجھ پر تشدد

کا ہر حربہ آزمایا جاتا تھا، کس گھر کی بات کر رہے ہیں؟ آپ مرد جب چاہیں عورت کا گھر کہہ کر اسے معتبر

بنانے کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور جب دل بھر جاتا ہے تو اسی گھر سے اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں،

عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا، وہ تو ساری زندگی جلا وطن رہتی ہے، اس کے باوجود ہر شکار، ہر مسکن، ہر قیام گاہ

سے وفا کرتی ہے، اور مرد.... وہ تو اپنی عورت کا بھی نہیں ہوتا، وہ تو صرف اپنے آپ سے وفا نبھاتا ہے، اپنے

آپ سے اپنی ذات سے مخلص ہوتا ہے، اپنے لمحوں کو تو عورت کے وجود سے روشن اور خوشگوار بنا لیتا ہے مگر

عورت کے جسم و جان میں کانٹے بودیتا ہے۔“

”رابی! سب مرد حمید جیسے نہیں ہوتے۔“ احتشام نے سنجیدگی سے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

”چند ایک نکال دیں باقی سب حمید سے ہی ہیں، میں نے صرف سہا نہیں ہے پڑھا اور دیکھا بھی ہے، سنا

بھی ہے کہ کس طرح شوہر اپنی بیوی پر ظلم ڈھاتا ہے، تشدد، تضحیک، تحقیر، تذلیل بس یہی کچھ تو ہوتا ہے مرد کے

پاس عورت کو دینے کے لیے، عورت بھی والدین کی عزت کی فکر، کبھی بچوں کی خاطر، کبھی بھائی بہنوں کی خاطر

مرد کے ظلم سہی ہے اور ایک ظالم سے رشتہ نبھائے چلی جاتی ہے، بدلے میں کیا ملتا ہے اسے بتائیے؟ سکھ کی

کوئی ساعت، چچین کا کوئی پل، سکون کا کوئی لمحہ، اطمینان کی کوئی گھڑی ہے عورت کی زندگی میں؟ عورت کا

سارا سکھ، چچین، سکون، اطمینان آپ مردوں نے چھین لیا ہے، اور آپ مرد یہ بھول گئے ہیں کہ خدا جتنا بڑا

رتبہ رکھتا ہے اس سے اس کا اتنا ہی زیادہ حساب بھی لیتا ہے، مرد حاکم، ذمے دار اور کھیل کھڑا کیا گیا ہے ناں

”اتنی پیاری ہیں میری پھپھو“۔ عمران نے بڑے لاڈ سے رابی کے گلے میں بائیں ڈال کر کہا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

گھر پہنچ کر احتشام نے نصرت سے پہلے ہی بات کر لی ان کا غصہ جاتا رہا اور اس طرح رابی ان کی ڈانٹ سننے سے بچ گئی، اور منتظر نظروں سے احتشام کو دیکھتی ہوئی سونے کے لیے چلی گئی۔ احتشام کی باتیں اس کی سمجھ میں آ گئی تھیں، اور اگلے دن شادی کی تقریب میں وہ افسین کی بہن کا کردار ادا کرتی نظر آ رہی تھی، انکل اور آنٹی نے خود اسے افسین کے ساتھ رہنے اور بارات کا استقبال کرنے، رکیں ادا کرنے کی تاکید کی تھی، گولڈن کلر کے نیٹ کے لباس میں اس کا رنگ روپ اور بھی نمایاں ہو گیا تھا، اس کے لیے بال اس کی پشت پر لہرا رہے تھے، اس نے افسین کی تیاری میں مدد کی اور بارات کے استقبال میں بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کیا، مودی کیمرہ آج پھر اس کا طواف کر رہا تھا اور وہ مسلسل نظر انداز کر رہی تھی، اور دل ہی دل میں کیمرہ مین کو کوس رہی تھی، وہ مہمان خواتین کے ساتھ بیٹھی تو کیمرہ پھر اسے فوکس کرنے لگا، بالا خروہ اٹھ کر اس پر چلی آئی، جہاں احتشام اور ناہید بھابی دہن بنی بیٹھی افسین سے کچھ کہہ رہے تھے، کیمرہ مین کیمرے سمیت اب اس طرف آ چکا تھا، اور اس کے چہرے پر جو کیمرہ فوکس کیا اس نے، تو رابی نے اسے گھورا اور آہستہ سے بڑبڑائی۔

”الو کا پٹھا!“

”جی.... یہ آپ نے کسے اس خطاب سے نوازا ہے؟“ احتشام نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی، حیران ہو کر پوچھا۔

”آپ کے اس مودی میکرو؟“

”کیوں اس نے کوئی بد تمیزی کی ہے آپ کے ساتھ؟“

”صاحب مسلسل میری مودی بنا رہے ہیں، جیسے میری شادی ہو رہی ہو، اور کوئی لڑکی نہیں نظر آ رہی انہیں، سینکڑوں لڑکیاں بیٹھی ہیں یہاں۔“

”سینکڑوں میں سے ایک ادھ چہرہ ہی ایسا ہوتا ہے، جسے فوکس کرنے کو دل چاہتا ہے، اب اس میں مودی میکرو کا تو کوئی قصور نہیں ہے، آپ بھی تو ”گولڈن گرل“ بنی قیامت ڈھا رہی ہیں۔“ احتشام نے اس کے سنہری دیکتے، چمکتے سراپے پر نگاہیں جما کر کہا۔

”آپ اسے خود سمجھا دیں ورنہ میں سمجھا دوں گی اپنے طریقے سے۔“ وہ شیشا کر بولی تو انہوں نے جلدی سے کہا۔

”نہ... نہ... آپ یہ زحمت مت کیجیے گا، میں اسے سمجھا دیتا ہوں، ویسے میں نے سنا ہے کہ آپ کو اس روپ میں دیکھ کر آپ کے لیے دو تین بہت اچھے رشتے آنے کی توقع ہے۔“

”اچھے رشتے ہو نہ... یہاں آج کل رشتے نہیں ملتے، آپ اچھے رشتے کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ تلخی سے مسکرا کر بولی۔

”بہت گہری بات کہی ہے آپ نے۔“ احتشام نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

”چوٹ جو بہت گہری کھائی ہے۔“ وہ یہ کہہ کر اس سے اتر گئی۔

”انشاء اللہ! تم وہ چوٹ ایک دن بھول جاؤ گی، اب تمہیں کوئی چوٹ نہیں لگے گی۔“ احتشام نے دل میں

عورت کے لیے؟ تو وہ ظالم بن بیٹھا ہے، حاکم اگر ظالم بن جائے تو بہت کڑا حساب دینا پڑتا ہے اسے، خدا سب سے بڑا ہے جب وہ کائنات کا مالک ہو کر ہر چیز کا اختیار رکھتے ہوئے ظالم نہیں ہے تو آپ مرد کس بات پر اترتے پھرتے ہیں؟ حاکم کا عادل ہونا ضروری ہے اور جو عادل نہیں ہے وہ روز قیامت اپنے اصل حاکم کے سامنے جواب دہ ہوگا، اور شاید عورت کو انصاف اسی روز اسی عدالت سے مل سکے گا، یہاں تو حاکم، ظالم اور منصف ایک ہی کٹہرے میں کھڑے ہیں۔“ رابی نے سنجیدہ اور سنجیدہ لہجے میں کہا، احتشام حیرت سے اسے دیکھتے اور سنتے رہے، وہ اس کے اس قدر مدلل اور حقیقت پسندانہ تجزیے، خیال اور انداز فکر سے بے حد متاثر ہوئے، انہیں رنج بھی ہوا کہ اتنی کم عمری میں جب لڑکیاں چاہت کے ہر رنگ کے خواب اپنی آنکھوں میں سجاتی ہیں، کئی شہزادے کے سنگ ان دیکھی حسین و سرسبز وادیوں میں گھومنے کے خواب دیکھتی ہیں، اس عمر میں رابی سے اس کے خواب چھین لیے گئے، اس کا مان، اعتبار، اعتماد، یقین پارہ پارہ کر دیا گیا، خلوص اور محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا گیا، اس کی وفاداری کا مذاق اڑایا گیا، اس کی خدمتوں کو طاق نسیاں پر ڈال دیا گیا، اس کے گلاب بدن پر کانٹوں کی فصل بودی گئی، اس کی روح کو آگ میں تھسا دیا گیا، اب اگر وہ یہ سارے عذاب اپنی جان پر جمیل کر ایسی بدگمان اور بے اعتبار ہو گئی تھی، کئی اس کے مزاج میں شامل ہو گئی تھی تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا، وہ اپنے انداز فکر میں حق بجانب تھی۔

”پلیز مسٹر شام! آپ ہمیں ایئر پورٹ چھوڑ دیں۔“ اس نے چند لمحوں بعد کہا تو وہ اس کے مسٹر شام کہنے پر ہنس دیئے، اس نے ایک بار امی کی زبان سے ان کا نام سنا تھا اور وہ بھی شدید غصے کے عالم میں، اور یاد بھی نہیں رہا تھا، اب سب انہیں شام بھابی اور شام بیٹا کہہ کر پکار رہے تھے، تو اس نے بھی انہیں اسی نام سے مخاطب کر لیا، اس کا خیال تھا کہ یہی نام ہوگا ان کا، جب ہی بندہ شام، شام کہہ رہا ہے انہیں۔

”مس رابی! آپ واپس شادی انیڈ کر کے ہی جائیں گی، اس طرح جائیں گی تو لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا، اور آپ جب غصے میں آ جاتی ہیں تو جن لوگوں کو آپ پر گز رہے سامنے کا علم نہیں ہوتا، انہیں بھی علم ہو جاتا ہے، لوگ ٹوہ میں لگ جاتے ہیں اور بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں، اس لیے میرا آپ کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ مردوں سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار مت کیا کریں، کیا فائدہ خود کو متاثر بنانے کا، آپ تو بہت مصحوم اور پیاری ہیں اور آپ کی زندگی آپ کے سامنے ہے۔“ احتشام نے اسے بے حد نرمی سے کہتے ہوئے آخر میں بڑی معنی خیز اور گہری نظروں سے دیکھا، تو ایک لمحے کو تو وہ بھی گڑبگڑ گئی، دل کے اندر پچھل سی بچ گئی، مگر فوراً ہی اس نے خود کو تارل کر لیا، واقعی وہ صحیح کہہ رہے تھے ان کی باتیں اس کے دل کو گنگی تھیں، ایسی باتیں ایک پر خلوص دوست ہی اسے بتا سکتا تھا، وہ ان کی شکر گزار تھی۔

”میرا خیال ہے کہ سراسر ایک پچھل بہت طویل ہو گیا ہے، اب اسے اینڈ کریں اور گاڑی اشارٹ کریں۔“ رابی نے اپنے عام اور مخصوص لب و لہجے میں کہا۔

”اوکے!“ انہوں نے مسکراتے ہوئے گاڑی اشارٹ کر دی۔

”کچھ کھائیں گے آپ دونوں، آپ نے تو کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔“

”انکل! ہم نے کھانا ریستورنٹ میں کھالیا تھا، اور آنکسریم بھی کھائی تھی۔“ عمران نے بتایا، تو وہ رابی کو بیک مر میں دیکھتے ہوئے بولے۔

”یہ تو اچھا کیا آپ کی پھپھو نے، ورنہ ان کا غصہ انہیں کھا جاتا۔“

اسے مخاطب کر کے کہا۔
 دولہا کو دلہن کے ساتھ بٹھانے کے لیے دو لمبے کی بہنیں اور کزنز جب اسٹیج کے قریب پہنچے تو رابی نے جو
 پھولوں کا ہار لیے کھڑی تھی، انھیں اسٹیج پر چڑھنے سے روک دیا۔
 ”پہلے دس ہزار روپے دیں، اس کے بعد آپ اسٹیج پر قدم رکھ سکیں گے۔“ رابی نے کہا۔
 ”کیا...؟“ سب ایک ساتھ چلائے۔

”دس ہزار روپے... یہ کون سی رسم ہے بھئی؟“
 ”یہ نئی رسم ہے، میں نے ابھی ابھی ایجاد کی ہے۔“ رابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”بڑی مہنگی ایجاد کی ہے بھئی!“ دولہا حیدر نے کہا تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
 ”دلہن تک پہنچنا ہے تو اس ایجاد کی قیمت تو آپ کو ادا کرنا پڑے گی۔“ رابی نے کہا، سب اس انوکھی رسم
 سے محظوظ ہو رہے تھے، ناہید بھائی، شاز یہ، نازیہ اور ان کی دیگر کزنز بھی رابی کے ساتھ آکھڑی ہوئی تھیں،
 انکل ظفر ان کی بیگم، انعام بھائی، احتشام، نصرت اور فیضان صاحب بھی پنڈال میں بیٹھے اس منظر سے لطف
 اندوز ہو رہے تھے، مووی بن رہی تھی، تصاویر چمکی جا رہی تھیں۔
 ”سنو... سنہری سالی! دس روپے لے لو اور ہمیں اوپر آنے دو۔“ دولہا بنے حیدر نے رابی سے کہا تو سب

نے شور مچا دیا۔
 ”دولہا بھائی! دس روپے کی ٹافیاں تھوڑی خریدنی ہیں میں نے۔“ رابی نے کہا۔
 ”تو کیا ٹافیاں کی فیکٹری خریدنی ہے؟“ حیدر کے کزن نے جملہ پھیکا سب ہنس پڑے، رابی نے گھور کر
 حیدر کے اس کزن کو دیکھا، جس کا نام عارف تھا، اور وہ کل سے نوٹ کر رہی تھی کہ مہندی کی تقریب میں بھی
 اس لڑکے نے آتے ہی اسے نظروں کے حصار میں لے لیا تھا، اور آج پھر چمک رہا تھا، وہ اندر ہی اندر اس کی
 حرکتوں سے پریشان سی ہو گئی تھی۔

”آپ کی مرضی ہے کھڑے رہیے نیچے۔“ رابی نے اطمینان سے کہا۔
 ”یہ چیکنگ ہے، یہ رسم خود ساختہ ہے۔“ حیدر کی بہن ریحانہ بولی۔
 ”سنسز اس کیس تو ساری ہی خود ساختہ ہیں، دس ہزار نکالے دس ہزار...!“ رابی مسکرائی۔
 ”کمائی کا اچھا دھندا ہے یہ۔“ حیدر کے کزن شاکر نے طنز کیا۔

”بہت ہی کچھ باندھ ہے یہ۔“ رابی سمیت سب نے شاکر کا مذاق اڑایا۔
 ”سنو... سنو... رابی! میں تو مزے سے آ رہا تھا کہ میری کوئی سالی نہیں ہے، بچت ہو گئی، مگر تم نے کسر پوری
 کر دی ہے سالی کی، لو دس ہزار... تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس نئی دولہا بھائی سے واسطہ پڑا ہے۔“ حیدر نے اپنی
 شیر وانی کی جیب میں سے دس ہزار روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے، تو ان سب نے خوشی سے شور مچایا،
 جبکہ حیدر کے ساتھ جو پارٹی تھی اس نے ”اوہ... اوہ... ہائے... یہ کیا کیا“ کی آوازیں لگائیں۔
 ”دولہا بھائی! مابدولت آپ کی دریا دلی سے بے حد متاثر ہوئے ہیں، لہذا اس خوشی میں ہم آپ کو دس
 ہزار روپے بطور انعام پیش کرتے ہیں قبول فرمائیے۔“ رابی نے بڑے شانہ انداز میں کہتے ہوئے ان کی رقم
 واپس ان کی ہتھیلی پر رکھ دی، تو سب نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں اور اس کے انداز مخاطب، انداز گفتگو پر
 محظوظ ہو کر نئے بھی، احتشام اس کا یہ روپ یہ انداز دیکھ کر حیرت اور مسرت سے مسکرا رہے تھے۔
 (جاری ہے)

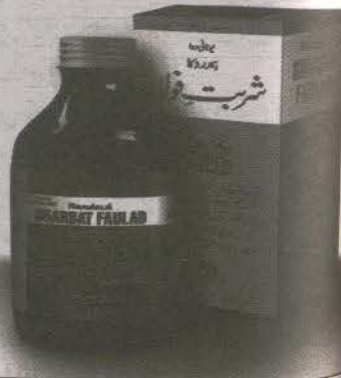
ہمدرد کا شربت فولاد

بوند بوند میں فولاد

مضبوط رکھے جیسے فولاد

بچوں بڑوں میں سبھی کے لئے نہایت مفید و موثر
 دہائی و جسمانی طاقت کے لئے ہمدرد کا شربت فولاد جس کی
 بوند بوند میں ہے فولاد کی طاقت۔ خاندان کے ہر فرد کے لئے
 شربت فولاد جو رکھے دن بھر جاق و چوبند۔

- بڑھتی عمر کے لئے
- بیماری کے بعد کمزوری دور کر کے
- زمانہ حمل میں موثر



تسلی

اسٹڈی ملکی سی روشنی میں ڈوبی ہوئی تھی اور وہ رائٹنگ ٹیبل پر جھکے لپ کی مدھم روشنی میں کئی کتابیں سامنے رکھے نوٹس بنانے میں مگن تھا۔

”خزیمہ! اب بس بھی کریں، بہت نوٹس بنالے آپ نے، اب پلیز سونے چلیں۔“ عروشمہ نے اسٹڈی میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

”جان عزیز! بس 5 منٹ اور، نوٹس مکمل کرلوں ورنہ اسٹوڈنٹس کو پراہم ہو جائے گی۔“ خزیمہ نے منت کی۔

”کل مکمل کر لیجئے گا ورنہ آپ کے دونوں شہزادے پھر جاگ جائیں گے اور میں ان کو سلانے کی سعی میں پکان ہو جاؤں گی۔“ عروشمہ نے اسے اٹھانے کی دوبارہ سعی کی۔

”ان شہزادوں کو دنیا میں تشریف لائے 3 دنوں کا عرصہ گزر چکا ہے، اور تم نے ابھی تک ان کے نام بھی نہیں رکھے؟“ خزیمہ فاروقی نے محبت بھری نظروں سے اپنی حسین بیوی کو اپنے مقابل کرسی پر بٹھاتے ہوئے استفسار کیا۔

”وہ تو میں نے کب کے سوچ رکھے ہیں۔“ عروشمہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے آگاہ کیا۔

”کیا واقعی.... پھر تم نے ابھی تک مجھے بتایا کیوں

”نہیں؟“ خزیمہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہنادوں گی جناب! اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ عروشمہ نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ہائی بھری۔

”اب بتا بھی دو، مجھے بھی تو اپنے شہزادوں کے نام پتہ لگیں۔“ خزیمہ نے اس کے مرمیں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے کہا۔

”Newton اور Einstien“ عروشمہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”ہاہا.... حد ہوگئی عروشمہ! تم بھی نا، بالکل پاگل ہو۔“ خزیمہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی دراز ڈھکیں بکھیریں۔

”بھی سے کیا مراد ہے اور بھی لڑکیاں پاگل تھیں آپ کے لیے؟“ عروشمہ نے مصنوعی دھکی سے گھورا۔

”ایک ہو تو بتاؤں بھی، اب تو سب ہی ذہن سے نکل چکی ہیں۔“ خزیمہ نے چھیڑا، عروشمہ نے اسے ہنسنے چوتوں سے گھورا تھا۔

”نہیں جناب! بس تم ہی میری پہلی اور آخری چاہت ہو عروشمہ! اچھا یہ تو بتاؤ میرے اتنے کیوٹ بچوں کو تم نے یہ نام کیوں دیئے؟“ خزیمہ نے اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں اپنی کالی بھنورا آنکھیں جذب



کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”بچوں کے ڈیڑی کو فرس سے لگاؤ اس قدر ہے کہ یہی دو نام نہایت موزوں لگے تھے، آپ کو پسند نہیں آئے؟“ عروشمہ نے اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں..... بہت پسند آئے، تم دنیا کی میٹ وائف ہو جی، کہ شادی کے بعد بھی میری اتنی محبت روٹین جاری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ برائے فیوچر اکیڈمی کا ساتھ بھی، تم نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔“ خزیمرہ نے اعتراف کرتے ہوئے اک بھر پور نظر اس پر ڈالی تھی۔

”چلیں خزیمرہ! ورنہ دونوں جاگ جائیں گے۔“ عروشمہ نے اس کی نگاہوں سے پزل ہوتے ہوئے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، خزیمرہ فاروقی عروشمہ کے ہاتھ تمام کر بیڈ روم کی اور بڑھ گیا۔ دونوں شہزادے نیند کی وادیوں میں گم تھے۔

”عروشمہ! جھینک یو سوچ! تم نے مجھے ٹمنس بابا کا ڈیڑی بتا دیا۔“ خزیمرہ نے اس کے ہاتھ آنکھوں سے لگائے تھے، شدت جذبات سے عروشمہ کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

”میں آپ سے بے حد محبت کرتی ہوں خزیمرہ! اور ابھی بھی آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔“ عروشمہ نے ہنسنے لگی آنسوؤں کے درمیان جملہ ادا کیا تھا، وہ پیاری لڑکی آنکھوں کے راستے خزیمرہ فاروقی کے دل میں اتر رہی تھی، اس نے بے حد محبت سے اپنی زندگی کو خود میں سمیٹا تھا۔

☆.....☆.....☆

گھر میں ملازموں کی بڑی تعداد موجود تھی، مگر وہ خزیمرہ کے کام خود ہی کیا کرتی تھی، بریک فاسٹ

ڈاننگ پر سجا کر وہ خزیمرہ کو جگانے کی غرض سے روم میں آئی تھی، خزیمرہ روم میں موجود نہیں تھا، وہ شاید لے رہا تھا۔ روم ملکی روشنی میں ڈوبا ہوا تھا، اس نے کھڑکیوں سے دبیز پردے ہٹائے تھے، روشنی کے باعث دونوں شہزادے تھوڑا سا کسمسائے تھے، وہ انہیں محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بے ساختہ ان پر جھکی تھی۔

”صبح بخیر میری زندگی!“ خزیمرہ نے اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے دس کیا، اچانک اقدار پر وہ بے ساختہ مڑی تھی، کئی شرارتی چوڑیوں نے ماحول میں شور برپا کر دیا تھا، وہ جھپکے بالوں کو ٹاول سے خشک کرتا نہایت معصوم لگ رہا تھا۔

”آپ بھی ناں!...!“ عروشمہ نے کہتے ہوئے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”کیا میں بھی ناں!... میری جان!“ شوشی سے کہتے ہوئے خزیمرہ نے اس کی ریڈ چوڑیوں سے بھری کلائی تھامتے ہوئے استفسار کیا۔

”یہی کہ آپ بے حد برے ہیں۔“ عروشمہ نے آہستگی سے کہا۔

”مگر تم تو بے حد اچھی ہو۔“ خزیمرہ نے پللیں جھپکائے بغیر اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا جی، اب چلیں بریک فاسٹ تو کر لیں۔“ عروشمہ نے کہا۔

”کو تو جاننا! احزان فاروقی اور اذہان فاروقی کو پیار تو کر لینے دو۔“ وہ یہ کہہ کر بے بی کاٹ کی جانب بڑھا۔

”آپ نے دونوں کے نام بھی رکھ دیئے؟“ عروشمہ نے خیر سے پوچھا۔

”میں نے تو Einstein اور Newton نام رکھا ہے میرے کیوٹ سے بچوں کا اور میں نے بھی ان کے

نام رکھ دیئے پسند آئے تمہیں؟“ خزیمرہ نے مسکراتی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے، احزان اور اذہان کو پیار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”بے حد پیارے نام ہیں۔“ عروشمہ نے مسکرا کر تائید کی، احزان اور اذہان کو پیار کرنے کے بعد عروشمہ کے ہمراہ وہ ڈاننگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

”تم اب تک سوئی نہیں؟“ اسٹڈی روم سے نکلتے ہی اس کی نظر عروشمہ تک گئی، جو بلیک نائٹ ڈریس میں احزان کو تھپک رہی تھی، اس کی نظریں چھت پر مرکوز تھیں، وہ ارد گرد سے یکسر بے نیاز تھی، خزیمرہ کی بات شاید اس نے سنی ہی نہیں تھی۔

”عروشمہ! کیا ہوا، کیا سوچ رہی ہو؟“ عروشمہ کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے خزیمرہ نے قدرے پریشانی سے استفسار کیا، 14 ویں کے چاند کی روشنی عروشمہ کے چہرے پر پڑ رہی تھی، کتنا حزن و ملال تھا اس کے چہرے پر، خزیمرہ فاروقی نے بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔

”کچھ بھی نہیں سوچ رہی ہوں۔“ عروشمہ نے قدرے چونک کر مصنوعی مسکراہٹ سے کہا۔

”بتاؤ ناں عروشمہ! مجھ سے پھر کوئی خطا سرزد ہوگئی ہے؟“ خزیمرہ نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں جذب کرتے ہوئے متذبذب ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

”نہیں تو، آپ سے کیوں کر خطا ہوگی، بس ذہن ادھر ادھر الجھ گیا تھا۔“ خزیمرہ کو بغور دیکھتے ہوئے عروشمہ نے کہا تھا جو نہایت متلا نظر آ رہا تھا اس کی کالی بھورا آنکھوں میں بے بسی تھی، چاند کی روشنی اس کے جاذب چہرے کو چھو رہی تھی، نکھرے براؤن بالوں اور متفکر چہرے کے ساتھ عروشمہ کو خزیمرہ بے حد پیارا لگا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو عروشمہ! تمہاری نظروں سے خوف آ رہا ہے مجھے، جو بھی تمہارے دل میں ہے پلیز کہہ دو ناں مجھ سے، تم کیوں نہیں کہتی ہو کچھ بھی، تنہا اپنے غم کہتی ہو، آج خاموش نہ رہو۔“ خزیمرہ فاروقی نے ہلکی سی گھبراہٹ سے کہتے ہوئے اسے خود سے قریب کیا تھا۔

”مما، پیار اور بھائی بے تحاشہ یاد آ رہے ہیں، میں خود آج ماں بنی ہوں، تو مجھے میری ماما کی تکلیفوں کا اندازہ ہو رہا ہے، انہوں نے کس قدر تکلیف اٹھائی ہے۔“ عروشمہ کا نازک وجود چٹکیوں کی زد میں تھا، خزیمرہ نے کرب سے اسے دیکھا تھا اور اس کے آنسو اپنی انگلیوں کے پوروں سے صاف کرنے لگا۔

”زندگی اردو نہیں پلیز۔“ خزیمرہ نے اس کا سراپے شانے پر رکھا تھا، وہ اسے آج بے حد معصوم لگ رہی تھی جس کی زندگی دکھ، درد پر معمور تھی، وہ اسے ہولے ہولے اپنی تکلیف کی وجہ بتانے لگی۔

☆.....☆.....☆

”میں جب ایک سال کی تھی، جب میرے پیار کا قتل ہو گیا تھا، اس وقت میرا بھائی اظفر 3 سال کا تھا، ماما کہتی تھیں جب پیار کی باڈی گھر میں رکھی تھی، اس وقت میرے چاچو تمام پر اپنی پیپرز اور پیسے لے جا رہے تھے، میرے پیار کی کافی پر اپنی پیپرز، دادا جان کی آبائی زمینوں میں بھی پیار کا حصہ موجود تھا، میری ماما ان تمام باتوں سے آگاہ تو تھیں، مگر ان میں چاچو اور تاپا جی کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی، وہ بائیس سال کی عمر میں بیوہ ہوئی تھیں، چونکہ ماما اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں، ماما کی شادی کے کچھ عرصے بعد ہی نانی جان اور نانا جان وہی شفٹ ہو گئے تھے، ماما، پیار کی ہمراہی میں بے حد مطمئن تھیں، نانا اور نانی جان ماما کی جانب سے بے حد فکر مند رہتے تھے، انہیں پیار کی ڈیٹھ کا بہت

بعد میں پتہ لگا تھا اور پتہ لگتے ہی وہ ماما کے پاس آئے تھے، چند سالوں تک مانا اور نانی جان ہمارے ساتھ رہیں، میں اسکول میں ہی تھی جب مانا جان کو ہارٹ ایکٹ ہوا تھا اور وہ دنیا سے چلے گئے، ایک بار پھر ماما آسرا ہو گئی تھیں، نانی جان ماما کے غم کو سہتہ سہتہ کچھ ماہ کے بعد ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھیں، ہمارے اپنے اس قدر جلدی ہمارا ساتھ چھوڑ کر جا رہے تھے، ماما تو نڈھال ہی ہو گئی تھیں، انہیں بس اظفر اور مجھ سے ہی امید تھی اور وہ ہمارے لیے ہی زندہ تھیں، بے حد کنھن گزاری ہے ہم نے اپنی زندگی۔“ عروشمہ نے کراہ لی تھی۔

”اظفر اس قدر باغی ہو چکا تھا، ہمارے حالات بے حد ابتر تھے، چاچو تھوڑی سی رقم دے جایا کرتے تھے اور ماما سلائی سے ہمارے اخراجات پورے کیا کرتی تھیں، بس چھت اپنی تھی جو مانا جان ماما کے نام کر گئے تھے اس کا ہی آسرا تھا، اکثر اظفر ماما سے بحث کیا کرتا تھا وہ اپنا حق مانگتا چاہتا تھا، مگر ماما اسے ہمیشہ صبر کی تلقین کیا کرتی تھیں، ایک دن اظفر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔ ہمارے لیے وہ دن قیامت سے کم نہیں تھا، اظفر ماما کے لیے واحد سہارا تھا، اتنا ذہین تھا اظفر، میری پڑھائی کے پرائیمر وہ چیکلوں میں حل کر دیا کرتا تھا، اس کی روشن آنکھوں میں زندگی تھی وہ بے حد خوش شکل اور خوش مزاج تھا، آج بھی اظفر مجھے بے حد یاد آتا ہے، ان دنوں ماما پگل سی ہو گئی تھیں، بے انتہا صبر کرنے والی ماما کو صبر نہیں آ رہا تھا، اظفر ان کی متاع تھا اور وہ یوں ہمارا ساتھ چھوڑ دے گا ہم نے تو کبھی بھی نہیں سوچا تھا، جب بھی اپنی آنکھوں میں ہم نے سنے سجائے تھے اظفر کو بے حد قابل انسان کے روپ میں تصور میں دیکھا تھا، ہماری مختصر سی فیملی بھی تو بے انتہا خوش ہوگی، کبھی تو

ہمارے سکون کے دن آئیں گے، مگر یہ خیال، خیال ہی رہ گیا، کبھی بھی حقیقت نہیں ہوا، ہمارا گھر گھبرا گیا، آج بھی اس گھر کے ٹوٹنے کا دکھ مجھے بے چین رکھتا ہے۔“ عروشمہ کے آنسو مسلسل اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے، خزیمرہ اس کی تمام باتیں بغور سن رہا تھا۔

”اس وقت میں نے اپنی ماما کو سنبھالا تھا، میں جو نہایت کم ہمت واقع ہوئی تھی اس وقت نجانے مجھ میں اتنا حوصلہ کیسے آ گیا تھا، میں خود حیران تھی، ماما نے میرے لیے دوبارہ حوصلہ کیا تھا، مگر مجھے پتہ تھا وہ اندر سے کس قدر ٹوٹ چکی ہیں، راتوں کو اکثر انہیں میں روتا دیکھتی تھی وہ میرے مستقبل کے لیے بے حد پریشان رہا کرتی تھیں، بے حد مشکلوں سے میں نے MBA کیا تھا، بچوں کو نیوشنرز دے کر ماما کی سلائی کی ذمہ داری خود لے کر، پھر میں نے جاب کے لیے کئی جگہ اپلائی کیا، اللہ کا شکر ہے مجھے معقول جاب مل بھی گئی، پھر آپ سے بات طے ہوتے ہی ماما بے حد خاموشی سے مجھے تنہا چھوڑ نکلیں، اس وقت میں بالکل تنہا ہو گئی تھی، مگر اللہ نے مجھے در بدر ہونے نہیں دیا، آپ کے ڈیڈی اسی وقت اپنی بہو بنا کر ”فاروقی دلا“ لے آئے، آپ لوگوں کے بے انتہا احسان ہیں مجھ پر، میں آپ لوگوں کے احسان کا بدلہ کبھی بھی نہیں چکا پاؤں گی، میرے تمام محبت کرنے والے اس دنیا سے رخصت ہو گئے، فقط میں رہی ہوں، ڈیڈی کے روپ میں مجھے دوبارہ میرے پیالے گئے تھے، مگر وہ بھی ہمیں چھوڑ گئے، میں بس آپ کے لیے زندہ ہوں، اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو وہ دن شاید میری زندگی کا آخری دن ہوگا، کیونکہ اب مجھ میں ذرا بھی حوصلہ باقی نہیں ہے۔“ عروشمہ زار و قطار رو رہی تھی، اس کے رونے سے خزیمرہ کو بے انتہا تکلیف پہنچ رہی تھی اس کے دیوانہ وار رونے کے باعث احزان اور اذہان بھی رونے لگے تھے،

خزیمرہ کے لیے ان تینوں کو خاموش کروانا قدرے مشکل ہو گیا تھا، جیسے جیسے اس نے احزان اور اذہان کو سنبھالا تھا۔

”عروشمہ! تم کبھی مت ہو، تم ہمارے لیے رہ گئی ہو، مجھے، احزان اور اذہان کو تمہاری بے انتہا ضرورت ہے، عروشمہ! تم اداس نہیں ہوا کرو، حیرت کی بات ہے کہ میں تمہاری زیت کی اس تلخ حقیقت سے ابھی تک انجان رہا ہوں، مجھے تمہارے وجود سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا، وہ تو تم نے اپنی چاہت سے میرے دل میں اپنی محبت کے پھول کھلا دیے، مجھے جینا سکھایا، یقین کرو تمہارے آنسوؤں سے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے، تم ہمارے لیے خوش رہا کروانا۔“ خزیمرہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہہ رہا تھا، عروشمہ نے کچھ کہنا نہیں تھا بس اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر قدرے مطمئن لگ رہی تھی، خزیمرہ نے اس کی بے تحاشہ سوچی ہوئی آنکھوں کو کپ سے دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

”عروشمہ! میں آج ڈنر باہر کروں گا فریڈنز کے ساتھ، تم پلیز سو جانا، شاید مجھے آنے میں تھوڑی دیر ہو جائے۔“ وہ بیڈ پر اذہان کو گود میں لیے سلا رہی تھی، جب ہی احزان کو خود سے لگاتے ہوئے خزیمرہ نے کہا۔

”کیوں کوئی خاص وجہ ہے؟“ عروشمہ نے قدرے آہستگی سے استفسار کیا تاکہ دونوں جاگ نہ جائیں۔

”ہوں.... عاشق کا نکاح ہوا ہے، اس نے تمام فریڈنز کو ڈنر دیا ہے۔“ خزیمرہ نے بتایا۔

”اوکے، ٹھیک ہے آپ جلدی آجائے گا، اکیلے میں بے حد خوف آتا ہے، جب سے ڈیڈی کی وفات ہوئی ہے اکیلے پن سے دل ہولنے لگتا ہے۔“ عروشمہ نے اذہان کو بستر میں اس پر کیبل ڈالتے قدرے افسردگی سے کہا تھا۔

”ہاں یہ تو تم نے بالکل درست کہا ہے، ڈیڈی تھے تو خوب رونے لگے، ہوا کرتی تھی۔“ خزیمرہ نے احزان کو عروشمہ کے حوالے کرتے ہوئے تاسف سے کہا۔

”اب آپ اداس نہ ہوں۔“ عروشمہ نے خزیمرہ کے ہاتھ تھامے۔

”اوکے میری زندگی! اب میں تیار ہو جاؤں، ورنہ عاشق میری جان لے لے گا۔“ عروشمہ کے رخسار کو ہاتھ لگاتے ہوئے محبت سے کہہ کر وہ واش روم کی اور بیڈ گیا، عروشمہ مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

رات کا نجانے وہ کون سا پہرہ تھالیپ کی مدد میں روٹی میں کرہ ڈوبا ہوا تھا، جب احزان کے رونے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی، حواس پوری طرح بحال ہی نہیں ہوئے تھے جب اس کی نگاہ بیڈ کی دوسری جانب گئی، خزیمرہ گھر نہیں آیا تھا، احزان کو خود سے لگائے وہ گھڑی کی جانب دیکھنے لگی، گھڑی رات کے 3 بج رہی تھی، جب بھی خزیمرہ دوستوں میں ہوتا تھا 1 بجے اس کی واپسی ہو جایا کرتی تھی، ڈیڈی کے گزر جانے کے بعد وہ دیر رات تک باہر رہنے سے اجتناب برتتا تھا، مگر اس وقت رات کے 3 بج رہے تھے، اس نے ارد گرد ٹیول کے نیل فون تلاش کیا تھا اور خزیمرہ کو کال کرنے لگی، مگر اس کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا، عروشمہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، آنسو تو اتر سے رخسار پر لڑھک رہے تھے، احزان کے ساتھ اذہان بھی جاگ کر رونے میں مشغول ہو چکا تھا، دونوں بچوں کو سنبھالنے کے ساتھ اپنے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کیے وہ مستقل اس کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی، ہر بار اس کا نمبر آف مل رہا تھا، اس کے دل میں ڈھیروں دسو سے آسمانے تھے، وہ بیڈ پر مردہ سی بیٹھی دعائیں کرنے میں مشغول تھی، صبح کے 5 بجے مین ڈور

کے لاک کھولے جانے پر وہ دوڑ کر رانداری تک گئی تھی، بیڈروم سے مین گیٹ کا راستہ اس نے چند لمحوں میں طے کیا تھا، خزمہ، عاشر، حمزہ اور دوسرے لڑکوں کے ہمراہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا، اس کے ہاتھوں اور چہرے پر زخموں کے نشانات بے حد واضح تھے، وہ عاشر کے سہارے سے چل رہا تھا، اس کا ایسا حال دیکھ کر عروشمہ کا سر جھکانے لگا۔

”خزمہ کو کیا ہوا ہے؟“ آگے بڑھ کر اس نے بے اختیار پوچھا۔

”بھائی! آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں، اس کا معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، ابھی ہم ہسپتال سے ہی آرہے ہیں۔“ عاشر نے تمام رو داد کہہ سنائی اور خزمہ کے ہمراہ ان کے بیڈروم میں داخل ہوئے، خزمہ کو بستر میں لٹا کر تمام دوست عروشمہ کو دلا سے دے کر چلے گئے تھے، وہ عائبہ دماغی سے تمام کارروائی دیکھتی رہی۔

”خزمہ! کیسے ہوا یہ سب، آپ ٹھیک ہیں ناں؟“ عروشمہ نے اسے جھجھوڑا والا، آنسو ختم نہیں رہے تھے، وہ نیم بے ہوشی میں تھا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، عروشمہ کئی گھنٹے اس کے پاس بیٹھی رہی، اس کے زخم خوردہ وجود کو بے بسی سے دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے ارد گرد دیکھا سر میں درد کی نیلیں اٹھ رہی تھیں، عروشمہ اس کے سامنے بیٹھی بچوں کو تیار کر رہی تھی، اس کی توجہ خزمہ کی جانب ہی تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ عروشمہ نے محبت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ خزمہ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا آپ لیٹر رہیں، میں آپ کے لیے بریک فاسٹ لے کر آتی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر بچوں کو کاٹ میں ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کوئی میری زندگی؟“ خزمہ نے معصومیت سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ اچھل تھام لیا، وہ فوراً پلٹی تھی۔

”جی کیسے!“ وہ بیڈ پر اس کے پاس براہیمان ہو گئی۔

”تم اتنی اداس کیوں ہو؟ اور رو رو کر آنکھیں بھی سوجا لی ہیں، بچوں والی حرکتیں اب تک تمہاری گئی نہیں؟“ خزمہ نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔

”میں اپنے تمام تر عزیزوں کو کھود دینے کے بعد آپ کو کھونے کا ذرا بھی حوصلہ نہیں رکھتی، میں آپ کو پہلے ہی باور کروا چکی ہوں۔“ عروشمہ نے آنکھوں میں آنسو لیے کہا تھا خزمہ نے دلچسپی سے اس دیوانی کو دیکھا تھا۔

”اتنی جلدی ایسے میں جانے کا ہرگز بھی نہیں ارادہ نہیں رکھتا، تم بے فکر رہو۔“ خزمہ نے شوفی سے کہا، عروشمہ نے شکایتی نگاہوں سے اسے بغور دیکھا تھا، اس کے سپید چہرے پر زردیاں کھنڈی تھیں، اس کی زندگی سے بھرپور آنکھوں میں درد رقم تھا، اس نے حیرت سے ارد گرد سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھا تھا۔

”خوبصورت لڑکا پہلی بار دیکھ رہی ہو؟“ خزمہ نے اس کی بیہوش گرین آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتے ہوئے شرارت سے کہا تھا، ہاتھوں پر جا بجا بینڈ تاج تھی، عروشمہ نے اثبات میں سر ہلا کر اس کے براؤن بال کھینچے تھے اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم ڈانگ بریک فاسٹ لگاؤ میں 5 منٹ میں آتا ہوں، یقیناً تم نے بھی بریک فاسٹ نہیں کیا ہوگا۔“

خزمہ نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بالکل درست قیاس آرائی کی تھی۔

”نہیں میں یہیں لے آتی ہوں۔“ عروشمہ نے آخر کی۔

☆.....☆.....☆

رات جب وہ سونے کی غرض سے بستر میں لیٹی تو کئی دوسروں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا، اسے کل سے شک سا ہو رہا تھا، کہیں خزمہ نے دوبارہ ڈرنک تو نہیں کی، اس نے مڑ کر خزمہ کی جانب دیکھا وہ اپنے دونوں شہزادوں کے ہمراہ نیند کی وادیوں میں گم تھا، سوتے ہوئے وہ بے حد پیارا لگ رہا تھا، براؤن بال اس کی صبح پیشانی کو چھو رہے تھے، ایک ہاتھ سینے پر دوسرا ہاتھ احزان اور اذہان کے سر پر تھا، وائٹ شلوار سوٹ میں اس کی جاذبیت ہی الگ تھی، بیلیوٹ بلب کی مدھم روشنی میں اس کا شفاف چہرہ جگمگا رہا تھا۔

”کاش! خزمہ نے دوبارہ وہ غلطی نہ کی ہو۔“ عروشمہ نے کرب سے سوچ کر اس کی جانب سے نگاہیں ہٹا کر آنکھیں بند کر لی تھیں، آنکھیں بند کرتے ہی اس کے ذہن کی اسکرین میں ماضی کا بھیانک عکس جھلکانے لگا۔

☆.....☆.....☆

خزمہ فاروقی اور عروشمہ وقار کی اربن میرج تھی، خزمہ فاروقی این۔ای۔ڈی یونیورسٹی سے الیکٹریکل انجینئر تھا، عروشمہ وقار نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔بی۔اے کر رکھا تھا اور وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں

M.D کے عہدے پر کام کر رہی تھی، ولید انکل (خزمہ کے ڈیڈی) نے عروشمہ کو اس کے آفس میں خزمہ کے لیے پسند کیا تھا، چونکہ ولید صاحب کے عروشمہ کے کمپنی سے اچھے مراسم تھے، وہ سبھی ہوئی لڑکی انہیں اپنے غرور کے نشے میں ڈوبے بیٹے کے لیے بے انتہا پسند آتی تھی، اور وہ عروشمہ کو مانگنے اس کے گھر چل دیے تھے، رشتہ نہایت موزوں تھا، عروشمہ کی والدہ نازیہ بیگم، خزمہ فاروقی سے مل چکی تھیں، وہ اپنی بیٹی کی قسمت پر نازاں تھیں، اللہ نے انہیں ان کی اوقات سے بڑھ کر نوازا تھا،

ان کے دل میں اطمینان اتر آیا تھا، یوں دونوں ایک دوسرے سے منسوب ہوئے، بے حد چھوٹے پیانے پر ان کی معشوقی کی گئی تھی، نازیہ بیگم کے لیے سادگی کو ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا، خزمہ فاروقی کی اپنی کوئی پسند نہ تھی، اسی لیے اس نے ولید صاحب کی پسند سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، شادی کے چند روز پہلے ہی نازیہ بیگم اس دار فانی سے کوچ کر گئیں اور یوں عروشمہ وقار فوری طور پر عروشمہ خزمہ فاروقی بن کر فاروقی ولا آ گئی تھی، جب وہ خزمہ کی زندگی میں آئی تو اسے اس بات کا علم ہوا کہ خزمہ ڈرنک کرنے کی بری عادت میں مبتلا تھا اور انکل ولید بیٹے کی اس عادت سے بخوبی واقف تھے، عروشمہ کے لیے سوائے فاروقی ولا کے کوئی اور جائے پناہ نہ تھی، اس نے اپنی زندگی کا مقصد خزمہ کی اس عادت کو چھڑانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ چند ہی دنوں میں خزمہ کے انداز و اطوار بخوبی جان گئی تھی، وہ اسے مستقل نظر انداز کیا کرتا تھا اور اپنے کام سے کام رکھا کرتا، اکثر وہ دیر رات گھر آتا تھا اور جب آتا تو اسے خود کا بھی ہوش نہیں ہوتا تھا، عروشمہ کے لیے یہ سب کچھ برداشت کرنا بے حد مشکل تھا، عروشمہ بیڈ پر لیٹی تھی آدھی رات کا وقت اور خزمہ اب تک باہر تھا، وہ جاگ کر اس کا انتظار کرنے

گئی، اسی وقت بکلی سی دستک دے کر خزیمرے کمرے میں داخل ہوا، اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں، عروشمہ کو اسے اس حال میں دیکھ کر بے حد خوف آیا کرتا تھا۔

”خزیمہ! کھانا لگاؤ؟“ عروشمہ نے کھڑے ہو کر ڈرتے ڈرتے استفسار کیا، وہ جو جوتوں کے تسمے کھول رہا تھا غضبناک نظروں سے اسے گھورنے لگا، اس کے اس طرح دیکھنے سے عروشمہ کی جان ٹپکنے لگی تھی، مگر اس نے ہمت مجتمع کر کے پانی گلاس میں انڈیلا تھا اور اس کی اور بڑھانے لگی۔

”تم جاؤ یہاں سے“ خزیمہ نے تیز لہجے میں کہا۔
 ”پانی پی لیں“ عروشمہ نے گلاس اسے تھمایا۔
 ”کہا ہے ناں، جاؤ یہاں سے، تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی؟“ خزیمہ نے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا، گلاس پانی سمیت زمین بوس ہو گیا تھا، خزیمہ اسے نظر انداز کرتے جوتے پہنے بیڈ پر الٹا بیٹھا تھا وہ اس کے جوتے اتار کر ٹونے کا ٹچ کر کیڑیاں سمیٹنے لگی، بے دھیانی میں متعدد کیڑیاں اس کی نرم ونازک انگلیوں میں چبھ گئی تھیں، اس کے آنسو مسلسل اس کے رخساروں پر گر رہے تھے، رات اس نے سسکتے ہوئے گزاری تھی، شاید اس کی زیت غلوں سے معمور تھی اسے ایسا ہی لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

”السلام علیکم، صبح بخیر!“ خزیمہ کے جاگتے ہی عروشمہ نے اپنے موڈ کو خوشگوار بناتے ہوئے دوش کیا تھا۔
 ”وعلیکم السلام!“ جواب دے کر وہ واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ جب وہ شاور لے کر باہر آیا تو عروشمہ ناشتے سے مزین ٹرے لیے بیڈ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”آئیں بریک فاسٹ کر لیں، ڈیڈی کو بھی بریک

فاسٹ کروادیا ہے، وہ ریست کر رہے ہیں۔“ بریڈ پر کھنکھناتے ہوئے عروشمہ بتانے لگی۔
 ”اوکے“ خزیمہ نے سرسری جواب دیا۔
 ”خزیمہ! آپ نے رات ڈرنک کیوں کی تھی؟“

عروشمہ نے اسے توس پکڑاتے ہوئے استفسار کیا۔
 ”تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟ تمہیں منع کیا ہے ناں، میرے پرستلوں میں نہ گھسا کرو، تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آتی؟“ بریک فاسٹ کرتے خزیمہ نے اسے گھورتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں کہا تھا۔
 ”خزیمہ! شراب حرام ہے“ عروشمہ نے اس کی گھور کالی آنکھوں میں اپنی ہیزل گرین آنکھیں گاڑتے پراعتدالہجے میں کہا۔

”تم مجھے حلال اور حرام میں تمیز سکھاؤ گی؟ ڈیڈی نے خواہ مخواہ معلوم کرے گلے باندھ دیا ہے، میں تم سے تنگ آ گیا ہوں، آئندہ تم نے میرے پرستل میں کوئی آرگیمنٹ پاس کیا ناں تو تمہاری جان لے لوں گا۔“ وہ جارحانہ انداز میں کہہ کر چائے کا گڑے میں پٹخ کر کمرے سے باہر نکل گیا، عروشمہ کی آنکھیں بے اختیار چھلکی تھیں، جانے وہ کیسا شخص تھا وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆.....☆.....☆

دن یوں ہی گزرتے گزرتے ان کی شادی کو 2 سال کا عرصہ گزر چکا تھا، مگر ابھی بھی خزیمہ کو اپنی ذمے داریوں کا احساس نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس نے ڈرنک کرنا چھوڑی تھی۔

”آج آپ کے فرینڈ نے ڈنر دیا ہے، میں کون سا ڈریس پہنوں؟“ عروشمہ نے ڈھیر سارے کپڑے پھیلا کر خزیمہ سے استفسار کیا جو باڈی اسپرے لگانے میں مشغول تھا۔

”کوئی سا بھی پین لو، کون سا تمہیں ڈنر میں جانا ہے۔“ خزیمہ نے باڈی اسپرے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر سیٹی بجاتے ہوئے اس کا عکس آئینے میں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”خزیمہ! ہماری شادی کو 2 سال کا عرصہ گزر چکا ہے، آپ کو آپ کی ذمے داریاں آخر کب سمجھ آئیں گی، آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟“ عروشمہ نے قدرے تیز لہجے میں کہا تھا۔

”اوپچی آواز مجھے پسند نہیں ہے، آئندہ دھیان رکھنا، آج زبان سے سمجھایا ہے، اب ہاتھ سے سمجھاؤں گا۔“ عروشمہ کی ٹھوڑی کو اپنی شہادت کی انگلی سے اٹھا کر خزیمہ نے نہایت وحشیانہ انداز میں کہا تھا۔

”میں آج ڈنر میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ عروشمہ نے اس کی انگلی اپنی ٹھوڑی سے ہٹا کر تنک کر کہا تھا اور ڈریس سلیکٹ کر کے تیار ہونے لگی۔

”اوکے چلنے کا شوق ہے تو چلو، مجھے اس سے کیا، میری ریش ڈرائیونگ سے مرور کیں تو مجھے دوش مت دینا۔“ خزیمہ نے کف ٹکس لگاتے ہوئے نہایت سفاکی سے کہا تھا۔

”ہاں مر جاؤں تو بہتر ہے، آپ کو خوشی ہوگی ناں، اور میری موت سے واقعی آپ خوش ہوں گے تو میں چاہوں گی کہ واقعی میں مر جاؤں۔“ عروشمہ نے اپنے لمبے بالوں کو برش کرتے ہوئے بھرپور جواب سے نوازا تھا اس کے اس طرح دودھو جواب دینے سے خزیمہ اسے تنیکے چوتوں سے مستقل گھور رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

خزیمہ تیار ہو کر بیڈ روم سے جا چکا تھا وہ بھی جلدی سے اپ اسٹک کو فائل ٹیچ دے کر لان کی جانب آنے لگی، جب وہ تیار ہو کر لان میں آئی تو خزیمہ اسے دیکھنے

لگا، شاید آج اس نے پہلی بار عروشمہ کو اتنا سچا بنا دیکھا تھا، شاکنگ پنک اور بلیک ساڑھی میں اس کی چھپ ہی نہ رہی تھی، وہ اسے بنا پلٹیں جھپکائے دیکھنے لگا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں، بے حد خوبصورت لگ رہی ہوں ناں؟“ عروشمہ نے ساڑھی کا پلو پکڑتے ہوئے خزیمہ کو ہٹکا دیا۔

”نہ..... نہ..... نہیں اتنی زیادہ بھی خوبصورت نہیں لگ رہی ہو۔“ خزیمہ فاروقی نے اپنی تمام تر حسیات کو جگاتے ہوئے گڑبڑا کر نگاہوں کا زاویہ بدلتے ہوئے جھوٹ کہا اور کار کا ڈور وا کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا، عروشمہ بھی فرنٹ ڈور وا کیے اس کے مقابل براجمان ہو گئی، راستے میں دونوں نے ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ ریسٹوٹن پر خزیمہ کے فرینڈز اس کا انتظار کر رہے تھے، متعدد فرینڈز میر ڈھتے اور چند ایک پینچلر لائف گزار رہے تھے۔

”السلام علیکم بھابی! آپ بے حد خوبصورت لگ رہی ہیں، خزیمہ تو آپ کے آگے کچھ بھی نہیں لگ رہا۔“ حمزہ نے خزیمہ کو دیکھتے ہوئے قدرے چپک کر کہا، خزیمہ نے کھا جانے والی نظروں سے حمزہ کو دیکھا تھا، عروشمہ نے مسکراتی نگاہ خزیمہ پر ڈالی تھی اور آگے بڑھ گئی، حاضرین ان کی جوڑی کو بے حد سراہ رہے تھے، وہ خزیمہ کے ساتھ پہلی مرتبہ اس طرح کے فنکشن میں آئی تھی، خزیمہ فاروقی کے ہم قدم چلتے ہی ٹکس سننے کو ل رہے تھے۔

”جوڑی تو Out Standing ہے پر لڑکی زیادہ پیاری ہے۔“ اس کمنٹ پر عروشمہ فاروقی کی مترنم ہنسی بے ساختہ تھی، خزیمہ اسے وہیں چھوڑ کر عاشر حمزہ کی جانب بڑھ گیا تھا، اسے عروشمہ کی تعریف ایک آنکھ نہ بھائی تھی، مغرور، امیر، جاذب نظر کو الیغائیز اور برنس

ٹائیکون خزمہ کی اتا پر بات بن آئی تھی، وہ جو ملک ڈنر سوٹ میں بے حد پینڈر لگ رہا تھا سب اسے نظر انداز کیے عروشمہ کو سراہ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی وہ عروشمہ کو اپنے ساتھ پارٹی میں لانے سے اجتناب برتنا تھا۔

☆.....☆.....☆

”خزمہ! چلیں بہت دیر ہو گئی ہے۔“ عروشمہ، خزمہ تک آئی تھی، تمام مہمان اپنے گھر کی راہ لے رہے تھے، خزمہ نے اک قبر بھری نظر اس پر ڈالی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، دوستوں سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ اسے بنا کچھ کہے آگے چل رہا تھا، عروشمہ کو اس کی نظروں سے بے طرح خوف آیا تھا، اس کی قبر بھری نظریں اس کی ریزہ کی ہڈی میں سرایت ہوتی محسوس ہوتی تھیں، وہ بنا کچھ کہے اس کے مقابل براجمان ہو گئی تھی، خزمہ نشے میں تھا، اس نے ترحم بھری نظروں سے خزمہ کو دیکھا تھا۔

”آپ نے دوبارہ ڈرنک کیا ہے؟“ عروشمہ نے ڈرتے ڈرتے استفسار کیا تھا۔

”تمہیں ہزار بار منع کیا ہے کہ میرے پرسنل میں انٹرفیر نہیں کرنا، مگر پھر بھی تم باز نہیں آئیں؟“ خزمہ نے ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔

”گاڑی دیکھ کر چلائیں ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے۔“ سامنے سے ٹالر آتا دیکھتے ہوئے عروشمہ نے گھبرا کر کہا تھا۔

”اب تمہیں اپنی جان کی پرواہ ہو رہی ہے، تمہیں مرنے کا بے حد شوق تھا نا، لو آج تمہاری یہ خواہش پوری کر دیتا ہوں۔“ وہ شاید اپنے حواسوں میں نہ تھا یہ کہہ کر اس نے کاری اسپینڈ بڑھائی تھی اپنے حواسوں میں عروشمہ نے یہی منظر دیکھا تھا کہ کارٹر اسے ٹکرائی ہے۔

”عروشمہ! اٹھو، عروشمہ! آنکھیں کھولو، عروشمہ! جاگوناں!“ خزمہ گھٹنوں کے بل سرک پر بیٹھے عروشمہ کو ہوش میں لانے کے لیے جتن کر رہا تھا، اس کی پکار میں دیوانگی تھی، ٹالر سے کار کے ٹکراتے ہی خزمہ گاڑی سے باہر گر گیا تھا، اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں، عروشمہ ایکسیڈنٹ سے بری طرح متاثر ہوئی تھی وہ ہوش و خرد سے بیگانہ سرک پر پڑی تھی، شاکنگ پنک اینڈ بلیک ساڑھی خون سے تر ہو رہی تھی، اس کی حالت بے حد نازک تھی، عروشمہ کی حالت دیکھ کر خزمہ کا نشہ بھی اتر چکا تھا، وہ دیوانہ وار اسے پکار رہا تھا، ارد گرد لوگوں کا جم غفیر لگ چکا تھا، ایبولینس آگئی تھی، عروشمہ کو ہاسپٹل لے جایا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

عروشمہ ICU میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی، اسے بے حد گہرے زخم آئے تھے، خزمہ نے ہمت مجتمع کر کے ڈیڈی کوفن کر کے پویشیں سے آگاہ کر دیا تھا، وہ بھی ہاسپٹل آگئے تھے اور آتے ہی زوردار تھپڑ انہوں نے خزمہ کے گالوں پر رسید کیا تھا، خزمہ ڈیڈی کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”ڈیڈی!“ اس نے بس اتنا ہی کہا تھا، شدت گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”تمہاری ماں نے بے حد کم عمر پائی تھی، اگر وہ زندہ بھی ہوتی تو سر جاتی، تم شراب جیسی عادت میں مبتلا ہو گئے خزمہ! مجھے تم پر افسوس ہو رہا ہے، تمہاری وجہ سے اس معصوم کی زندگی خطرے میں ہے، اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی تمہیں معاف نہیں کروں گا۔“ ولید فاروقی نے نہایت طیش میں یہ تمام باتیں کہی تھیں اور خود ICU کے باہر کھڑے ہو کر عروشمہ کی نئی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے، ڈاکٹر کے باہر آتے ہی خزمہ

تیزی سے چلتے ہوئے ڈاکٹر تک آیا تھا۔

”ڈاکٹر! میری وائف کیسی ہیں؟“ خزمہ نے جلدی جلدی استفسار کیا، ولید صاحب نے بیٹے کی یہ تڑپ پہلی بار دیکھی تھی، وہ عروشمہ سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا تھا، آج انہیں بیٹے کے اس والہانہ انداز نے حیرت میں ڈال دیا تھا۔

”Patient کی حالت بے حد نازک ہے، بس دعا کریں۔“ ڈاکٹر بس اتنا کہہ کر اسے میڈیسن کی سلیپ تنہا کر اندر جا چکے تھے، خزمہ شکست خوردہ سا وہیں جم سا گیا، اس کا الجھا نکھر اعلیٰ، تک سب سے تیار رہنے والا خزمہ مٹی سے اٹے کپڑوں میں موجود تھا، براؤن بال نکھرے ہوئے تھے، کالی بھنورا آنکھوں میں ندامت کے آنسو موجزن تھے، ولید فاروقی نے کرب سے بیٹے کو دیکھا تھا، اس لڑکی کے لیے اس کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے جو اس سے بے تحاشہ محبت کرتی تھی، بنا کہے اس کے کام کر دیا کرتی تھی، وہ بھی تو اسے چاہتا تھا، مگر اپنی انا، ضد اور غرور کے نشے میں محبت کہیں کھوی گئی تھی، ڈیڈی نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے گھر بھیج دیا تھا۔ جب وہ دوبارہ ہاسپٹل آیا تو فجر کی اذان ہو رہی تھی، اس نے وہیں نماز پڑھی، اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب بھی ڈرنک نہیں کرے گا، وہ اللہ کے حضور رجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں اور عروشمہ کی زندگی کی دعائیں کر رہا تھا، اس کے آنسو مسلسل اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

”خزمہ! تمہیں ایک موقع ملا ہے، عروشمہ خطرے سے باہر ہے۔“ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ڈیڈی نے سرور ہوتے ہوئے بتایا تھا۔ وہ بے اختیار ڈیڈی سے لپٹا تھا اور معصوم بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا، ولید صاحب کے لیے اسے سنبھالنا نہایت مشکل ہو گیا

تھا، وہ واقعی بے حد معصوم تھا، انہیں احساس ہو رہا تھا کہ خزمہ نے ماں کے بغیر زندگی گزاری ہے وہ ماں کی محبت سے محروم رہا تھا، آج بھی اس میں بچپنا تھا، ولید فاروقی کی بھی پللیں جھینگے لگی تھیں، وہ محبت سے محروم لڑکا بری عادتوں میں مبتلا ہو گیا تھا، عروشمہ کی محبت اسے اچھی تو لگتی تھی، مگر وہ اپنی جھوٹی انا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا۔

☆.....☆.....☆

عروشمہ پرائیویٹ وارڈ میں شفٹ ہو چکی تھی، مگر وہ دواؤں کے زیر اثر ہوش و خرد سے یکسر بیگانہ تھی۔

”میں ذرا آرام کروں، تم عروشمہ کا دھیان رکھو۔“ ولید فاروقی اسے تنہا ہی فراہم کر کے یہ کہہ کر گھر جا چکے تھے۔ خزمہ نے ہائی بھری تھی، وہ عروشمہ کا ہاتھ تھامے سر جھکائے بیڈ کے برابر والی شیٹ پر براجمان تھا، اس کے ہاتھوں میں ڈرپ لگی ہوئی تھی، اس کا زخموں سے چور وجود اسے ندامت میں مبتلا کر رہا تھا، عروشمہ نے ہولے سے اپنا دایاں ہاتھ خزمہ کے سر پر رکھا تھا، خزمہ نے بے ساختہ سر اٹھایا تھا، عروشمہ کی پوٹل آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

”میری زندگی! مجھے معاف کر دو، تم پلیز جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔“ خزمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند شفاف قطرے نپٹے تھے، عروشمہ نے تھیرے اسے دیکھا تھا اس نے کبھی بھی خزمہ کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ عروشمہ نے بمشکل جملہ ادا کیا تھا، وہ اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگائے بیٹھا تھا۔

”آپ اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ عروشمہ نے دھیمی مسکان لبوں پر لاتے قدرے آہستگی سے کہا تھا۔

”عروشمہ! تم کچھ نہ کہو۔“ خزمہ نے اپنی شہادت کی

انگی اس کے لبوں پر رکھ دی تھی، عروشمہ کے دلکش نینوں میں چلتے مڑگان ڈبیز عبور کر کے ان نینوں کے پہرے دار بن گئے تھے۔

”اب تم روؤ نہیں، میرے کیے کی سزا تم نے بھل گئی ہے، عروشمہ! ماں کی محبت سے میں محروم رہا، ملازموں کے ہاتھوں پلا ہوں، ڈیڈی نے بھی کوئی کمی نہیں کی تھی، مگر میری ماں نہیں تھی، وہ میری پیدائش پر ہی دنیا سے چلی گئی تھی، ڈیڈی نے دوسری شادی نہیں کی، جب میں اسکول جاتا تھا، میرے تمام فیروز اپنی ماں کے ہاتھوں کے بنے لٹ لٹاتے تھے، اکثر ان کی ماں چٹنی میں انہیں پک کرنے آتی تھیں، پیرٹس ڈے پر میرے تمام فیروز اپنے ماں، ڈیڈ کے ہمراہ اسکول آتے تھے اور میرے ساتھ میرے ڈیڈ ہوا کرتے اور کبھی بھی تو وہ آفس میں بڑی ہوتے تو شائستہ آٹنی (انا) میرے ہمراہ اسکول جایا کرتی تھیں، اس وقت مجھے میری مہاشد سے یاد آیا کرتی تھیں، پھر کالج کے دور میں مجھے ڈرنک کرنے کی عادت ہو گئی، ڈیڈی کو اس بات کا علم بے حد بعد میں ہوا تھا، انہوں نے خوب واویلایا کیا تھا، مگر پھر بھی وہ میری اس عادت کو چھڑانے میں ناکام رہے، پھر انہوں نے مجھے تم سے منسوب کر دیا، میری اپنی کوئی پسند نہیں تھی اس لیے مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا، تمہاری ماما کی ڈیڈ پر ہمارا اچانک نکاح ہو گیا، اس کے لیے میں ذہنی طور پر بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ وہ سانس لینے کے لیے رکا، وہ ہولے ہولے تمام باتیں عروشمہ کے گوش گزار کر رہا تھا، عروشمہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، جسے ماں کی متنا سیر نہیں ہوئی تھی۔

”پھر تم میری زندگی میں شامل ہو گئیں، میں تمہیں جاننے لگا تھا، تم میرا اور میرے ڈیڈی کا بے حد دھیان رکھنے لگیں، تمہاری محبت مجھے بے حد اچھی لگتی تھی، جب تم

میرا دھیان رکھتیں مجھے بہت اچھا لگتا تھا، مگر میں نے اپنی انا کی تسکین کے لیے کبھی بھی اپنی چاہت تم پر منکشف نہیں کی، تم بے حد اچھی ہو عروشمہ! اور تمہارا دل تم سے کہیں زیادہ اچھا ہے، تم نے میری اس گھٹیا عادت کو برداشت کیا یہ تمہارا حوصلہ ہی ہے، میں حلال اور حرام میں تمیز بھول گیا تھا عروشمہ!“ وہ رورہا تھا اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

”میں وعدہ کرتا ہوں، میں اب کبھی بھی ڈرنک نہیں کروں گا، میں نے لاشعوری میں اپنی مام کو کھو دیا تھا، میں تمہیں کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ وہ عروشمہ کے ہاتھوں کو دیوانوں کی طرح چوم رہا تھا، عروشمہ نے ترم بھری نظروں سے خزیمرہ کو دیکھا تھا، اپنا زخموں سے چور ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ کر عروشمہ نے آنکھیں موند لی تھیں، خزیمرہ کی بے تحاشہ چاہت اور توجہ نے عروشمہ کے زخم مندمل کرنے میں چند ماہ لگائے تھے، وہ بالکل ٹھیک ہو گئی تھی، ڈیڈی ان کے مابین خوشگوار تعلقات وابستہ ہونے سے بے حد خوش اور مطمئن تھے اور یوں ہی خوش خوش وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

”عروشمہ! تم رورہی ہو؟“ خزیمرہ فاروقی کی آواز نے اس کا حرقہ توڑا تھا۔

”نہیں تو!...“ عروشمہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”جھوٹ کہنا آتا نہیں ہے، پھر بھی میری زندگی جھوٹ کہہ رہی ہے۔“ خزیمرہ اس کے پاس کھڑا تھا اور وہیں اس کے پاس بیٹھ پر اجماع ہو گیا۔

”آپ کب جا گئے؟“ عروشمہ نے بے چارگی سے استفسار کیا۔

”جب میری جان رونے میں مگن تھی۔“ خزیمرہ نے

اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا، عروشمہ کے لب خاموش تھے۔

”کیوں رورہی تھیں تم؟“ خزیمرہ نے استفسار کیا، عروشمہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”ماضی کے دھندلوں میں کھو گئی تھی۔“ عروشمہ نے اس کے کاندھے پر سر رکھ کر بتایا۔

”کچھ تلخ حقیقتوں کو یاد نہ کیا جائے تو بہتر ہوتا ہے، پھر تم ان باتوں کو کیوں کریدتی ہو؟“ خزیمرہ نے اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں جھانک کر استفسار کیا۔

”خزیمرہ! ایک بات پوچھوں؟“ عروشمہ نے خزیمرہ کو بغور دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”پوچھو میری زندگی!“ خزیمرہ نے محبت سے اس کے بال سینے۔

”آپ نے عاشق کی پارٹی میں ڈرنک تو نہیں کیا تھا نا؟“ عروشمہ نے پر یقین لہجے میں استفسار کیا۔

”نہیں میری جان! میں نے کہا تھا نا کہ مجھ میں تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں ہے، تم نے جلدی آنے کی تاکید کی تھی نا تو میں جلدی نکلا تھا، جزہ نے کہا اسے گھر ڈراپ کر دوں تو میں اسے گھر ڈراپ کرنے جا رہا تھا، وہیں میری کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، بریک فیل ہو گئی تھی، جزہ کو بھی معمولی چوٹیں آئی تھیں، مجھے زیادہ چوٹیں آئی تھیں، جزہ نے عاشر اور دوسرے فرینڈز کو کال کر کے بلوایا تھا، پھر ہسپتال میں ٹریینٹ کے بعد میں گھر آ گیا، میں ہسپتال میں پریشان رہا کہ تم بے حد پریشان ہو رہی ہو گی، مگر میرے دونوں ہاتھ مصروف تھے اور میرا سیل فون بھی بند ہو گیا تھا اور جب میں گھر آیا تو اس کنڈیشن میں نہیں تھا کہ تمہیں تمام باتیں تفصیلاً بتا سکوں، میں مر جاؤں گا اب اس نشے میں جتنا نہیں ہوں گا، تم بے فکر رہو۔“ خزیمرہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہہ رہا تھا۔

”اب مرنے کی باتیں بھی نہیں کیجئے گا۔“ عروشمہ نے اس کے لبوں پر انگلی رکھ کر کہا تھا۔

”او کے میری جان! انہیں کروں گا، تمہاری وجہ سے میں نے یہ عادت چھوڑی ہے عروشمہ!“ خزیمرہ نے اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

”میری ماما ہمیشہ کہا کرتی تھیں نفرت گناہ سے کرنی چاہیے، گناہ کرنے والوں سے نہیں، آپ واقعی بدل گئے خزیمرہ!“ عروشمہ نے محبت سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

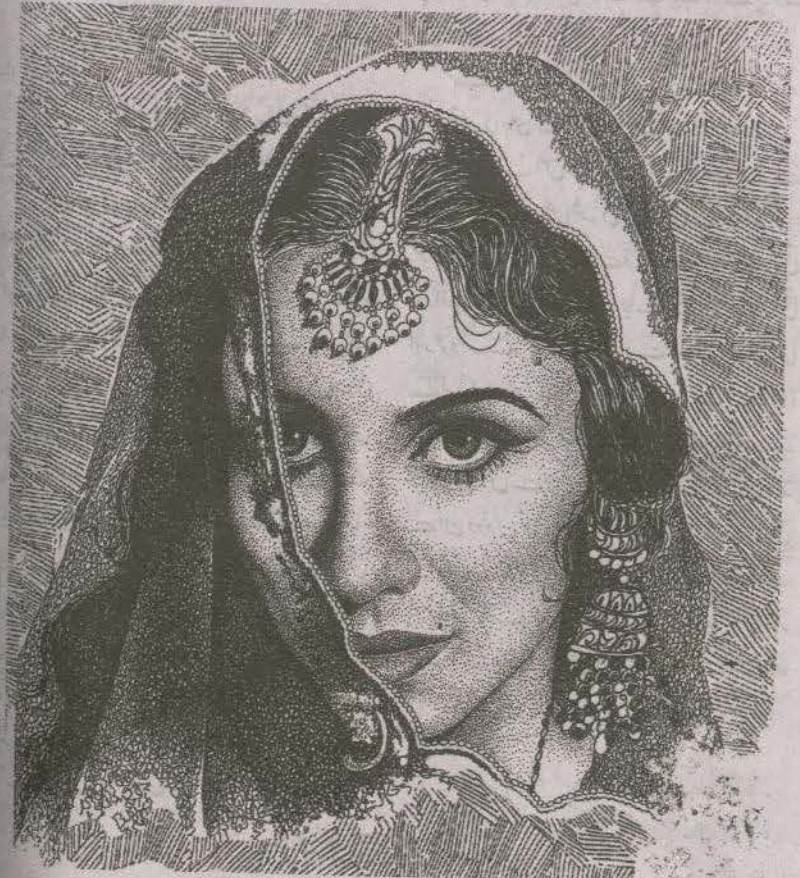
”مما بالکل ٹھیک کہا کرتی تھیں۔“ خزیمرہ نے محبت سے کہا تھا، عروشمہ نے مسکراتی نگاہ اپنے ہمسفر پر ڈالی تھی جو بہت دیر ہونے سے پہلے راستے پر لوٹ آیا تھا۔

”تم سے مل کے جاناں کہ زندگی بے حد خوبصورت ہے اب تو میری جان مجھے صرف اور صرف تمہاری ضرورت ہے“ خزیمرہ نے اس کے کانوں میں سرگوشی کے سے انداز میں کہا تھا۔ عروشمہ کی کھٹکتی ہنسی بے ساختہ تھی، خزیمرہ نے انہماک سے اسے دیکھا تھا، احزان فاروقی اور اذہان فاروقی ایک ساتھ جا گئے تھے، خزیمرہ فاروقی اور عروشمہ نے ایک ایک شہزادے کو اپنے حصار میں لے کر ایک دوسرے کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھا تھا، ان کی زلیست ڈھیر سارے خوش کن لمحات اور بے تحاشہ خوشیوں سے مزین تھی اور دونہ پھولوں کی آمد سے ان دونوں کی زندگی اور بھی مکمل اور بھرپور ہو گئی تھی، خزیمرہ نے اپنی شریک سفر کو تاحیر خوش رکھنے کا عہد کر لیا تھا، وہ بے حد مطمئن تھا ایک بے حد مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی اس کی ہمسفر تھی، اسے یقین تھا عروشمہ کی ہمراہی میں زندگی کا سفر نہایت سہل اور سرور بخش ہوگا۔

☆.....☆.....☆

بترقبا کھنڈنے لگی جانا

”آپ کے نہ ماننے سے میرے حقوق کم نہیں ہو جائیں گے! اور یہ جاننے کا مجھے پورا حق ہے کہ یہ جھکا کس کا ہے؟ کیونکہ میں آپ کی بیوی ہوں۔“ وہ قدرے ناگواری سے بولی تھی کہ آج جب اس کی جیب



سے جھکا ملا تھا اور وہ اندر تک ٹوٹ گئی تھی کہ چاہے وہ اسے درگزر کرتا تھا مگر اس کا یہ نہیں اور لیا رہا تھا اور یہ سوچ ہی تکلیف دہ تھی اس لیے وہ جواب دہی کرنے لگی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کوشش اس کے سارے بھرم توڑ ڈالے گی۔

”اول شب ہی تمہیں باور کروادیا تھا میں نے کہ تم ماندہ یوسف الحسن اس گھر کی صرف بہو ہے میرا تم سے کوئی تعلق نہیں، میں تمہیں بیوی نہیں مانتا کہ جسے دل سے اپنانا چاہتا تھا اسے بیوی بنا چکا اور ایک بیوی کے ہوتے ہوئے مجھے دوسری بیوی کی نہ چاہ ہے نہ ضرورت۔“ اس کے انکشاف پر سچ معنوں میں زمین اس کے پیروں سے ٹھسکتی چلی گئی تھی وہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو بے رحمی سے مزید کہہ اٹھا تھا۔

”ایسے بے یقینی سے کیا دیکھ رہی ہو، میں نے تمہیں شادی سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا، تم پر تو مشرقی بیٹی بننے کا بھوت سوار تھا تو جھکتو، مجھ سے کیا شکوہ کر رہی ہو، کیوں سوال کر رہی ہو؟ یاد



رکھو تم میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں، جب چاہو اس زبردستی کے نام نہاد رشتے سے آزادی حاصل کر لو۔ وہ انتہائی سنگدل و بے رحم شخص تھا اس پھول سی لڑکی کے نرم و نازک احساسات کی ذرا پرواہ نہ کی تھی اسے بکیر کر رکھ دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، آپ مجھے طلاق دے دیں۔“ اس کا لہجہ سرد تھا وہ اس کے سرخ چہرے اور بھیگی پلکوں کو دیکھنے لگا تھا اس کے لہجے میں انداز میں کوئی نرمی نہ تھی اسے امید نہ تھی کہ وہ ایسی بات کرے گی اور اس کے بعد کا اگلا قدم اس کے دماغ ٹھکانے لگا گیا تھا۔ اس نے بازو سے پکڑ کر اسے باہر جانے سے روکا تھا۔

”مسٹر احمد عالم! آپ کو ایسا کوئی حق نہیں ہے کہ آپ مجھے روکیں۔“ وہ جھٹکے سے بازو زد کر دیا گئی تھی، اس نے لب بچھ لیے تھے۔

”آپ کو جب مجھ سے شادی نہیں کرنی تھی تو نہ کرتے، مجبوری میں کر لی مگر نبھانے میں آئیے آپ جو فیصلہ چند سالوں بعد لیں گے آج ہی لے لیں اور مجھے طلاق دے دیں۔“ اس کا انداز بے لک تھا۔

”میں نے صرف ابو کی وجہ سے شادی کی اور اب کی وجہ سے تمہیں طلاق نہیں دے سکتا۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا تھا وہ بے ساختہ بس دی تھی مگر اس کی ہنسی میں ٹونے کا کچھ کی کرچیوں سی کھٹکتی تھی۔

”آپ نہ مجھے اپنا سکتے ہیں نہ چھوڑ سکتے ہیں، نہ میں آپ کو مجبور کر سکتی ہوں مگر اتنا یاد رکھیں آپ کہ مجبور صرف میں نہیں آپ بھی ہیں، مگر میں اپنے والدین کی وجہ سے مجبور ہوں تو یہی مجبوری آپ کو بھی لاحق ہے اور جب میں اپنی مجبور یوں کو نبھار رہی ہوں تو آپ بھی نبھانا سیکھیے کیونکہ میں روز روز اپنی بے عزتی نہیں کرواؤں گی۔“

وہ آنسو رگڑتی سخت لہجے میں بہت کچھ باور کرواتی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی اور اس نے غصے سے بچ و تاب کھاتے ہوئے لب بچھ لیے تھے کہ اس کا انداز اسے سخت برا لگا مگر کہہ نہیں سکتا تھا وہ اسے طلاق کی شخص دھمکی دے سکتا تھا مگر طلاق دے نہیں سکتا تھا کہ اسے بانڈ کرنے کے لیے نوید عالم نے اپنی جائیداد میں سے احمد کے حصے میں سے 75 فیصد ماندہ کے نام کر دیا تھا وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ماموں جان! آفس جاتے ہوئے مجھے الحسن ہاؤس چھوڑ دیجیے گا۔“ سب سے زیادہ چونک کر اسے احمد نے دیکھا تھا۔

”چھوڑنے میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن تمہیں جانا ہے تو احمد سے کہو چھوڑ آئے گا۔“ انھوں نے نرمی سے شائستگی سے پرشرانی لہجہ اپنایا تھا۔

”جی میں نے کہا تھا مگر انھیں فرصت نہیں ہے آپ چھوڑ دیجیے گا مجھے پایا ہمایا دے رہے ہیں۔“ وہ فطری طور پر باپ کو زیادہ چاہتی تھی اور یہاں وہ انھیں ہی سب سے زیادہ مس کر رہی تھی، جب جب وہ اسے ہرپٹ کرتا تھا، اسے اپنی ماں کی آغوش، باپ کے دست شفقت، بھائی کے مہربان سائے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، مگر وہ شخص تو جیسے اسے ہر ایک رشتے اس کی لطافت سے دور کر دینا چاہتا تھا، جب ہی تو وہ شادی کے بعد محض تین سے چار دفعہ ہی میٹھے لگتی تھی، اس کے صاف کہہ دینے پر وہ سب پریشان و حیران ہوئے تھے اور احمد بھی تھیر رہا تھا اور اسے دیکھنے لگا تھا جو پیلے رنگ کے سوٹ میں کافی اداس اور غیر معمولی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

”کیوں بھئی! ایسی بھی کیا مصروفیت کہ تم بیوی کو بالکل ہی نظر انداز کر دیتے ہو؟“ راشدہ نے اسے ڈنچا تھا

اور وہ اس پر پتھر جانے والی نگاہ جراتاں کو دیکھنے لگا تھا۔

”ساری مصروفیات کو ترک کر کے بیوی کا خیال رکھا کرو، چاہے آفس سے چھٹی کرنی پڑے تم ماندہ کو میٹھے لے جاؤ۔“ وہ بیٹے کو ہلکی سی خفگی کے ساتھ ہدایت دے رہی تھیں۔

”جی امی! لے جاؤں گا کہ انکار تو میں نے پہلے ہی کیا تھا، بس اتنا ہی کہا تھا کہ شام میں لے جاؤں گا۔“ فوراً ہی حامی بھر کر اپنا بھرم قائم رکھنے کو جھوٹ کا سہارا لیا تھا اور وہ جی سے مسکرا رہی تھی۔

”آپ کو زحمت کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے، ماموں جان نہیں چھوڑیں گے تو میں راحہ بھائی کو بلا لوں گی کہ واپس بھی تو ان کے ساتھ ہی آنا ہوگا، تو ان کے ساتھ ہی چلی بھی جاؤں گی۔“ وہ کہہ کر اٹھی تھی اور نکلتی چلی گئی تھی، اس نے یہ دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ اس کی نرمی کی کیا کیا اثر ہوا، احمد عالم کو کتنی صفائی دینی پڑی، کتنے جھوٹ بولنے پڑے اور جب وہ ماں اور باپ کو مطمئن کر کے روم میں آیا تو وہ اپنا بیگ تیار کر رہی تھی۔

”امی اور ابو کے سامنے اس بکواس کا مطلب؟“ جارحانہ انداز میں اس کا بازو جکڑا تھا۔

”مطلب صاف ہے احمد عالم! ہاں آپ سمجھنا نہ چاہیں تو الگ بات ہے۔“ اپنا بازو آ زاد کرواتی دور ہوتی نہایت تلخ لہجے میں بولی تھی کہ وہ نرم مزاج، نرم خول کی عرصے میں بھی نرمی کا ساتھ نہیں چھوڑ پاتی تھی کہ وہ اپنی فطرت نہیں بدل سکتی تھی، ویسے ہی وہ بھی اپنی فطرت کب بدل سکتا تھا، ماں باپ کے سامنے جو بکبی ہوئی تھی، جو وضاحتیں مل سکتی تھیں، سارا محل غصے کی نظر ہو گیا تھا۔

”بکواس بند کرو اپنی، اور آئندہ ایسا کوئی تماشہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ چنچا تھا۔

”مچھتے مت کہ میں اس لہجے و روئے کی عادت نہیں رکھتی۔“ وہ بے بسی سے رو پڑی تھی۔

”وہ صرف آپ کو یہ باور کروانے کے لیے تھا کہ بھرم رکھنا، عزت بنانے رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، اور میں اگر اپنا بھرم رکھتی پھرتی ہوں، اپنی عزت خاندان کی عزت کے لیے تو کچھ فرض تو آپ کا بھی بنتا ہے، کہ میں اگر خاموش ہوں تو اپنوں کو دکھ سے بچانے کے لیے، اپنی عزت نفس کے لیے اور آپ کس طرح مجھے ڈی گریڈ کر رہے ہیں، میری عزت نفس پامال کر رہے ہیں، یہ آپ جانتے ہیں اور یوں ہی رہا تو میری خاموشی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔“ اس کے آنسو روانی سے رخساروں کو تر کرتے جارہے تھے اس کا لہجہ مگر ہموار و شفاف اور غیر معمولی سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

”تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟“ اسے جیکھے چوتھوں سے گھورا تھا۔

”نہیں صرف اتنا بتانا چاہ رہی ہوں کہ آپ کے نہ ماننے کے باوجود رشتہ بہر حال قائم ہے اور اس کے کچھ تقاضے ہیں، مجھے سب کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا ہے اور جب میں اپنا اور آپ کا بھرم رکھنے کو جھوٹ بول کر سب اچھا ہے کی عملی تفسیر پیش کر سکتی ہوں تو آپ کو تو صرف میرا ساتھ دینا ہے کہ اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے

میں اب آپ کے بھرم نہیں رکھوں گی کہ جو شخص میری عزت کرنے کو تیار نہیں میں اس کی عزت کیوں رکھتی پھر دوں؟ ہاں آپ عزت دیں گے تو میں بھی آپ کی عزت رکھ لوں گی کہ آپ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیے کہ ہر لذت، ہر خوشی، ہر چاہت، ہر ضرورت میں عزت سے کم تر سمجھتی ہوں، آپ سے کچھ طلب نہیں کر رہی کہ مجھے میری عزت نفس عزیز ہے، مجھے اپنا بھرم بہت پیارا ہے اور میری عزت نفس، میرا بھرم دوسروں کے سامنے قائم ہونے سے قبل میرے سامنے قائم رہنا ضروری ہے نفرت سہہ سکتی ہوں، ذلت نہیں، محبت کے بغیر رہ سکتی ہوں، عزت

راڈ انجسٹ 181 اپریل 2014ء

کے بغیر نہیں، اور آپ مجھے کتنی عزت دے رہے ہیں یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن آپ آگے مزید آپ سے ذلت نہیں وصولی نہیں نے۔ وہ اس کو بہت کچھ باور کرائی اس کے سامنے سے ہٹ گئی تھی اور وہ غصے سے ٹھوٹا گھر سے ہی نکل گیا تھا، مگر جب غصہ اتر اٹھا، ٹھنڈے دماغ سے سوچا تھا تو اس کی ہر بات سچی لگتی تھی، آج والدین کو صفائی دیتے اسے دانتوں پسینہ آ گیا تھا اور آج سے قبل ایسی نوبت نہ آئی تھی، تو سبب ماندہ کی خاموشی اس کی اچھائی ہی تھی، اگر وہ سب کو بتا دیتی کہ وہ اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک رکھے ہوئے ہے تو اس کی ذات سوالوں کی زد میں آ جاتی، مگر اس نے صرف اپنا ہی نہیں اس کا بھی بھرم رکھا تھا، نہ کہتی تو جو آج ہوا وہ شادی کے اول دنوں میں ہی ہوتا، اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا، وہ جانے انجانے میں ماندہ کے ساتھ ظلم کر رہا تھا، احساس تھا اسے مگر دوسری کوئی چواس نہ تھی کہ وہ جھکے کو تیار نہ تھی تو وہ کیسے جبک جاتا؟ اگر اس نے اسے دھتکارا تھا تو وہ بھی اب یہی کر رہی تھی، وہ اگر وہ قدم پیچھے ہوتا تھا تو وہ چار قدم دور چلی جاتی تھی، وہ دونوں ہی انا کے خول میں قید ہوتے جا رہے تھے اور زندگی صرف بھرم رکھنے کا نام تو نہیں ہے، اس طرح کب تک چلنا تھا؟ کب تک انھوں نے دریا کے دو کنارے بنے رہنا تھا؟ پہل کسی نے تو کرنی تھی؟ انا کسی نے تو مارنی تھی، انا کی جنگ میں تو صرف بارہوئی ہے، جذبات کی اور رشتوں کی، اور جذبات کی نفی کر کے کیا جیا جاسکتا ہے؟ کیا ماندہ جی رہی ہے یا زندگی کو ٹھنڈا کر رہی ہے اور اسے دنیا کا پہلا مرد نہیں تھا ناں، جس نے دوشادیاں کی تھیں، تو کیا وہ دوسری کے ساتھ ساتھ ماندہ کو بھی عزت، چاہت اور بیوی کا درجہ نہیں دے سکتا؟ کتنے ہی سوال جو سر اٹھا رہے تھے اور ان کے جواب وقت چلتے ہی مل سکتے تھے، کچھ جواب خود ہی مل جانے تھے اور کچھ خود ڈھونڈنے تھے اور وہ دونوں ہی جس کے لیے نہ راضی تھے، تو زندگی جو جواب خود سے دیتی وہ ہی انھیں قبول کرنے تھے، تو کیا ان دونوں کو جواب ان کی مرضی کے ملیں گے یا مرضی اور امید کے برخلاف؟

☆.....☆.....☆

”تمہیں اپنے پیروں پر چلتے دیکھ کر جو خوش ہو رہی ہے، وہ میں لفظوں میں بتا نہیں سکتا۔“ اسجد اسے اپنے مقابل کھڑا کیے شدت جذبات سے غمور لہجے میں بولا تھا، وہ نم پلوں سے مسکرا دی تھی کہ اسجد نے اس کا پر اپر علاج کروایا تھا اور انتہائی توجہ اور نگہداشت کے ساتھ ساتھ ایک سرساز کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اپنے پیروں پر ایک بار پھر چلنے لگی تھی، اس نے نرمی سے اس کے آنسو پونچھ کر اسے خود سے بچھینچ سالیان تھا۔

”تم میرے لیے بہت اہم ہو، میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تمہاری زندگی میں کی صرف میری محبت میں آئی تھی اور آج تمہیں مکمل صحت یاب دیکھ کر سکون محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ اسے خود سے لگائے جذبات سے پورے دم لہجے میں بول رہا تھا، وہ یکدم اس کی اتنی محبت پا کر بلک اٹھی تھی، اس کی محبت اسے معتبر کر دیا کرتی تھی، اس کی ذرا سی توجہ اسے اپنی زندگی کی ہر محرومی بھلا دیتی تھی۔

”پاگل لڑکی! خوشی کے موقع پر اتنا رونے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ ہلکی سی خشکی سے اسے ڈپٹ کر اس کی دلجوئی کر رہا تھا۔

”آپ سے آج کچھ مانگوں گی تو کیا آپ دے دیں گے؟“ وہ سوں سوں کرتی اسے آس سے دیکھ رہی تھی۔

”جان بھی حاضر ہے، جان اسجد! نہایت دلفریب لہجے میں کہہ کر اس کی پیشانی چوم لی تھی، اور جو فرمائش اس نے کی تھی اس کا فریض موڈ یکدم ہی خراب ہو گیا تھا۔

رداؤ انجسٹ 182 اپریل 2014ء

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

”اسجد! میں جانتی ہوں وہ لوگ آپ کو نہیں پسند، مگر وہ جیسے بھی ہیں میرے اپنے ہیں اور میں اس گھر میں تنہا زندگی گزارتے ہوئے انہوں کی اہمیت سے واقف ہو گئی ہوں، اپنا مارتا بھی ہے تو ڈالنا چھاؤں میں ہی ہے اور خالہ میرے لیے اگر کڑی دھوپ ثابت ہوئیں بھی تو سایہ دار بچہ بھی وہی رہیں، اس لیے بار بار نہ سہی ایک بار مجھے ان کے پاس لے جائیں کہ آپ نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا، پلیر اسجد! آپ کو میری قسم! وہ رورہی تھی، التجا کر رہی تھی اور اس نے اسے تنبیہ کرنی دیکھا ہوں سے دیکھا، رونے سے باز رہنے کو کہتے ہوئے لے جانے کے لیے حامی بھری، وہ دلکشی سے مسکراتی تو وہ اس کے کھل جانے والے چہرے کو دیکھ کر اسے نرمی سے اپنے قریب کر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ارحم بھیا! آپ شادی کے بعد بدل تو نہیں جائیں گے ناں؟“ وہ شدتوں سے روتی یقین مانگ رہی تھی۔

”تم سے کس نے کہا؟ ایسا کچھ نہیں ہوگا مجھیں؟“ جبھی جھلا کر کہہ کر نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔

”نہیں آپ بدل جاؤ گے، آپ جب سے پنڈی گئے ہیں تو میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں، آپ بدل گئے تو میں تو مری جاؤں گی، بس آپ لا ج سے شادی نہ کریں۔“ وہ اس کی شرٹ بازو سے جڑے مستقل رورہی تھی، ماحول ایکدم ہی مکدر ہو گیا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھی؟

”نہیں بیٹا! روؤ نہیں، کہ شاز مین مذاق کر رہی تھی۔“ فرید نے اس تک آ کر اسے خود سے لپٹا لیا تھا جس کے رونے میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”آپ سچ کہہ رہی ہیں ناں پھپھو! ارحم بھیا ہمیشہ مجھ سے محبت کرتے رہیں گے ناں؟“ وہ یقین چاہ رہی تھی۔

”ہاں کیوں کہ میری بیٹی کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا، محبت ورشتے کبھی نہیں بدلتے اور بیوی کے آجانے سے بھی تمہاری اہمیت کم نہیں ہوگی، میری چھوٹی سی دوست، پیاری سی بہن، ہمیشہ اہم رہے گی۔“ وہ اس کو بازو سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف موڑ گیا تھا اور وہ اس سے لپٹ کر مزید رو پڑی تھی۔

”آئی نو! ارحم بھیا! آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کتنے اہم ہو، مجھے آپ بالکل اپنے پاپا کی طرح لگتے ہو، جب میں ان کی تصویر دیکھتی ہوں تو اس میں آپ کی شبیہ اترنے لگتی ہے اور جب آپ پنڈی گئے تو مجھے لگا کہ میں اب آپ کو پاپا کی طرح کھودوں گی، آپ سے بات نہیں ہو رہی تھی تو مجھے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں، آپ کبھی مجھے خود سے دور نہ کرنا، پاپا کی طرح مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا کہ آپ صرف میرے دوست، میرے ارحم بھیا نہیں ہو، آپ میرے پاپا کی طرح ہو۔“ وہ اس کے سینے سے لگی بلبکتے ہوئے کہہ رہی تھی اس نے اسے بہت مشکل سے چپ کر دیا اور شرمندہ سی کھڑی شاز مین کو گھورنے لگا، جو اس کی تپتی نگاہیں خود پر محسوس کرتی منمناتی تھی۔

”آئی ایم سوری، میں تو صرف مذاق کر رہی تھی، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جنین سیریس ہو جائے گی۔“ اس کی آنکھوں میں نمی درآئی تھی۔

”کیا اس کی جذباتیت سے واقف نہیں ہو، جو اس سے مذاق کرنے چلی تھیں؟ اور ایسے بے ہودہ مذاق کی ضرورت ہی کیا تھی، اس کے کچے ذہن میں رشتوں کا منفی تاثر ڈالنے کی تم نے حماقت کیسے کر لی؟ جبکہ جانتی ہو کہ جو بات اس کے ذہن میں بیٹھ جائے لگتی نہیں ہے اسے رشتوں کی پوزیشن کی سکھائی، سمجھائی ہے تاکہ تم اس سے

رداؤ انجسٹ 183 اپریل 2014ء

فضول کیواس کرتیں۔ نرم خوارم کھن اس پرالت پڑا تھا، فریہ ہی نہیں اندر آتے راحم نے بھی اس کے غصے کو اچنبہ سے دیکھا تھا۔
”ارحم بیٹا! غصہ کیوں کر رہے ہو؟ شازمین تو بس مذاق کر رہی تھی۔“ شازمین کو روتے دیکھ کر انھوں نے بیٹے کو سرزنش کی تھی۔

”آئندہ اتنا تکلیف مذاق کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے، میں ہر شے کو اس کی مناسب اہمیت دینا جانتا ہوں، میں نے ہر شے میں توازن رکھا ہے، ہاں حنین بچپن سے مجھ سے اچھ زیادہ رہی، لیکن اس کے باوجود حنین اور مادہ میں، میں نے بھی فرق روا نہیں رکھا، حنین کی فرمائش پر اگر اس کے لیے کچھ لایا تو بھی مادہ کو یاد رکھا، میرے لیے دونوں بہنیں برابر تھیں، کبھی پلڑا بھاری ہوا تو صرف اس لیے کہ میں نے حنین کو ہمیشہ اپنی دوست کہا اور سمجھا، اور میں اب اتنا کم ظرف نہیں ہوں کہ بیوی کے آتے ہی ماں بہنوں اور دوست کو یکسر فراموش کر ڈالوں گا، اس لیے بہتر ہوگا کہ فضول کی پیشن گوئیوں سے پرہیز کیا جائے۔“ وہ ہرگز بھی دھیمانہ نہیں پڑا تھا، اور فن کرتا نکلتا چلا گیا تھا۔ شازمین شدتوں سے رونے لگی تھی، فریہ کو ڈر لگا تھا کہیں راحم کو بڑے بھائی کا غصہ کرنا برا ہی نہ لگا ہو؟ اس لیے انھوں نے ڈرتے ڈرتے بیٹے کو دیکھا تھا، مگر وہ نارمل ہی لگا تھا اس نے آگے سے کچھ پوچھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی، لیکن انھوں نے خود ہی اسے بات بتائی تھی، اور شازمین کو چپ کروانے لگی تھیں۔

”ارحم بھیا کا غصہ جائز تھا! سب ہی حنین کی جذباتیت سے واقف ہیں، اس لیے شازمین کو مذاق میں بھی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ اس نے دھیمے سے کہا تھا۔
”پچھواچی میں تو صرف مذاق کر رہی تھی۔“ وہ سوسوں کرتی بولی تھی اور انھوں نے اسے پکار کر راحم کی طرف سے بھی معذرت کی تھی۔
”نہیں پچھواچی مجھے ارحم بھیا کا ڈانٹنا بالکل برائیں لگا، ابو اور امجد بھائی کی طرح وہ بھی مجھے ڈانٹنے کا حق رکھتے ہیں۔“ وہ یکدم ہی مطمئن ہو گئی تھیں۔
”تم جا کر فریش ہو کر آؤ، میں جب تک چائے گرم کر لیتی ہوں۔“ نرمی سے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔

☆.....☆.....☆

”آئی ایم سوری مم! بٹ میں خود پر کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔“ ماں کے سرزنش کرنے پر وہ شرمندگی سے بولا تھا۔
”لیکن آئندہ خیال رکھنا شازمین تمہاری بھالی ہے اور اس کی کوئی اتنی خاص غلطی بھی نہیں تھی کہ بہنیں آپس میں ہنسی مذاق کر رہی لیتی ہیں، حنین تو ہے ہی جذباتی، ہمیں جذباتیت دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔“ انھوں نے جو غلط محسوس کیا تھا اس کا احساس دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

”دراصل مم! اس کو روٹا دیکھ پانا میرے اختیار میں ہی نہیں ہے، اور آپ نے سنی تھیں ناں اس کی باتیں، وہ میرے لیے کس انداز سے سوچتی ہے، اس کے لیے میرے جذبات بھی بہت سچے اور انمول ہیں، مگر جو پچھلے دنوں ہوا اس کا خیال اور وہ حنین کو پتہ نہ لگ جائے کبھی اس کا خوف کتنی ہی باتیں ایک ساتھ ملیں اور میں باہر ہو گیا کہ بھائی نہ بھی سمجھوں تو بہن سے بھی مجھے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی، بہر حال شازمین ہر لحاظ سے، ہر رشتے سے میرے لیے اہم اور قابل احترام ہے اور آپ فکر نہ کریں جو زیادتی اس کے ساتھ کی ہے اس

سے معافی مانگ کر ازالہ کر لوں گا۔“ وہ سچائی سے کہہ رہا تھا، انھیں یکدم اطمینان ہو گیا تھا، وہ اختلافات نہیں چاہتی تھیں اور گھر کا سکون آپسی پیار اور مطابقت پر انحصار کرتا ہے، اس لیے انھوں نے پہلے ہی موڑ پر غلطی کی نشاندہی کر دی تھی، کچھ رشتے بہت نازک ہوتے ہیں، وہ چاہے پہلے شازمین کو بہن کا درجہ دیتا اور بعد میں بھالی کا، اسے احترام بہر حال کرتا تھا۔

”مگر تم حنین کے معاملے میں اکثر توازن نہیں رکھ پاتے اور جواب تک ہوا ٹھیک تھا، مگر آگے کے لیے سوچنا پڑے گا کہ اس کا نکاح ہو گیا ہے، کچھ سالوں میں رکھتی تھی ہو جائے گی، کنعان اس سب کو کس بچ پر لے جا کر سوے گا، ہم نہیں جانتے۔ بیٹا! انسان دیکھتا پہلے پرکھتا بعد میں ہے، تمہارے دل و نگاہ میں کتنی محبت و احترام ہے یہ کوئی نہیں دیکھے گا، اس لیے ضروری ہے کہ تم اس سے اپنی اپچنٹ کم کرو، جتنی جذباتیت اس نے دکھائی، سچ کہوں ناں تو میں ڈر گئی ہوں، کچھ رشتے بہت نازک ہوتے ہیں، تم سمجھ دار ہو، ہر بات، ہر چیز سمجھ سکتے ہو، مگر اسے سمجھانے کی ضرورت ہے اور یہ بھی مجھے اچھے سے اندازہ ہے، اسے یہ سب تم ہی سمجھا سکتے ہو۔“ وہ نہایت نرمی و شفقت سے بیٹے کو سمجھا رہی تھیں۔

”جی مم! مجھے بھی ان باتوں کا احساس تھا، اس لیے نامحسوس طریقے سے میں اس کا انحصار خود پر سے ختم کر رہا ہوں، مگر مکمل اسے میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اپنی مجبوری ظاہر کی تھی اور وہ مسکرا دی تھیں۔

”ماں بول بیٹا جان! اسے بگاڑنے میں تمہارا اور زرین کا ہی ہاتھ ہے وہ محترم آج بھی آدمی رات کو بھی پتہ چلے کہ حنین پریشان ہے تو سسرال سے میسج بھیج جاتی ہے، تم لوگوں نے اس پر پیار و توجہ لگا کر اسے خود پر انحصار کرنا سکھایا ہے وہ خود ہی کوئی فیصلہ لے ہی نہیں سکتی، تم دونوں کی طرف لپکتی ہے، مجھے ڈر ہے کہ آگے زندگی وہ کیسے گزارے گی؟“ وہ سنجی کی آنے والی زندگی کو لے کر متفکر تھیں۔

”مم! آپ پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر ہی کرے گا، اور کنعان کو لے کر آپ سب شکوک و شبہات کا شکار ہیں، مگر وہ شخص نوڈاؤٹ ایک اچھا انسان ہے، مجھے جب اس کے پرپوزل کا پتہ چلا تھا، میں نے تب ہی حمایت کی تھی کہ اس کی نگاہ میں، میں نے حنین کے لیے بہت سچے جذبات دیکھے ہیں اور جن سے محبت کی جائے ان سے وابستہ لوگوں سے محبت خود بہ خود ہوجاتی ہے، آپ سب دیکھنا کہ کنعان ہماری حنین سے بہت محبت کرے گا، اس کا اتنا خیال رکھے گا کہ انشاء اللہ ہمیں حنین کی زندگی پر رشک محسوس ہوگا۔“ وہ پرتیقن لہجے میں بول رہا تھا۔

”اوہو.... اور تم اپنی کھولاج سے شادی پر اعتراض تو نہیں ہے ناں؟“ انھوں نے یکدم ہی موضوع بدلا تھا۔

”مم! جو آپ کی پسند ہے، وہ ہی میری پسند ہے۔“ ان کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں کچھ تو کہنا تھا۔
”پھر بھی تمہاری اپنی بھی تو کوئی رائے ہوگی کہ ماہ لاج ہر لحاظ سے اچھی لڑکی ہے، تمہارے ساتھ سوٹ کرے گی مگر تم اپنی کہو کہ ہمیں کیسی لگتی ہے؟“ نرمی سے استفسار کر رہی تھیں، جب حنین نے ارحم کے لیے ماہ لاج کا نام لیا تھا تو وہ خوش ہو گئی تھیں، لاج انھیں بھی بہت پسند تھی، شوہر سے بات کر کے ارحم سے بات کی تھی اور ارحم کے اصرار پر پرپوزل لے گئے تھے جو ماہ لاج کی خوشی و مرضی پر قبول کر لیا گیا تھا کہ یہاں تک ماہ کنعان بھی صرف اس کی وجہ سے ہی راضی ہوا تھا، وہ تو ارحم کو دیکھتا ہی دوسری نگاہ سے تھا۔

”مم! میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتا، اس لیے میں نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں، ماہ لاج آپ کی

پسند ہے اور بس، ان کے بارے میں بھی نہیں سوچا، نہ میرے دل میں ماہ لاج کے لیے کوئی سوٹ کارڈ ہے، رشتہ ہے گا اس کے بعد خود بہ خود تبدیلی آ جائے گی، فی الوقت میری کوئی رائے نہیں ہے۔ وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

”کہیں تم نے وہ کنعان کی بہن ہے اس لیے تو شادی کی حامی نہیں بھری کہ اس طرح کنعان کی شیورٹی مل جائے گی۔“ پر گفتیش لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”مما! آپ مجھے جانتی ہیں، اس کے باوجود اس طرح کہہ رہی ہیں۔“ اس نے ماں کو ناراضی بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”مما! کسی بھی شخص کو عزت دینے اور محبت کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا، جنین کے لیے وہ شخص خود اپنی وجہ سے مناسب لگا ہے اور وہ خود اپنی شیورٹی ہے، جو میں جانتا ہوں وہ آپ نہیں جانتیں، اس شخص پر کہیں نہ کہیں بھر وسا ہے مجھے، تب ہی میں نے جنین کو اس رشتے کے لیے اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی راضی کیا ہے۔ میں اس سے ڈرا نہیں ہوں اس کے جذباتوں کے سامنے جھک گیا ہوں اور جب اس کو نبی کے لیے پریشانی مان رہا ہوں، میری حیات مثبت اشارے دے رہی تھیں، تو مجھے ضرورت نہیں ہے کہ میں فضول شیورٹیز تلاشتا رہوں، آپ بس اتنا یاد رکھیے گا کہ ماہ لاج سے شادی کے لیے میں آپ کی وجہ سے راضی ہوا ہوں، نہ کہ کوئی اور سبب ہے، ماہ لاج کی جگہ آپ کسی اور کو میرے لیے چوز کرتیں، میں تب بھی راضی ہو جاتا اور آپ کے ذہن میں کسی قسم کا ڈریا شک ہے، تو بے شک آپ اس رشتے کو جڑنے سے پہلے ہی تمام سلسلے ختم کر دیں، میرے اقرار کی وجہ لاج کا کنعان کی بہن ہونا نہیں ہے، میں دوسرے کے لیے عمل کی جزایاں دوسرے کو دینے کا قائل نہیں ہوں، اور جنین کو وہ ہی ملے گا جو اس کا نصیب ہے اور اس کے لیے کسی ضمانت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ نہایت ناراضی سے بول رہا تھا، انھوں نے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

”آئی تو مائیں! بس! دل میں شک سا آیا تو کہہ دیا، ورنہ میں جانتی ہوں میرا بیٹا بہت فیر ہے، ہر رشتے کو فیر لی ٹھاتا ہے، اور بیٹا جان! شادی نہ کرنے کے خیالات کو بہت ذہن میں جگہ دے لی، تمہاری ضد سے تنگ آ کر ابھی محض منگنی کر تو رہی ہوں، مگر یاد رکھنا کہ رخصتی کے لیے سال سے زیادہ نہیں ٹھہروں گی۔“ انھوں نے حق ومان سے اسے باور کروایا تھا، وہ محض مسکرا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تمہیں اپنا ڈریس کیسا لگا؟“ ہلکی پھلکی ہی تیار ہوئی اسٹائلش سوٹ میں ماہ لاج بہت حسین لگ رہی تھی، اس کے چہرے پر شریکیں مسکراہٹ آن ٹھہری تھی، اندر آئیں ماہ لقا نے بیٹی کا گلزار چہرہ دیکھا تھا اور نجانے کیوں تمام وہم اڑن چھو ہو گئے تھے۔

”السلام علیکم آئی!“ اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے سلام کیا تھا، نکاح کے بعد ان کا پہلا سامنا تھا کہ نکاح سے پہلے بھی وہ ان سے محض تین باری مشکل سے ملی ہوگی، انھوں نے ایک نظر گلابی چہرے والی نازک سی لڑکی کو دیکھا اور غرت سے جواب دے کر صوفے پر بیٹھ گئیں، اس کا بڑھا ہوا ہاتھ بڑھا ہی رہ گیا تھا، جسے اس نے نبی کے احساس کے ساتھ ناخوش طریقے سے نیچے کر لیا تھا، فریدہ کی نگاہ ان ہی پر پڑی، اس لیے انھیں ان کی حرکت عجیب ہی لگی تھی اور اب وہ نیچے کولب چبائے، پلکیں جھپکتے دیکھ رہی تھیں، ماہ لقا کے مخاطب کرنے پر ان کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔

”ارم! آپ لوگوں کے ساتھ نہیں آیا؟“ وہ ماں کو دیکھنے لگی تھی، جو اپنے مخصوص انداز میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھی تھیں۔

”کچھ مصروف تھا لیکن انشاء اللہ اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔“ انھوں نے بات بنائی تھی، جبکہ ان کی روایات کے مطابق اس وقت لڑکے کے آنے کی ضرورت ہی نہ تھی، مگر یہ انھوں نے کہا نہیں تھا۔

”لاج! ذرا نوراس سے کہہ کر ناشتے کا انتظام کروالینا، میری ایک مینٹنگ ہے، اس لیے مجھے جانا ہوگا۔“ ماں کی بات پر وہ لب کھیلنے لگی تھی، جبکہ اندر آتا ماہ کنعان بھی چونک اٹھا تھا۔

”واٹ! پلیزینٹ سر پرائز!“ بیٹے کو دیکھ کر انھوں نے جوش دکھایا تھا، وہ مگر مسکرا بھی نہ سکا تھا، ماں کا یہ مصنوعی پن اسے ہمیشہ ہی کھلتا تھا، اس نے شائستگی سے فریدہ کو دیکھتے ہوئے مشترک سلام کیا تھا، جبکہ نگاہ لمحے بھر کو ان کے ساتھ گردن جھکا کر بیٹھی دشمن جاں پر بھی ٹھہری تھی، جو غیر معمولی سنجیدہ لگ رہی تھی اسے تقریباً ایک ماہ بعد دیکھ کر اس کے ذہن دل تر و تازہ ہو گئے تھے، مگر وہ ماں کے وہاں سے جانے کے سبب اس پر توجہ برقرار نہ رکھتے ہوئے ماں کے پیچھے ہی بڑھا تھا اور وہ آنکھوں میں آئی تھی پیچھے دھکیلتی فریدہ سے ماں کے رویے کی معذرت کرنے لگی تھی، اچیس وہ چھوٹی سی پیاری سی لڑکی یکدم ہی بہت اپنی اپنی سی لگی تھی۔

”کوئی بات نہیں بیٹا! ہر انسان کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں اور ویسے بھی ہم یہاں تمہاری وجہ سے آئے ہیں، اور جب ہماری بیٹی ہمارے ساتھ ہے، تو کسی کے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے، ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم تو تم ہو۔“ وہ فریدہ کے رشفقت و محبت سے لبریز لہجے پر انھیں حیرت سے دیکھنے لگی تھی، اور ان کے مسکرانے پر وہ بھی بیگی پلکوں سے مسکرا دی تھی، جب وہ ماں سے الگھتا ان کو ان کے برے رویے کا احساس دلانے میں ناکام ہو کر لوٹا تھا، تو ڈرائنگ روم کی فضا کافی تسلی بخش تھی اور وہ سفر کی تھکان کے باوجود ماں کے رویے کے ازالے کے احساس سے سٹنگل صوفے پر بیٹھ گیا تھا، فریدہ اس سے بڑی ٹرپ کا احوال پوچھنے لگی تھیں اور ان سے بات کرتے ہوئے وہ اس کو بھی نوٹ کرتا رہا تھا، جو بہت سنجیدہ بیٹھی تھی کیوں؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا، اس کے دل کا سوال ماندہ پوچھ بیٹھی تھی۔

”جنین! کیا ہوا چندا... اتنی خاموش کیوں بیٹھی ہو؟“ اس نے آواز پر سر اٹھایا تھا اس کی آنکھیں نم اور سرخ ہو رہی تھیں۔

”مگر کب جائیں گے میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ کب کے رکے آنسو اس کے ایک عام سے سوال پر گرنے لگے تھے، فریدہ نے اسے دیکھا تھا جو یکدم ہی مضطرب نظر آنے لگا تھا۔

”تھوڑی دیر بعد چلیں گے۔“ ٹرائی گھیسٹ کر لاتی ماہ لاج کو دیکھ کر نبی سے اسے تسلی دی تھی، ماہ لاج نے اسے پلیٹ میں ریفریجریٹڈ آئس کرڈال کر دیئے تھے، مگر اس نے کچھ بھی لینے سے منع کر دیا تھا اور فریدہ کے کہنے پر محض چائے کے گھونٹ بھر لے گئی تھی، جو اسے اپنے حلق میں اٹکتے محسوس ہو رہے تھے، وہ تو اب تک ماہ لقا کے رویے میں الجھی تھی، ماہ لاج نے اسے مخاطب کیا تھا، وہ اپنے ہی خیالوں میں الجھی بیٹھی بری طرح چوکی تو ہاتھ میں پکڑا چائے کا گگ چمک گیا، وہ ”سی“ کرنی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ڈونٹ وری... آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے لیے باہر نکلی تھی، اسے شرارت سوچھی تھی اور وہ اسے ماہ کنعان کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر باہر سے ہی پلٹ گئی تھی، اس نے ماہ کنعان کو بھی تو بھیجتا تھا، وہ اپنی شرارت پر متبسم ہی ان سب کے درمیان آئی تھی۔

”لالہ جان! آپ سفر سے آئے ہیں، فریش ہو جاتے تو اچھا تھا۔“ شازمین سے بات کرتے کرتے یکدم انجان بن کر چوکنے والے انداز میں بولی تھی اور فریدہ نے بھی فوراً ہی اس کے مشورے کو سراہا تھا، اور وہ بھی اٹھنا تو چاہتا تھا، مروتا بیٹھا تھا ایکسکوز کرتا اپنے کمرے میں آ گیا تھا، مگر بیڈ پر بیٹھی روتی ہوئی سنین کو دیکھ کر اس نے نہ صرف حیرت ہوئی تھی، بلکہ پریشانی نے بھی آگھیرا تھا۔

”جنین!...“ اس کے سامنے رک کر پکارا تھا، اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی، ان دونوں کے درمیان محض چند قدموں کا فاصلہ تھا، اس نے اپنے آنسو رگڑے اور جانے کے لیے آگے بڑھی تھی کہ وہ اس کی کلائی تھام گیا۔

”کیوں رو رہی تھیں؟“ نرمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا تھا۔

”آپ سے مطلب؟“ ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ بھڑکی تھی، مگر اس نے ہاتھ چھوڑنے کے بجائے یوں جھونکا دیا تھا کہ وہ اس کے سینے سے آگلی تھی، اس کی توجان ہی ہوا ہونے لگی تھی، اس کی نگاہ نے بہت نرمی سے اس کے چہرے کے بھیکے بھیکے نفوش چھوئے تھے، وہ بدک کر دور ہوئی تھی، نگاہ جھکانے، لب کلیتی، بھاگنے کو پر تو تھی وہ پیاری سی لڑکی اسے بہت خاص لگی تھی۔

”یارا! اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ اچھا خاصا ہینڈسم ہوں، ایک جہان کی لڑکیاں مرنے ہیں مجھ پر اور تم ہو کہ مجھے دیکھ کر یوں بھاگنے لگتی ہو، جیسے میں کوئی دیویدیکل جن ہوں۔“ وہ اس کی کلائی ہنوز تھامے ہوئے تھا، جسے وہ چھڑانے کی کوشش میں تھی، مگر اس کی مضبوط گرفت سے ہاتھ نکالنا اتنا بھی آسان نہ تھا۔

”آپ پلیز مجھے جانے دیں۔“ وہ منمنائی تھی۔

”ارے.... جانے دوں، آج تو جانے نہیں دے سکتا، اب تک تو میں تمہارے پیچھے تھا اور آج تو تم خود چل کر میرے کمرے تک آئی ہو۔“ وہ شریر ہوا تھا، ہاتھ چھوڑ کر ماتھے پر جھوٹی سیاہ لٹ کو ہاتھ بڑھا کر ماتھے سے پرے کیا تھا، وہ بدک کر دور ہوئی تھی اور پیچھے دو قدم کے فاصلے پر موجود بیڈ پر گر گئی تھی، وہ اس کی گھبراہٹ انجوائے کرتا بیڈ کے پاس ہی نیچے کارپٹ پر اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”بلیو... میں خود نہیں آئی، وہ لاج مجھے چھوڑ گئی تھی اور سچی مجھے نہیں پہنچا کہ یہ آپ کا روم ہے، ورنہ میں نہیں آتی، پلیز مجھے جانے دیں۔“ وہ نیر بہاتے ہوئے منمنائی تھی کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس کمرے میں آئی تھی مگر رونی کی وجہ سے اس نے کمرے پر توجہ ہی کب دی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ ہٹائی اٹھنے لگی تھی، وہ اس کے دونوں ہاتھ تھام گیا تھا اور پیار سے اس کا چہرہ ننگے لگا تھا۔

”ہاں تم سے سبھی امیدیں خاتم لڑکی، وہاں باہر ایک دفعہ جو مجھے دیکھا ہو، جانتی ہو میں نے تمہیں کتنا مس کیا، مگر کہاں اندازہ تھا کہ تم آج ہی دل کا سکون بن کر نکل آ جاؤ گی، اپنی تمام تر سادھیوں کے باوجود بہت پیاری لگ رہی ہو، مگر یار! رو کیوں رہی تھیں؟ او اس کیوں ہو، کیا تم بھی مجھے مس کر رہی تھیں؟“ وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہ بولے گی، اس لیے ایک ہی سانس میں کتنے ہی سوال کر ڈالے تھے۔

”میں نے آپ کو بالکل مس نہیں کیا تھا، اب مجھے جانے دیں۔“ وہ بے بسی سے گویا ہوئی تھی، وہ اس کے سامنے یوں بیٹھا تھا کہ وہ جانا تو دور کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

”قسم سے تمہاری یہ صاف گوئی اور بے اعتنائی میری جان لے لے گی، جھوٹے منہ ہی کہہ دیتیں کہ مس کیا تھا۔“ وہ خائف و ناراض ہوئے بنا ہنوز شوخی سے بولا تھا۔

”میں جھوٹ نہیں بولتی، اب جانے دیں ناں پلیز!...“ وہ خشکی سے کہہ کر کھینچی ہوئی تھی۔

”اداسی کا سبب بتا کر چلی جاؤ کہ کچھ دیر تم اور میرے سامنے رہیں تو قسم سے میرا خود پر اٹھنا نہیں رہے گا، تم تو میرے سارے ایمان ڈانواں ڈول کر دیتی ہو۔“ نرمی سے اس کا رخسار چھو کر پیشانی پر لب رکھتا اس کی جان نکالتا کھڑا ہو گیا تھا، جبکہ وہ تو بیٹھی ہی رہ گئی تھی، اس نے اسے دیکھا تھا جس کا مہتابی رنگت والا کتبی چہرہ دبک رہا تھا، اور وہ بھی لب کلیتی دانے ہاتھ کی پشت سے پیشانی مل رہی تھی۔

”تمہارا بھی جانے کا دل نہیں کر رہا ناں؟“ اس کی حالت سے حفا اٹھاتے ہوئے شوخی سے کہا تھا، اس نے بھیکے بھیکے اٹھائیں، خشکی و ناراضی سے اسے دیکھتی اس کی بولتی شوخ آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے نگاہ جھکانی لگی تھی۔

”بتا دو یار! اداس کیوں ہو؟ ورنہ میں پریشان ہوتا رہوں گا۔“ اٹھتے قدم اس کی بھاری گھبراہٹ آواز پر تھمتے تھے۔

”آپ کی مہاجھے پسند نہیں کرتیں، ان کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ مجھے ناپسند کرتی تھیں تو آپ کو مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ وہ دروازے کے پاس ٹھہری بنا پلٹنے نم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”پسند تو مجھے تم بھی نہیں کرتیں تو تم نے اپنی ناپسندیدگی کے باوجود مجھ سے نکاح کیوں کیا؟“ وہ اس کے سامنے سوال بن کر آن ٹھہرا تھا۔

”ارجم بھیا! کی وجہ سے کہ میں انکار کر کے ان کا مان نہیں توڑ سکتی تھی، سب کو یقین تھا کہ مجھے ارحم بھیا مانیس گے، اس لیے میں سب کا یقین نہیں توڑ سکتی تھی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی تھی، جو اس کی شخصیت کا خاصہ نہ تھی۔

”تم میری محبت ہو، اور میں کسی کی بھی ناپسندیدگی کے خیال سے اپنی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا، چاہے وہ کسی میرے پیڑش ہی کیوں نہ تھے، تم یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ تمہیں کوئی بھی ناپسند کرتا ہو، کتنے ہی لوگ اس رشتے کے خلاف ہوں، مگر میں دل سے اس رشتے کے حق میں تھا، بہت محبت سے اپنایا ہے تمہیں اور میری محبت میں اتنی طاقت ہے کہ اپنا آپ منوالے تم بے فکر رہنا، تمہیں مجھ سے اگر 100 برس دست چاہت ملے گی، تو میں خود سے وابستہ رشتوں کو بھی تم سے محبت کرنے پر مجبور کر دوں گا۔“ وہ بہت پیار و یقین سے کہہ رہا تھا۔

”محبت وہ واحد شے ہے دنیا میں جسے زبردستی حاصل نہیں کیا جاسکتا نہ ہی کسی کو محبت کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔“ وہ اس کو ساکت چھوڑ کر نکل گئی تھی، وہ بے چین ہوا تھا تھا، اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اسے جوتا مار گئی ہے، وہ اسے اپنے نام تو کر چکا تھا، مگر اس کی محبت اپنے نام نہیں کر دیا تھا، محبت زور زبردستی سے حاصل نہیں کی جاسکتی، اس لیے وہ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں نہ رہے، وہ جتنا سوچ رہا تھا اتنا لہجہ رہا تھا اور جتنا لہجہ رہا تھا اتنا ہی مضطرب ہو رہا تھا اور اضطراب کی لہر اسے دباتے دباتے وہ غصے کو ہوا دے بیٹھا تھا، اور اس نے سوچ لیا تھا زبردستی تو زبردستی ہی کسی کو اسے بس کیسے بھی اس کو پاتا تھا، اس کے دل تک رسائی حاصل کرنا بھی، یہ مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں اور اس نے کسی بھی کام کو کبھی مشکل نہیں سمجھا تھا اور ناممکن جیسے لفظ کا تو اس کے آس پاس گزر بھی نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

”فارگا ڈیک حنین! ہر وقت تم بحث لے کر کیوں بیٹھ جاتی ہو؟“ ساجدہ حد درجے جھنجھلا کر بولی تھیں۔

”مئی! آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں، میں ان کے ساتھ کیسے جاسکتی ہوں؟“ وہ ماں سے زیادہ جھنجھلائی ہوئی

تھی۔ ”کیسے جاسکتی ہو کیا مطلب؟ وہ شوہر ہے تمہارا، اسی لیے اجازت دے رہے ہیں۔“ وہ اب کے ناراضی ظاہر کر گئی تھیں۔

”آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں مجھے ان کی بیوی بننے کا کوئی شوق نہیں ہے، میں منگنی میں ارحم بھیا کی طرف سے شرکت کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ اٹنا ناراضی ظاہر کرنے لگی تھی، انھوں نے بیٹی کو خشکیوں لگا ہوں سے دیکھا تھا۔

”شٹ اپ حنین! رشتے تمہارے نزدیک شوق کا نام ہیں۔“ وہ اسے ڈپٹ رہی تھیں۔

”آئی ایم سوری، ہٹ آپ انھیں منع کر دیں، میں منگنی میں ارحم بھیا کی طرف سے شریک ہونا چاہتی ہوں، پلیز می! اٹرائی ٹوائڈ اسٹینڈ مائی فیلنگز۔“ وہ ماں کے ہاتھ تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔

”حنین! تمہیں ہر بات سے انکار کر کے مسئلہ بنانے کی کچھ عادت ہی ہو گئی ہے، وہ اس گھر کا داماد ہے، اب اسے کیسے منہ اٹھا کر منع کر دیں؟ شریک تو پارٹی میں ہونا ہے اس سے کیا فرق پڑے گا کہ کس کی طرف سے شرکت کر دو گی۔“ وہ گزشتہ شب سے اسے سمجھا رہی تھیں، آخر غصے میں آئی گئی تھیں، ہاتھ جھٹک کر اس پر برسی تھیں۔

”آپ کو اپنے سڑے ہوئے داماد کی بہت فکر ہے جو مجھے ہٹ کرنے، زچ کرنے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتے، میں ارحم بھیا کی منگنی کو لے کر کتنی رجوش تھی، کتنی تیاریاں کی تھیں، پچھونے لگتی خوبصورت فراک دلائی تھی مجھے اور انھوں نے گھٹیا سی ساڑھی بھیج کر حکم نامہ جاری کر دیا کہ وہ مجھے لینے آ جائیں گے، میں ان کی طرف سے ایجنٹ میں شریک ہوں گی، مجھے نہ وہ ساڑھی پہننی ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ کہیں جانا ہے اور آپ نے مجھے اب فورس کیا ناں می! تو میں پارٹی میں ہی نہیں جاؤں گی۔“ وہ بھی غصے سے پھٹ پڑی تھی اور اس کو روتے دیکھ کر انھوں نے لب بچھنے لیے تھے، انھیں وہ خود بے بڑھ کر عزیمتی، کچھ عرصے سے انھیں لگنے لگا تھا کہ دھیرے دھیرے ان کی بیٹی ان سے دور ہوتی جا رہی تھی، آنسو ان کی آنکھوں سے گرنے لگے تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بالاحالہ ماہ کنعان کے ساتھ جانے کو راضی ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”یہ آپ مجھے ماہ ولاز کیوں لے آئے ہیں؟“ وہ اسے کا شانہ عالم لینے پہنچا تھا جب تو اس کا موڈ خوشگوار تھا، مگر جس دم وہ گاڑی میں بیٹھی تھی، اس کی سنجیدگی وغصے کو محسوس کر گئی تھی اور جب وہ ریش ڈرائیونگ کرتا ماہ ولاز پہنچا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے کہ جانتی تھی کہ پارٹی شیرن میں ہے۔ ماہ کنعان نے ایک سخت نگاہ اس کے دواؤں پر ڈالی تھی کہ اتنا کٹی فیروزی رنگ کی فراک میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی، مگر وہ اس وقت شدید اشتعال میں تھا کہ آج کے لیے اس نے اس کے لیے نیوی بلیوساڑھی لی تھی اور کیا کچھ نہیں سوچ لیا تھا اس لیے اسے فراک میں دیکھ کر وہ پارٹی میں جانے کے بجائے گھر آ گیا تھا۔ اسے اترنے کو کہا اس نے ان سنا کر دیا، اس نے غصے سے فرنیٹ ڈور اوپن کیا اور بازو سے تمام کراے باہر بچھ لیا، اس کے بعد وہ ہزار واویلوں کے بعد اس کے ساتھ چلتی چلی گئی تھی، ماہ کنعان نے اسے اپنے کمرے میں لا کر اس کا بازو آزاد کیا اور بائیں ہاتھ میں موجود شاپرینڈ پر اچھال دیا۔

”جلدی سے چنچ کر کے آ جاؤ۔“ وہ اتنے عام سے لہجے میں بولا تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جبکہ وہ بری طرح رورہی تھی۔

”وقت ضائع نہ کرو حنین عابدی! کہ ہم نے پارٹی میں بھی پہنچنا ہے۔“ اس کا فیروزی آنچل نہ جانے کہاں گر گیا تھا، اس نے دل کو تھکی دے کر نظر چرائی تھی کہ اس وقت بھی سنوری اس کے دل ہی نہیں خواہشات پر بھی گہرا دار کر گئی تھی۔

”چنچ تو میں ہرگز نہیں کروں گی، چاہے پارٹی ختم ہو جائے۔“ وہ رونے کے درمیان ہٹ دھرمی سے چیختی تھی، یکدم ہی اس کے لب مسکرا اٹھے تھے، اس نے چند قدموں کا فاصلہ طے کیا اور عین اس کے سامنے آن ٹھہرا۔

”اس سے اچھی کیا بات ہوگی کہ تم اتنا وقت میرے ساتھ گزار دو گی۔“ اس کو دیکھتے ہوئے اس کی ساحرانہ آنکھوں میں خسار اترنے لگا تھا اور وہ رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی تھی، اس کی آنکھوں سے چھلکتے جذبوں پر وہ نہ محسوس طریقے سے وقدم پیچھے ہوتی تھی۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا آپ سے، آپ پلیز مجھے پارٹی میں چھوڑ دیں۔“ نگاہ جھکاتی لمحہ بہ لمحہ پیچھے ہوتے ہوئے منمنائی تھی اور اس کی نگاہ اس کے احسرس لبوں پر ٹھہر گئی تھی۔

”تم چنچ کر لو تو میں لے جاؤں گا۔“ وہ اس کی حالت سے خطا اٹھاتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا، جو پیچھے ہوتے ہوئے دیوار سے جا لگی تھی اور اس نے دیوار پر دائیں بائیں ہاتھ رکھ کر سارے راستے اس کے لیے مسدود کر دیئے تھے۔

”ورنہ مجھے اکیلے ہی وہاں جانا پڑے گا کہ میں اپنی بہن کی منگنی اپنی نافرمان منکوحہ کے لیے مس تو نہیں کر سکتا۔“ وہ اس کے لرزے وجود پر نگاہ جمائے شوخ ہو رہا تھا۔

”آپ مجھے یہاں اکیلے کیسے چھوڑ کر جاسکتے ہیں، اکیلے میں مارے ڈر کے میرا دم نکل گیا تو؟“ اس کے کچھ دیر پہلے کے احساسات کچھ اور تھے جواب بدل گئے تھے، اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف کی وجہ بدل گئی تھی اور اسے اب ہنسی آنے لگی تھی کہ کتنی افلاطون تھی، مگر دم خم غبارے جیسا تھا، ہوا اب نکلی کتب۔

”تمہیں ڈر ہے کہ اکیلے تمہارا دم نکل جائے گا، تو میں بھی نہیں جانتا۔“ اس کے لب ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں اور دیوار پر ٹھہرا دایاں ہاتھ اس کے چہرے پر آ ٹھہرا، تو اس نے یکدم ہی آنکھیں میچ لی تھیں۔

”لیکن میں اگر تمہارے ساتھ رہا تو تمہارا دم یوں بھی نکل جائے گا۔“ وہ اس کی لرزتی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں کو نگاہ سے چھو تا لہجے میں جذبوں کی آگن لگائے بولا تھا کہ وہ اس کے لیے امتحان بن گئی تھی کہ نہ فاصلے مٹا سکتا تھا، نہ ہی فاصلے پر رہ سکتا تھا کہ وہ اس سے پہلے ہی بدگمان تھی اور آج کا اس کا نکل اسے مزید بدگمان کر سکتا تھا، اس لیے دیوانی کی حد تک جا کر وہ مضبوط سے زرتا اس کے رخسار سے اپنا ہاتھ کھینچا پلٹ گیا تھا، اس کے بعد اسے کچھ کہنا نہیں پڑا تھا، اس نے کانپتے ہاتھوں سے شاپرین سے ساڑھی نکالی تھی اور اس روم میں گھس گئی تھی۔ اس نے ہچکیوں سے روتے ہوئے بہت مشکل سے اس کام کو انجام دیا تھا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، بس ایک دفعہ اس نے شوق شوق میں شازمین سے ساڑھی باندھنا کی گئی تھی، وہی اس کے کام آ گیا تھا، اور اسے دیکھ کر تو اس پر بے اختیار سی آئی تھی کہ اس کا چاندنی میں نہایتراشیدہ بدن نیوی بلیوساڑھی میں حشر برپا کر رہا تھا، مگر اس کی خائف، بدگمان، ناراض نظر اس کے جذبوں پر بند باندھ گئی تھی۔

”آئی ایم سوری، ہٹ اگر تم پہلے ہی میرا گفٹ ایکسیپٹ کر لیتیں تو مجھے اتنا تردد نہ کرنا پڑتا۔“ وہ اپنے کیے پر نادم نہ تھا۔

”آپ اس طرح ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے مزید ناپسندیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے لہجے میں ٹوٹے کاچنگی کی سی ٹھنک تھی کہ اس کی ”میں“ بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

”تمہاری محبت میں مجھے یہ بھی گوارا ہے۔“ وہ اس کے سامنے رکتا مسکرایا تھا اور اس کے کلائی کھینچنے کے باوجود جھتی سے پکڑ لی تھی۔

”تم یہ زبردستی کرنے پر مجبور کرتی ہو۔“ ناگواری سے اس کے چہرے کے گہڑے زاویے دیکھے تھے۔

”آپ کے کہنے پر پہن لی ہے ناں یہ ساڑھی تو اب کیا مسئلہ ہے، چلیں یہاں سے۔“ وہ اس پر پکڑی تھی، اسے یہاں سے جانے کی جلدی تھی کہ اسے اس سے اس کی آنکھوں سے خوف آ رہا تھا، تب ہی تو اتنی آسانی سے مان گئی تھی۔

”میرے کہنے پر پہنٹیں تو مجھے تمہیں یہاں نہ لانا پڑتا۔“ وہ معنی خیزی سے بولا تھا، اس نے نگاہ چرائی تھی۔

”آج کا تم سے یوں ملنا میرے جذبات کو ٹھٹھی ٹھٹھی چھین دے گیا ہے، اور اب مجھے رخصتی کی بات کرنا ہوگی کہ جاناں! اب تم سے دور نہ رہ پاؤں گا۔“ وہ اس کی مزاحمت کے باوجود فیروز کی چوڑیاں اتار کر نیوی بلیو کاچنگ کی چوڑیاں اس کی گلابی بانہوں میں سجا گیا تھا اور اس کی آنکھیں تو مستقل بہہ رہی تھیں، مگر دل کی حالت بھی عجیب تھی وہ کترائی کترائی سی اس کے سامنے تھی۔

”بس کرو جاناں! اور کتنا روؤ گی، سب مجھے پارٹی میں مشکوک نظروں سے دیکھیں گے۔“ وہ اسے چھیڑتا اس کے آنسو پونچھ گیا تھا۔

”وہ وقت کتنا حسین ہوگا، جب صرف میں اور تم ہوگی، میرے لبوں پر تمہارے قصیدے ہوں گے، تمہاری آنکھوں میں میرا عکس بکھرا ہوگا، اور میں تمہیں سینٹا، تمہاری بانہوں میں بکھرا جاؤں گا۔“ وہ اس کی نظروں و جذبوں کی تاب نہ لاتے ہوئے باہر کی طرف بوٹھی تھی کہ وہ راہ میں آتا سے شانون سے تھمتا کہتا چلا گیا تھا، اس کی نگاہ اس کے چہرے کے نقش چھوڑ رہی تھی اور اس نے گھبرا کر مارے خوف کے ہمیشہ کی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”ناراضی و غصے کی قاب پھانچ کر جمل جانے گی اور پھر میں تمہیں اپنی چاہت کی تباہی ڈھا کر تمہیں اپنے نام کر لوں گا، اور تم جو میرے قریب آنے سے گریزاں رہتی ہو، میرے دور جانے سے خائف رہا کرو گی۔“ اس کا چہرہ حجاب کی سرخی سے دھک رہا تھا اور اس کے من میں آگ لگا کر اس کے جذبات کی آج کل کچھ بھڑکا کر لوں سے آنسو جھٹتے ہوئے فاصلہ قائم کرتے ہوئے اسے پارٹی میں لے گیا تھا، جہاں وہ اس کے سامنے سے بھی گریزاں بھاگتی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ٹی پنک شرارے میں ماہ لاج بہت حسین لگ رہی تھی، سچی خوشی کا احساس اس کی آنکھوں میں الوہی سی چمک بکھرا گیا تھا اور اس کے پہلو میں بیٹھا بندھن اور نہایت سنجیدہ سا ارجن اکسن بلیک ڈنرسوٹ میں ڈشنگ لگ رہا تھا، اس نے لاج کی مخروطی انگلی میں نہایت قیمتی و حسین انگلی پہنائی تھی اور اس کو انگلی پہناتے ہوئے لاج کا ہاتھ باقاعدہ کاپ رہا تھا، مگر وہ یہ معرکہ سب کی تالیوں میں سر کر رہی تھی، نو تو زین رہی تھیں اور وہ نامحسوس طریقے سے اس سے اتار لی تھی کہ وہ کراہی بے بسی کا احساس اسے اداس کر رہا تھا۔ جبکہ وہ بہت خوش تھا اپنے کارنامے پر اور سرشاری سے اپنا کارنامہ فضیل کو بتا رہا تھا۔

”مجھے شرم آئی چاہیے کھان!“ اس نے ناپسندیدگی ظاہر کی تھی۔

”ٹوسب کو چھوڑ اور رخصتی کی بات چلا کہ قسم سے یارا! اب مجھ سے انتظار نہیں ہوتا۔“ اس کی آنکھیں اپنی حرکت پر مسرور تھیں اور وہ دلکشی سے کہہ رہا تھا۔

”میں کب چاہتا ہوں کہ تو انتظار جھیلتا رہے کہ دیر تو نوید انکل کی طرف سے ہے کہ حنین ہی راضی نہیں ہے۔“ وہ گہرے تاسف میں مبتلا ہو کر بولا تھا۔

”اوتے یارا! اسے منانا کونسا مشکل ہے۔“ وہ کچھ دیر پہلے کی اس کی جھنجھلاہٹ کو سوچتا متبسم سا بولا تھا۔

”ٹوسوچ کر فیصلہ کر لے کہ اسے منانا واقعی مشکل نہ ہوگا، مگر اس طرح اس کی خوشی سے زیادہ اس سب میں اس کی مجبوری کا ہاتھ ہوگا کہ وہ ابھی نکاح کو ہی قبول نہیں کر سکی، کیا شادی کو کرے گی؟ اور تو نے فورس کیا تو نوید انکل لوگ اسے فورس کریں گے اور اس طرح تو وہ ساری زندگی ایک خلش سی محسوس کرتی رہے گی اور خلش کے ساتھ ملنے والی خوشی ادھوری ہی رہا کرتی ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”اس طرح سوچتا رہا ناں تو ساری زندگی انتظار کرتا رہ جاؤں گا کہ جیسے چند ماہ گزرے ہیں ڈھائی سال اور گزر جائیں گے، مگر اس کی پلاننگ میں ماسٹر زینٹ نہیں ہے، ایم لی اے، بی بی اے، بڑس جوائن کرنا اس نے جانے کیا کچھ سوچا ہوا ہے، بات تعلیم تک رہے گی تو رخصتی سے پہلے اور بعد میں بھی نہیں روکوں گا، مگر اس کی وہ خواہش، وہ خوشی جو آفس جوائن کرنے سے جڑی ہے، میں وہ کبھی نہیں دے سکوں گا اور جب دو سال بعد رخصتی ہونا ہی ہے تو چند دنوں میں کیوں نہیں؟“ وہ اپنا موقف بتا کر سوال کر رہا تھا۔

”اب انتظار مجھے فضول ہی لگ رہا ہے کہ اب اپنی ہی مثال لے لے ٹو نے بھی تو بھائی کو بڑھنے کی اجازت دی ہے، میں بھی دے دوں گا ٹو بھی جانتا ہے کہ میں نیر ومانند ڈنہیں ہوں۔“ وہ اسے قائل کرنا چاہتا تھا کہ بات آگے اسی نے چلائی تھی۔

”یہ سب کہنے کی حد تک ہی رہ جاتا ہے کہ شادی کے بعد اپنے ہی جھیلے کم نہیں ہوتے۔“ اس نے نہایت سنجیدگی سے لہجے میں کہا تھا اور وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تھا اور اس نے نہایت سنجیدگی سے جو خبر دی تھی وہ خوشی سے ہی جموم اٹھا تھا۔

”پاگل انسان، اتنی بڑی خوشی کی خبر تو یوں روتے روتے سنجیدگی سے سن رہا ہے۔“ اپنی بات کے اور جوش کے جواب میں بھی سنجیدگی پا کر وہ متشکر سا پوچھ بیٹھا تھا۔

”میری نیوچ پلاننگ میں یہ سب نہیں تھا۔“ وہ ہنوز اسی کیفیت میں بولا تھا۔

”عجیب گھما کر شخص ہے ٹو بھی، پلاننگ تو فضول لوگ کرتے ہیں میرے یارا! کہ جو جس وقت ہے بس وہی اچھا ہے، اس خوبصورت وقت کا ایک ایک پل خوشی کے احساس تلے بھر پور انداز سے جی لے لے کہ باپ بننے کی خوشی معمولی نہیں ہے، لوگ تو اولاد کے لیے ترستے پھرتے ہیں تجھے بن مانگے اتنی بڑی خوشی مل رہی ہے، تو ٹو ناشکری کر رہا ہے فضول پلاننگ میں گھر کر اتنی بڑی خوشی کو انور کر رہا ہے، جبکہ تجھے تو چاہیے کہ ٹو اس وقت کو بھائی کے ساتھ بھر پور طریقے سے گزرا، لہو لہو ان کے ساتھ مل کر اپنے آنے والے بچے کے لیے خواب سجا، اس کے آنے کی تیاری کر، اس کے لیے کچھ اتنا خاص کر جتنا کسی والدین نے نہ کیا ہو۔“ وہ جذباتیت سے کہتا اس کے کچھ سوئے کچھ جاگے سے احساس اور جذبے مکمل بیدار کر گیا تھا۔

”میں اتنی بڑی خوشی کی خبر پا کر بہت مسرور ہوں، اتنا خوش کہ اپنی پوری زندگی میں اتنا مکمل خوشی کا احساس نہیں ہوا۔“ وہ دھیمے سے بولا تھا، سنجیدگی کا خول چٹخا تھا، آنکھیں مسکرا اٹھی تھیں۔ (جاری ہے.....)

روانگی ڈائری

کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں
کچھ باتیں ہیں پھولوں جیسی
کچھ لمحے خوشبو جیسے تھے
میں شہر چن میں ٹہلوں تو
کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں
وہ بل بھری ناراضگیاں اور
مان بھی جانا بل بھر میں
اب خود سے جب بھی روٹھوں تو
کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

مصاحف کی ڈائری سے

احمد اسلام احمد کی نظم

یہ جو وقت ہے میرے شہر پر
یہ جو وقت ہے میرے شہر پر کئی موسموں سے رکا ہوا
اسے اذن دے کہ سفر کرے
اسے حکم دے کہ یہ چل پڑے میرے آسمان سے دور ہو
کوئی چاند چہرہ اکشا کرے، کوئی آفتاب ظہور ہو
کہ نواح چشم خیال میں وہ جو خواب تھے وہ دھواں ہوئے
وہ جو آگ تھی وہ نہیں رہی جو یقین تھے وہ گماں ہوئے
کوئی دھند ہے جسے دیکھتے میری آنکھ برس سی ہوگئی
وہ عبارت سر لوج دل، کسی ربط سے نہیں آشنا
کہ جو روشنی تھی کتاب میں، وہی حرف حرف سی ہوگئی
کوئی گرد بارانہ نہیں، کسی دزلے کی نمود ہو
یہ جو "ہست" ہے میرے چاروں، کوئی مجزہ کہ یہ "بود" ہو
میری آنکھ میں یہ جورات ہے میری عمری اسے نال دے
میرے دشت رنگ ملال کوئی خوش خبر کا غزال دے
یہ فلک پہ جتنے نجوم ہیں، تیرے حکم کے ہیں منتظر

افشاں علی کی ڈائری سے

لو کیاں واقعی معصوم ہوتی ہیں یا کچھ دھوکے اس
قدر دلکش ہوتے ہیں کہ نسل در نسل اس گنگا میں بہتی
چلی جاتی ہیں، پھر ٹوٹ جانے والے خواب آنکھوں
میں کالج کی کرچیوں کی طرح چیتے رہتے ہیں اسی
بات کی عکاسی پروین کی اس نظم میں ہے۔

پھولوں کی پنکھڑیاں جیتے جیتے
آئینہ در آئینہ خود کو کھو جیتی یہ لڑکی
شہر کی اس سنسان گلی تک آپہنچتی ہے
کہ مڑ کر دیکھتی ہے تو پیچھے دور دور تک
کرچیاں بکھری ہوئی ہیں

ایسا نہیں کہ اس نے
اپنے کس کو جوڑنے کی سعی نہیں کی
پراس تھیل میں بھی تصویر دھندلا گئی
بہمبھی انگلیاں لہولہان ہو گئیں

سحر انجم کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی نظم

جب یاد کا قصہ کھولوں تو
کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں
میں گزرے بل کو سوچوں تو
کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں
اب جانے کون سی نگری میں
آباد ہیں جا کر مدت سے
میں رات گئے تک جاگوں تو

Italiano®

Permanent Hair Colour Cream

Free Developer Inside



Nourishment for Hair With
Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner

وہ جو صبح نو کا نقیب ہو میری سمت اس کو اچھال دے

حنا علی کی ڈائری سے

منیر نیازی کی نظم

کتاب کو بھی خبر ہوتی ہے

اسے کون پڑھ رہا ہے

خراب نظروں سے وہ اپنا اصل باب چھپا جاتی ہے

عورت کو بھی خبر ہوتی ہے

اسے کون دیکھ رہا ہے

خراب نظروں سے وہ اپنا اصل آپ چھپا جاتی ہے

شمالہ قصیر کی ڈائری سے

ایک خوبصورت نظم

ادھوری عورت

بے معنی حیات کی بامعنی باتیں

بے زار دن بے کیف راتیں

میرے لیے میرے پاس وقت نہیں

یہ دکھ صدیوں سے کاٹ رہا ہے میری رگ و جاں

میں نہ مانگوں تو میرے لیے محبت نہیں

میں تمام دن کی جھکن

اپنی روح پہ اتار لیتی ہوں مجھ سے وابستہ ہیں جو

ان کے لیے زندگی بھل کرنے کی تمنائیں

اپنے لیے سانس بھی

ان ہی سے مستعار لیتی ہوں مگر کبھی

جب آئینہ مجھے میرا چہرہ دکھائے

گھر کے کاموں سے جی اٹھ جائے

تو میری خالی خالی آنکھیں

بے ساختہ آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں

اور میرے اندر کوئی کہتا ہے

جو کہتا ہے خدایا!

میری حیات کو بھی جیل کر دے

یا پھر میری زندگی کے معنی تبدیل کر دے

حنا علی کی ڈائری سے

ایک خوبصورت غزل

بس میری جانب دو قدم کر کے چلے جانا

پلٹ کر دیکھنا پھر آکھ تم کر کے چلے جانا

کسی کو روکنا تو دور صدا تک نہ دے سکوں

میری اس بے بسی کا تم بھی غم کر کے چلے جانا

یہاں اب کوئی نہ آئے، یہ اندھروں کی بستی ہے

میرے دل پر تم کر کے چلے جانا

فقط اک بیوقوفی ہی نہیں کہ اب تک مجھ سے

سو میرے ساتھ تم یہ بھی ستم کر کے چلے جانا

ابھی تک پھر ملیں گے کہ نہیں پائے ہو تم مجھ سے

میری جاں یہ ہے رخصت کی رسم، مگر کے چلے جانا

جو کہتی ہیں کہ میں تم سے دوبارہ مل نہ پاؤں گی

لکیریں وہ میرے ہاتھوں سے کم کر کے چلے جانا

نوزیہ خان کی ڈائری سے

محسن نقوی کی خوبصورت نظم

اگر تم آئینہ دیکھو

تو خود سے نظریں چرا لینا

کہ اکثر بے وفالوگوں کو

آنکھیں چور لگتی ہیں

☆ ☆ ☆

اشعار

افشاں علی..... کراچی

پیر کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم

دونوں ہی کو ہم نے بچتے دیکھا کم

ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انسان

بہت خوشی میں بھی تو آنکھیں ہو جاتی ہیں غم

فرزانہ شوکت..... کراچی

اک تنہا آنسو ٹپک پڑا چپکے سے

جینے کی مجھے دعا، میری سہیلیاں دے گئیں

خدا ہوتا نہیں کبھی بے خبر دعاؤں سے

تسلیاں یوں ہی مجھے میری پھیلی ہتھیلیاں دے گئیں

سباس گل..... رحیم یار خان

شوخ، چنچل اور دل ربا سی تھی

تجھ سے پہلے یہ زندگی میری

دھنک ناز..... کراچی

میں نے مانا کہ یہ تقدیر کا لکھا ہے اٹل

میرا ایمان ہے دعاؤں میں اثر ہوتا ہے

تجھ کو مانگوں کی خدا سے جنوں کی حد تک

عشق جب حد سے گزرتا ہے تو امر ہوتا ہے

عانیہ نیازی..... ربوہ

موسموں کی طرح بدل جانا آتا نہیں ہے ہم کو

ہر ایک رُت میں تیرا انتظار کرتے ہیں

نہ تم سمیٹ سکو گی جسے قیامت تک

قسم خدا کی تمہیں اتنا پیار کرتے ہیں

امبرین حیدر..... اسلام آباد

یقین رکھتا نہیں ہوں میں کسی کے تعلق پر

جو دھاگا ٹوٹنے والا ہو اس کو توڑ دیتا ہوں

مرے دیکھے ہوئے سینے کہیں لہریں نہ لے جائیں

گھر وندے ریت کے تیر کر کے چھوڑ دیتا ہوں

نوشین مدثر..... لاہور

میں اپنے پیار کو شہر میں رسوا نہیں کرتا

محبت میں بھی کرتا ہوں، مگر چرچا نہیں کرتا

جو مجھ سے ملے آجائے میں اس کا دل سے خادم ہوں

جو اٹھ کے جانا چاہے میں اسے روکا نہیں کرتا

صدف منیر..... سرگودھا

وہ روئے تو بہت پر مجھ سے منہ موڑ کے روئے

کوئی ہوگی مجبوری جو دل توڑ کے روئے

میرے سامنے کر دیئے میری تصویر کے ٹکڑے

سنا ہے میرے پیچھے وہ اٹھیں جوڑ کے روئے

نازیہ خان..... پشاور

دل ناواں عجب جستجو میں ہے

تم سے شوق گفتگو میں ہے

جدا خود سے کروں تو کیسے کروں

تیری محبت گردش لبو میں ہے

نسرین بشیر..... حیدر آباد

بدلا جو وقت تو گہری رفاقت بدل گئی

ڈھلا جو سورج تو سائے کی صورت بدل گئی

ایک مدت تک تو میں اس کی ضرورت بتا رہا

پھر یوں ہوا کہ اس کی ضرورت بدل گئی

نور بانو..... کوئٹہ

یہ میرا عشق تھا کہ دیوانگی کی انتہا محسن

تیرے قریب سے گزر گیا تیرے ہی خیالوں میں

حنا علی..... ملتان

اس ماہ میں

☆ دریا اور زندگی دونوں پر مضبوط بند باندھنا بڑا تباہی کا وہ ضائع ہونے سے بچ جائیں دریا کو مٹی کا بند درکار ہوتا ہے اور پیکر خاکی کو ضبط کا۔

☆ عادتیں شروع میں کیے دھاگوں کی طرح ہوتی ہیں لیکن بعد میں لوہے کے تاروں کی طرح ہو جاتی ہیں جن میں انسان کی شخصیت جکڑ کر رہ جاتی ہے۔

☆ کمزور لمحے ہر انسان پر آتے ہیں اگر ہم ان کمزور لمحوں کی گرفت سے نکل جائیں تو انسانیت کی معراج کو چھو لیتے ہیں۔

☆ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے سے بڑی بڑی محبتیں جنم لیتی ہیں۔

☆ جب دعا سے بھی بات نہ بنے تو فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

☆ خود کو بدل دو، قسمت خود بخود بدل جائے گی۔

☆ جس کے ساتھ نیکی کرو اس کے شر سے اپنے آپ کو بچائے رکھو۔

☆ حنا علی..... سیالکوٹ

اس ماہ کا قطعہ

ہے بددعا سے بھی بدتر دعائے عمر دراز
اس ایک شخص کو جینے کی آس نہ ہو
نفیس کھیل نہیں ہے شعور و ملت و صفات
خدا شناس کہاں وہ جو خود شناس نہ ہو
نوشین مدرثر..... لاہور

اس ماہ کا احساس

شکر ہے

رداؤ انجسٹ [199] اپریل 2014ء

اس ماہ کے اقتباس

ماں

میں نے لوحِ دل پر تیرا نام لکھا، تم کو آواز دی
”ماں“ اور میری آنکھوں میں سمندر اتر آئے۔ قلم کی
ناؤ بے رحم سمندر کی سفاک موجوں کا کہاں تک
مقابلہ کرے۔ یوں لگتا ہے دل کے توبے پر لفظ جل
گئے ہیں، جلے ہوئے لفظوں کی راکھ میں انگلیاں
پھیرتے، ان گنت قرن گزر گئے
آج پھر.....

میں دشت تنہائی میں آبلہ پا، بے سائبان،
کاندھے پر یادوں کی زمبیل اٹھائے، سایہ سحر کا مستلاشی
سوچ رہا ہوں کہ کیا ماں کے بعد مجھی کہیں سایہ ہوتا
ہے؟

(محمد حامد سراج کی تاثراتی تحریر ”میا“ سے)

☆☆

☆ زندگی تاریکی ہے، سوائے اس وقت کے
جب لگن ہوتی ہے اور ہر لگن اس وقت تک اندھی ہوتی
ہے جب تک علم نہیں ہوتا اور ہر قسم کا علم اس وقت تک
بے کار ہے جب تک کہ عمل نہ ہو، اور ہر عمل کھوکھلا ہے
جب تک محبت نہ ہو، اور جب تم محبت کے ساتھ عمل
کرتے ہو، تب تم خود کو اپنے آپ سے، ایک
دوسرے سے اور خدا سے باندھ لیتے ہو۔

(خلیل جبران)

افشاں علی..... کراچی

اس ماہ کی کریمیں

☆ اگر طلب شدید اور تنہا چچی ہو تو منزل قریب سمٹ
آتی ہے۔

ان سے جو کہے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد
شاملہ قصیر..... کراچی

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں
جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک بل کے لیے رکتے ہیں گزر جاتے ہیں
گہمتِ توفیر..... چیچہ وطنی

دن خفا ہے اور رات بھی نہیں ہوتی
سلے ہیں ہونٹ کوئی بات بھی نہیں ہوتی
وہ میری ذات کا حصہ بھی بن نہیں سکتا
مگر جہاں اس سے میری ذات بھی نہیں ہوتی

ثناء حیات..... کراچی
یہ حدیں نہ توڑ دینا میرے دائرے میں رہنا
مجھے اپنے دل میں رکھنا میرے حافظے میں رہنا
میرے ہاتھ کی لکیر میں تیرا نام بن کے بیٹھنا
میری خواہشوں کی خوشبو میرے زائچے میں رہنا

سباس گل..... رحیم یار خان
صبح کا امکان کرتا ہے وہی
زلیت کا سامان کرتا ہے وہی
اس کی رحمت گر نہ ہو کیسے کٹے
ہر سفر آسان کرتا ہے وہی

مصباح مسکان رؤف..... جہلم
مجھ کو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں
افشاں علی..... کراچی

میں عورت ذات جو ٹھہری، مجھ پہ مسجد نہیں جائز
تم تو پانچ وقت جاتے ہو، خدا را مانگ لو مجھ کو

☆☆☆

مخالف وقت اور بدگماں کو روک رکھا ہے
ہر اک حاسد کی زہریلی زبان کو روک رکھا ہے
اترتی ہی نہیں مجھ پر اس لیے کوئی بھی آفت
میری ماں کی دعا نے آسمان کو روک رکھا ہے
صائمہ قریشی..... لاہور

میرے ہم سفر کا یہ حکم تھا
کہ کلام اس سے میں تم کروں
میرے ہونٹ ایسے سلے کہ پھر
میری چپ نے اس کو زلا دیا
ماہ نور..... فیصل آباد
اس نے ملنے کی بھی کیا شرط رکھی ہے فراز
کہ چل کر آتا ہے سوکھے پتوں پر آہٹ کیے بغیر
بشری نول..... بہاولپور

جو پھول بن نہیں سکتے وہ خار ہوتے ہیں
جھائے بار کے سانچے گزار ہوتے ہیں
میرے خلوص کا جب کوئی ذکر کرتا ہے
میرے حریف بڑے شرمسار ہوتے ہیں
شفیق ناز..... راولپنڈی

کس قدر خوب تھی سادگی آپ کی
آج بھی یاد ہے دوستی آپ کی
جب بھی فرصت کے لمحے ملے ہیں ہمیں
دل نے محسوس کی ہے کہ آپ کی
ریحانہ..... ملتان

اب بھی آ جاتا ہے وہ میرے خیالوں میں
آج بھی لگتی ہے حاضری اس غیر حاضری
نازش خلیل..... اسلام آباد

وہ جو دیتا ہے ہر بات میں سمندر کی مثال
اس سے کہنا کبھی پانی میں اتر کر دیکھے
فارحہ شیر..... خیرپور
دل تو جا پا پر شکست دل نے مہلت نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی گریختے مناجاتوں کے بعد

رداؤ انجسٹ [198] اپریل 2014ء



حیران ہوئے اور پوچھا یہ بھی کوئی کہنے والی بات تھی۔
آپؐ نے فرمایا ”آج میرے نفس میں غرور کی بیماری
پیدا ہو گئی تھی اس کی دوا حاصل کی ہے۔“
عافیہ نیازی..... ربوہ

بینا رہ نور

ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ
سے فرمایا ”اے اللہ! جنت میں تو میرا ساتھی کس کو
بنائے گا؟“ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا ”قلاں
قصاب کو جو قلاں دکان پر گوشت کاٹ رہا ہے۔“
حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قصاب کی دکان کو
تلاش کر کے اس کے پاس پہنچے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ
آخر ایسی کیا خاص بات ہے، جو قصاب جنت میں میرا
ساتھی بنے۔ آپؐ نے دیکھا کہ وہ صبح سے شام تک
گوشت کاٹتا رہا اور لوگوں میں فروخت کرتا رہا۔
آخر کار جب شام ہوئی تو اس نے گوشت کا ایک اچھا
ساٹکڑا لیا اور اسے ٹھیلی میں ڈال کر چل پڑا۔ آپؐ بھی
ساتھ ہو لیے۔ جب وہ گھر میں داخل ہونے لگا تو
آپؐ بھی اجازت لے کر گھر کے اندر چلے آئے اور
ایک طرف بیٹھ گئے۔ قصاب نے گوشت کے ٹکڑے
کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنائیں اور ان کا سالن پکایا،
پھر آٹا گوندہ کر روٹی بھی پکائی۔
کچھ فاصلے پر ایک چار پانی پر ایک بوڑھی عورت
لیٹی ہوئی تھی۔ قصاب نے اس بوڑھی عورت کو ہاتھ
کے سہارے سے اٹھایا اور ٹیکے سے ٹیک لگوا کر بٹھایا۔
اب وہ ایک ایک نوالہ سالن میں ڈبو ڈبو کر اس بوڑھی
عورت کو کھلا رہا تھا۔ تھوڑے سے وقفے سے اس نے
پانی بھی پلایا۔ تھوڑی دیر بعد اس بوڑھی عورت نے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا
ابو الجاح اسدی کہتے ہیں کہ مجھ سے سیدنا علی رضی اللہ
تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں تمہیں اس کام کے لیے بھیجتا
ہوں جس کام کے لیے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم نے بھیجا تھا کہ کوئی تصویر نہ چھوڑنا مگر یہ کہ
اسے مٹا دے اور کوئی قبر نہ چھوڑنا مگر یہ کہ اسے زمین
کے برابر کر دے۔

(باب: 488- مسلم)
سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ قبروں
کو پختہ کریں اور اس بات سے کہ ان پر بیٹھیں اور اس
سے کہ ان پر گنبد (یا عمارت) بنائیں۔
(باب: 489- مسلم)
سیدہ نورین..... کراچی

موافقہ نفس

حضرت عمرؓ بھی اسی نفس کو تلبہ اور غرور کا شکار
نہ ہونے دیتے تھے جب بھی دل میں خود پسندی یا
بڑائی کا خیال آتا تو فوراً ہی اس کا علاج کر لیتے، ایک
دن اپنی پیٹھ پر پانی کی مشک اٹھاے ہوئے جا رہے
تھے کسی نے پوچھا تو جواب دیا: ”آج کسی اچھے کام کی
وجہ سے میرے نفس میں خود پسندی کا سودا سا گیا تھا
چنانچہ اپنے نفس کو ذلیل کر رہا ہوں۔“ ایک دن خطبے
کے لیے منبر پر چڑھ کے فرمایا ”اے لوگو! ایک وقت تھا
میں مزدوری کر کے چھواریے مزدوری میں لیا کرتا تھا
اور اس سے گزر بسر ہوتی تھی کیونکہ میں بہت نادار
تھا۔“ اس کے بعد منبر سے نیچے آئے لوگ بہت

☆ جب بھی آپؐ نے خود سے یہ سوال کیا کہ میں
خوش ہوں تو سمجھئے کہ آپؐ کی خوشیوں کا خاتمہ ہو گیا۔
☆ جو آدمی اپنے آپؐ کو خوش تصور نہیں کرتا، وہ کبھی
خوش نہیں رہ سکتا۔
ایس امتیاز احمد کراچی

اس ماہ کی خوبصورت بات

محبت بھی زندگی کی طرح ہوتی ہے، ہر موڑ پر
آسان نہیں ہوتی اور ہر موڑ پر خوشیاں نہیں ملتیں، پھر
جب ہم زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے تو محبت کا ساتھ
کیوں چھوڑ دیں۔
عمارہ شاہ..... کوہاٹ

اس ماہ کی دلچسپ حقیقت

”الحوار زمی“ کا انسان کے بارے میں انوکھا حساب:
انسان کے پاس اخلاق ہے تو 1 نمبر دینا
اور خوبصورتی بھی ہو تو 1 کے ساتھ 0 لگاؤ = 10
اور دولت بھی ہو تو ایک 0 اور لگاؤ = 100
اور اگر حسب نسب ہی ہو تو پھر ایک 0 اور لگاؤ = 1000
اور اس میں سے اخلاق کا 1 ہٹاؤ تو بس 000 رہ جائے گا۔
انشا علی..... کراچی

اس ماہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ جس میں برداشت کی قوت نہیں وہ سب سے کمزور
ہے اور بے وقوف بندہ ہے۔ (حضرت شیخ سعدی)
☆ اگر تم کسی مرد خدا کو پہچاننے کے خواہاں ہو تو دیکھو
کہ وہ حق تعالیٰ کے وعدے پر زیادہ بے خوف ہے یا
مخلوق کے وعدوں پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے (حضرت
شیخ عبدالقادر جیلانی)
☆ بھائی کا حق اس جگہ معاف کر لو ورنہ وہاں نیکیاں
دینی پڑیں گی۔ (حضرت مجدد الف ثانی)
روشنی فیصل..... کراچی

☆.....☆.....☆

کہ سیکھ کی ساری دعائیں قبول نہیں ہو جاتیں
ورنہ تو بھی ہم
اپنے آپؐ کو دیکھ سکیں
نہ سن سکیں اور نہ بھی چھو سکیں
فرزانہ شوکت..... کراچی

اس ماہ کا گلدستہ

گفتگو

☆ گفتگو کے لئے ذہانت سے زیادہ اعتماد کی ضرورت
ہوتی ہے۔
☆ جس طرح برتن کی آواز سے پتہ چل جاتا ہے کہ
یہ ٹھیک ہے یا ٹوٹا ہوا ہے، اسی طرح آدمی کی گفتگو
سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ عقل مند ہے یا بے وقوف۔
☆ جب آپؐ کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ ہو تو کچھ
نہیں کہیں۔
☆ زیادہ بولنے والے عمل کم کرتے ہیں۔
☆ جو شخص جتنا کم سوچتا ہے اتنا ہی زیادہ بولتا ہے۔

محنت.....!

☆ آدمی کی دس انگلیاں اس کی بہترین دوست ہیں۔
☆ اگر ہم محنتی ہیں تو کبھی فاقہ کشی میں مبتلا نہ ہوں گے
کیونکہ محنتی شخص کے گھر میں یہ صرف باہر سے جھانکتی
ہے، اندر داخل نہیں ہو سکتی۔
☆ نوجوانوں کو صیحت کے لئے میرے پاس تین
الفاظ ہیں۔۔۔ کام، کام اور کام۔

مسرت.....!

☆ صرف وہی آدمی خوش رہتا ہے جو دنیا کو جانتا ہے
لیکن اس کی پروا نہیں کرتا۔
☆ میں نے اپنی خواہشوں کی تسکین کے بجائے اپنی
خواہشوں کو محدود کر کے خوش رہنے کا طریقہ سیکھ لیا

ہے۔

ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مطلب تھا اب بس.... تو قصاب نے اس کو لٹا دیا۔ اس وقت بوڑھی عورت نے زبان سے کچھ کہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص سے پوچھا ”یہ کون ہے؟“ اس نے جواب دیا ”میری ماں“۔ آپ نے پوچھا ”اس بوڑھی عورت نے تمہیں کھانا کھانے کے بعد کیا کہا؟“ اس شخص نے کہا ”یہ ہر روز مجھ کو اسی طرح کہتی ہے کہ اللہ تجھے جنت میں موسیٰ علیہ السلام کا ساتھی بنائے، اب میں کس مقام پر اور موسیٰ علیہ السلام کس مقام پر“۔

میرے خیال میں یہ واقعہ ہمارے اعصاب جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ آج کل ہم جیسے گناہ گار لوگ والدین کو بھی بوجھ خیال کرنے لگے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو والدین کا فرما نبردار اور خدمت گار بنائے (آمین)

ایس۔ امتیاز احمد..... کراچی

فرمان علی

☆ میں بڑوں کی عزت اس لیے کرتا ہوں کہ ان کی نیکیاں زیادہ ہیں اور چھوٹوں کو پیارا اس لیے کرتا ہوں کہ ان کے گناہ مجھ سے کم ہیں۔

سارہ شاہین..... تلوٹڈی

ایک قدم

ایک ولی فرمایا کرتے تھے کہ ”جنت دو قدم کے فاصلے پر ہے۔ کسی نے پوچھا ”جناب! وہ کیسے؟“ فرمایا ”ایک قدم تو اپنے نفس پر رکھ لے دوسرا قدم تجھے جنت میں پہنچا دے گا۔“

نوربانو..... کوئٹہ

آزمائش

ہر حال میں رب کا شکر ادا کرتے رہو، بے شک خالق کائنات وہ جانتا ہے جو ہم نہیں جانتے ہماری ہر

2014 اپریل 202

کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل تر ہے۔

☆ عورت کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ جلدی اعتبار کر لیتی ہے۔

☆ عورت کے دل پر جو اہرات کا اثر مرد کی تصویر سے زیادہ ہوتا ہے۔

☆ مسکراتی ہوئی عورت پر کبھی بھی یقین نہ کرو۔

☆ عورت اور شراب سب کو یہ قوف بنا دیتے ہیں۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ پانی کی طاقت عورت کے آنسوؤں کی ہے۔

☆ عورت زندگی میں صرف ایک راز محفوظ رکھتی ہے اور وہ اس کی عمر کا راز ہے۔

☆ جو شخص کسی عورت سے اس کی خوبصورتی کی وجہ سے شادی کرے وہ احمق ہے۔

☆ جو عورت سے روپے کے لیے شادی کرے وہ لالچی ہے اور جو شخص حسن، سیرت کی وجہ سے شادی کرے وہ حقیقی شوہر ہے۔

☆ عورت سب سے اچھا اور سب سے پیارا آسمانی تحفہ ہے۔

☆ وہ شخص جو عورت کی خواہش کو طاقت سے بدلے بیوقوف ہے۔

☆ عورت کے لیے لڑائی اور محبت میں سب جائز سمجھا جاتا ہے۔

نورین ملک..... کراچی

شکایت

ایک صاحب نے پڑوسی سے شکایت کی ”جب میں ہارمونیم بجاتا ہوں آپ کا کتا بھونکنے لگتا ہے۔“ پڑوسی نے جواب دیا ”اس میں بے چارے کتے کا کیا قصور... پہل تو آپ ہی کرتے ہیں۔“

ماریہ..... راولپنڈی

جو ہر شناس

بیوی نے شوہر کو اطلاع دیتے ہوئے کہا ”آپ کی خالہ نے ہماری بچی کی سالگرہ پر جو پازیب تحفے میں دی ہے وہ چاندی کی ہرگز نہیں ہے۔“

”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو تمہیں کیا چاندی کی پہچان ہے؟“ شوہر نے ذرا فحشگی سے کہا۔

”مجھے چاندی کی پہچان تو نہیں لیکن میں تمہاری خالہ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“ بیوی نے جواب دیا۔

ماہ نور..... فیصل آباد

خوشبو

☆ کامیابی کبھی بڑی نہیں ہوتی، پانے والے ہمیشہ بڑے ہوتے ہیں۔

☆ دروازہ کبھی بڑی نہیں ہوتی، بڑھانے والے ہمیشہ بڑے ہوتے ہیں۔

☆ تاریخ کے ہر صفحے پر لکھا ہے دوستی کبھی بڑی نہیں ہوتی نبھانے والے ہمیشہ بڑے ہوتے ہیں۔

نما رہ شاہ..... کوہاٹ

ٹاس

ایک سنسان سڑک پر ایک راغبیر نے ایک شخص کو روکا اور کہا: ”کیا آپ ایک روپے کا سکہ عنایت کریں گے؟“ وہ صاحب بوئے ”ضرور ضرور... مگر آپ کو اس وقت اس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

راغبیر نے جواب دیا ”بات یہ ہے کہ میں اور میرا ساتھی ایک روپے کا سکہ اچھال کر یہ ٹاس کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کون آپ کا موبائل لے گا اور کون آپ کا بیٹا لے گا۔“

اتشال اریب..... وہاڑی

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

فران پیر سے کہنا

حوصلے سے کام لے
زندوں کا ماتم نہ کر

آنسوؤں سے انعام دے
سن ورق ورق

لہو میں ڈولی
کر بلا کی خوبی داستان

کیا عجب
امام امت کے ہاتھوں

زخمی ہوا جاتا ہے
جبرائیل نے جسے جھولا

جھلا یا تھا بھی
نبی ﷺ کا وہ پیارا انوار

تیروں سے چھٹی ہوا جاتا ہے
لنا کر انمولوں کو

صحرا میں
پروردگار کے حضور

سرخرو ہوا جاتا ہے
خبردار خیردار

ہائے حسین نہ کہنا
یا حسینؑ کہہ کر

زندگی کو دوام دے
میرے حسینؑ کے صبر کو داد دے

حافظہ مومن شاہ بخاری

غزل

محبت میں آنسو ہو گیا کوئی
لہروں کی طرح بکھر گیا کوئی
اشارہ دے رہی ہیں یہ آنکھیں کھلی

زار اصف قمر

یا حسینؑ ابن علیؑ

دل کو تھام کر

بدن کے پیچھے سے اڑ گیا کوئی
بہت کے ساتھ کچھ یوں معاملہ رہا
بازی ہوئی کسی کی اور جیت گیا کوئی
اس کے لیے تو فقط ایک تھپڑ تھا
مگر اندر تک ٹوٹ گیا کوئی
پتلیں اٹھا کے دیکھا جو مجھے اس نے
خنجر بھی نہیں چلا اور قتل ہو گیا کوئی
اس کے چہرے پہ لکھی تھی داستانِ غمِ عامر
لگتا تھا ساتھ اس کے گزرا ہے حادثہ کوئی

عامر عزیز

نظم

اک شب چاند آگن میں اتر آیا
عشق کی ایندھن میں جلتے شعلے
نظروں میں ہار کی سرنخی سی
بے وفا کی مدت سے سہی جان
تہا پلوں کی لمبی مسافتیں سی
تو اک روز جھوٹ ہی اسے اپنا کر
من ہی من دیر تک باتیں کر

شامیں ٹھکن اتار دیئے
گزرے کل تھے آج سنوار دیئے
اک شب ہو صدیوں جیسی جگا دیئے
جو کچھ ہے من کے بند کمروں میں
مسکرا کے کاش کوئی بولے

سنو جاناں!
عشق کی کالی ایندھن میں جلتے شعلے
یہ وقت مکار ہے ٹوچپ کے کرو لے
کوئی پوچھے بکھرنے کا سبب کر

دھیرے سے نگاہیں ملا کر
باتوں میں اسے الجھا کر
راستہ بدل اب کے ٹو نہ سوچ
اسی کے ہم راہ ہولے
چاند نہ سمجھ مجھے سمجھتا ہے

رات ہوتی ہے آگن میں اتر آتا ہے
جگتا ہے خود ساری شب تنہا
یہ جاگنے والے کو تپاتا ہے
نہیں مان کسی کی نہ سن کسی کی
بول وہی جو تیرا دل بولے
وحشت ناک کرب سی یادیں
بہتے دنوں کی ساری جلتی باتیں
بھلا دوں ہر یاد جلا دوں
مگر

وہ جودل میں رہتا ہے

نہ بھولتا ہے نہ بھولنے دیتا ہے
انیت ان سے اس قدر ہوئی

ذات اجنبی اپنی ہوئی
دل کے در پہ دستک دے لے

دیوانے عشق میں جلتے شعلے
اب ٹو بھی چھپ کے رو لے

شراحہ

غزل

وہ ستم ہم پہ دن رات کرتے رہے
پھر بھی ہم اس ستم گرہمے مرتے رہے
راہ الفت پہ چلنا کھن ہے مگر
ہم دیوانے شب و روز جلتے رہے
خار تھے کوچہ پار میں ہر طرف
ہم مگر پھر بھی آگے ہی بڑھتے رہے
انتظارِ صنم میں دیا بھی جلا
کتنے پردانوں کے پر بھی جلتے رہے
جیسے جیسے یہ خورشید ڈوبا صنم
تیری یادوں کے انجم ابھرتے رہے
خاک بھی مجھ پہ ڈالی نہ احباب نے
عمر بھر جن کو ہم یاد کرتے رہے
سامنے قاتل دل کھڑا تھا مرے
گفتگو ہم تو کرنے سے ڈرتے رہے

ہم اس کو زندہ و شاداں سمجھتے رہتے ہیں
ایک تصویر سے آنسو ٹپکتے رہتے ہیں
سخت لکڑی کے شجر جلد ٹوٹ جاتے ہیں
اور پلکدار تو صدیوں لپکتے رہتے ہیں
ایک مدت ہوئی پت جھڑنے اس کو آن لیا
مگر پرندے ابھی تک چپکتے رہتے ہیں
کبھی تو دیکھ میری پر خیال آنکھوں میں
تیرے خیال کے جگنو چمکتے رہتے ہیں
وہ کہتے کہتے کوئی بات کہہ نہیں پاتا
کہ اس کی ذات میں جذبے دہکتے رہتے ہیں
غموں کے زلزلے آتے ہیں اس شہر میں بہت
سکھوں کے جام بھی ہر دم چھلکتے رہتے ہیں
دکھی دلوں کو میں رکھتا ہوں ذات میں ساجد
بہت سے دل میرے اندر دھڑکتے رہتے ہیں

سید ساجد

عشق مسلسل میرے دھیان میں ہے
ہجر کا روگ بھی امکان میں ہے
تم تو خوش ہو کیا بتائیں مجھیں؟
زندگی کس امتحان میں ہے؟
شاخ گل چہ بول اگنے لگے
عجیب منظر چہم حیران میں ہے
خواہشیں بھی چھڑا گئیں دامن
ایک سنا دل ویران میں ہے
خوف اس کو ہے مری حیات کا تب تک
تیر جب تک میری کمان میں ہے
گل صحرا کو بھی جل تھل کر دے گی
وہ جو بارش چھپی آسمان میں ہے

سہاس گل

زندگی کی کسی شام
کبھی اپنی سوانح حیات لکھوں گا
اپنے دل کی وہ ہر اک بات
لکھوں گا
جو کبھی کہہ نہ سکا
جو کبھی لکھ نہ سکا
اپنے دل کی ہر اک آہ لکھوں گا
میرا ذوق جنون
میری راتوں کی تنہائی
کب تک درد کے صحرائیں
میرے کام آئی
لکھوں گا

زندگی کا فسانہ اور خوشیوں کے وہ چل
جو کسی سے بانٹ نہ سکا
پلکوں میں چھپے آنسو
آنکھوں میں سجے ہیں
غم کا اٹھتا ہوا دریا
تیرے جانے کے بعد
لکھوں گا

جدا ہوئے ہیں تو کیا ہوا ہے
بہی تو دستور زندگی ہے
کوئی بھی رت ہو
نہ چاہتوں کو زوال ہوگا یہ طے ہوا تھا
آؤ کہ کشتیوں کو اجال دیں گناہ ساحلوں پر
کہ اب سے نہ واپسی کا سوال ہوگا
یہ طے ہوا تھا

ہر مل اداسی سی چھائی ہوئی ہے
زندگی کی پر چھائیوں میں
نہ جانے کب تم جاسیں سائیں
زندگی کی راہوں میں
اک درد پھیلتا جا رہا ہے جسم و جان میں
زندگی کے صحن سفر سے
جس میں چل چل کر اک ایسا اذیت کا احساس پھیل رہا ہے
ویران دل کے نہاں خانوں میں
کہ اب کی بار رک جائیں قدم
اس سے پہلے کہ رک جائیں سائیں
دل کی دھڑکن مدھم پڑ جائے
اور دھڑکنیں بے اختیار ہو کر بند ہو جائیں
کہ اب کہ بار آ جاؤ
کہ اب کی بار آنکھوں میں ویرانی چھا جائے
اس سے پہلے کہ نگاہوں میں اندھیرا چھا جائے
آنکھوں میں انتظار کے دیپ بجھ جائیں
اور زندگی میں امید کے جگنو تم ہو جائیں

کہاں میرے محبوب

زندگی کے ہم سفر
ہم قدم
زندگی کی اداسی ختم کر جاؤ
کہ اب کہ بار آ جاؤ
کہ اب کی بار آ جاؤ

مدیحہ اعجاز حسین

کبھی جو تم خود کو
تنہا پاؤ تو.....
ہمیں تو تم یاد
کر لینا
صدادینا ہمیں
کبھی جو خود تنہا

پاؤ تو
ہمیں اپنے پاس بلا لینا
ہم سے ملاقات
کر لینا
ہم سے ملنے چلے آنا
کبھی جو خود کو تم
تنہا پاؤ تو.....
ہمیں خود میں
چھپا لینا
ہمیں اپنے
پاؤں میں بھر لینا
کبھی جو خود کو تنہا پاؤ تو...
ہمارے پاس چلے آنا
ہمیشہ ہمیں تم اپنے ہمراہ
پاؤ گے
کبھی جو خود کو تنہا پاؤ تو...

افسانہ آفتاب

تیرے پھڑکنے کے کچھ عرصے بعد جاناں
اپنے احساسات
اپنے درد
قلم سے کاغذ پر بکھیرے
میرے غم غزل کی صورت اترتے چلے گئے
میرے احساسات نظم کی مانند ٹکھرتے چلے گئے
لوگوں نے مجھے شاعر کہہ دیا
شاعری سب میں پھیلائے کا کہہ دیا
تو خود ہی بتا جاناں
میں اپنی کہانی سب کو سناؤں
واسطے ہر ایک پر احساسات کرواؤں

مریم منغل

میرے جیون ساتھی تیرے لئے

لکھی ہے یہ شوخ و جذباتی سے بھری
غزل صرف تیرے لئے
بن گئی ہوں تیری دیوانی
صرف تیرے لئے
کسی کو بھی نہیں دیکھیں گئیں
تیرے بعد اب میری نگاہیں
نظریں دیدار کو ترسیں گئیں
صرف تیرے لئے
ہریں ہر سانس میں
یاد کروں گی میری جان تھک
میری ہر سانس نکلے گی
صرف تیرے لئے
تمہاری ہمسفر

ریمانوور رضوان

پہنا ہے زندگی

اپنی کتاب زندگی
شکل بہت بھاری بہت
مجھ کو تھکا دیتی ہے
تھر بنا دیتی ہے
لیکن میرا سا بھی میرا اپنا
جب اس کی اوس میں مہکتا ہے
تو اس معطر پھول سے
بہل جاتی ہے زندگی
اس کی زندگی میں
اس کی خوشبو کے سائے میں
کتے صحراؤں کو روندنا ہے
یہی میرا سرمایہ ہے
ورنہ کتاب زندگی
مشکل بھی ہے
بھاری بھی ہے

فرزانہ شوکت

غزل

ہر بار میں بھی جیت کا امکان جان کر
وہ جی رہا ہے درد کا درمان جان کر
اس کو بھی دل میں آنکھوں پہ دیتا ہے وہ جگہ
دشمن بھی گھر پہ آئے تو مہمان جان کر
وہ چاہتا ہے گھر ہو آلودگی سے پاک
ہر دل میں زندہ رہنے کا ارمان جان کر
دیتا ہے خار بھی تو سمجھتا ہے اس کو پھول
وہ زندگی یہ دوست کا احسان جان کر
کہتا ہے سچی بات بلا خوف بے بھگ
وہ ہر فقیہ شہر کو انسان جان کر
کھانے لگا ہے خوف رفاقت کے نام سے
وہ قتل اعتماد کا عنوان جان کر
دیکھا ہے اس کا زخم بھی تم نے بھی امتیاز
اپنوں میں بن گیا ہے جو انجان جان کر
ایس اتیار احمد

نظم

چاہتوں کے سفر میں
مختبوں کے دیس میں
کسی اور بھیس میں
جو نہیں ملتا تھا
وہ میں نہیں
کوئی اور تھا

رومان دانش

نظم

اس نے پرکھا ہے
خوب موجوں کو
کس کو کیسے زوال ہوتا ہے
میں کناروں سے کیسے آیا ہوں
ڈوبنے کا بھی ہنر
ساتھ نبھانے کا بھی

سید بشارت شاہ

☆.....☆.....☆

صالحہ محمود

سنو بیس

شنا تاج.....شو رکوت

سوئیٹ صالحہ آپنی! آداب...! ماہنامہ روز بہ روز
آگے کی طرف بڑھتا جا رہا ہے، چھوٹی چھوٹی
کہانیاں بہت ساری کہانیوں کو کھینچنے کے لیے کافی
ہیں، لمبے ناول مجھے اتنے اثریٹ نہیں کرتے،
چھوٹے افسانے مثلاً ذات کا بھرم، سنگ ہوں
تیرے، فقط وہی ذات کامل، گردش ایام، ہم کہاں
کے دانا تھے، سورج کی گل، پرکھ، کبھی زبردست
تھے، کوڑے میں دریا تو کیا روانے سمندر بند کر دیا
ان سب افسانوں میں مجھے سب سے اچھا افسانہ
گردش ایام، فقط وہی ذات کامل، بہترین افسانے
لگے، سندیسوں کی بزم میں پہلی بار شامل ہو رہی
ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھے جگہ دیں گی
میں ردا کے مستقل سلسلوں میں ردا کی ڈائری میج
رہی ہوں، آپنی! قمر دوش شہک کا ناول تیرے پیار
کی خوشبو بے حد اچھا جا رہا ہے، ان کو میری طرف
سے اتنے خوبصورت انداز میں کہانی لکھنے پر
مبارک باد دیتیجی گا، شاز یہ مصطفیٰ کے تو کیا کہنے لیکن
ناکلہ طارق اور سعدیہ عابد بھی اچھا لکھتی ہیں، ہر چیز
ردا کی پرفیکٹ ہے ورنہ میرے ابو بھی بھی پڑھنے کی
اجازت نہ دیتے۔ باقاعدہ ہا کر پرچہ ڈال کر جاتا
ہے، میرا بھائی مجھے خود لا کر دیتا ہے، حسن جمیل کے
نام سے میرا بھائی شاعری کرتا ہے، اس بار ذرا پھر
سے کہنا میں، افسانہ آفتاب، بحر النعم، ایس اتیار،
اتشال اریب کا کلام بے حد پسند آیا لیکن اور سنگھار
حسب توقع بہت زبردست تھے۔ یہ دونوں سلسلے

ایسے ہیں کہ ان سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا
ہے۔ آپنی! میرا سند یہ ضرور شامل کیجیے گا اگلے ماہ
پھر ضرور حاضری دوں گی انشاء اللہ حافظ!

ایمانور.....کراچی

السلام وعلیکم! ڈیر سٹ دل کے بہت قریب پیاری
صالحہ آپنی جانی! دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں
کے ساتھ منفر دہوتے ہوئے منفر دلفظوں کے ساتھ
، تمام اسٹاف، ریڈرز، رائٹرز، نورین جی، کو ریما
نور کا پیار اور خلوص بھر السلام وعلیکم: چھ مہینوں بعد
ردا کی بزم میں شریک ہوئی ہوں۔ پلیز بار بیٹھنے تو
دوناں۔ مارچ 2014 کا ٹائٹل ویری اوسم، ماڈل
کا ڈریس بہت اچھا لگا۔ آپنی گوشہ آگئی پڑھ کر دل
نے آپ کی ہر بات پر اگیری کیا۔ آپ کا قلم سچائی
بہت دلکشی و صفائی و حقائق سے بیان کرتا
ہے۔ ماشاء اللہ کسی بھی ڈائجسٹ کی کسی بھی ایڈیٹر کا
اداریہ اتنا پاور فل نہیں ہوتا۔ یہ صلاحیت صرف آپ
میں دیکھی ہے دل کے درد کو چھڑا ہے۔ ہمارے
حکمرانوں کو اللہ پاک جلد ہدایت دے۔ آمین۔
ردائے جنت ویری ویری ناس، ہر یاہ کی طرح اتنی
پیاری پیاری احادیث الہی کی ہوئی ہیں معلومات
میں اضافہ کرنے کا شکریہ۔ صالحہ آپنی! یہ کیا کر دیا۔
اوہ نو... رگ جاں کے قریب کا اینڈ اب جلد ہی
آپ کا نیا ناول ضرور ہونا چاہئے۔ ورنہ ڈائجسٹ
سونا سونا لگے گا۔ اختتام زبردست رہا۔ رومی جیسے
کرکٹر آئی لوٹ، فیکل اور رومی کا ملن یادگار
رہے گا۔ شامل نے اپنی محبت جن لفظوں میں بیان

کی am write less | صالحہ آئی! آپ تو ہیں ہی سینئر پیر سینئر۔ مزید لکھیے گا۔ اچھا لگتا ہے۔ سینئر کو پڑھنا اور اپنی اصلاح کرنے کا موقع ملتا ہے۔ قمرش میڈم تیرے پیار کی خوشبو، میری سوچوں سے بڑھ کر زبردست ہے۔ یار سوسی کو کیا ہوا۔ کہاں غائب کیا ہوا ہے۔ جلدی منظر عام پر لاؤ۔ مقوم نام بہت پسند آیا۔ جوائنٹ فیکلٹی سسٹم میں بہت پیار و محبت دیکھا یا ہے۔ ڈالے کی اسٹوری تو ناول کی جان ہے۔ ہمیشہ کی طرح قمرش جی نے الگ سا پلاٹ مختلف و دلکش کریکٹر، انٹرٹیننگ پس منظر، امیزنگ مزہ آجاتا ہے۔ ہر اسکرپٹ جاندار و شاندار ہوتا ہے۔ ویلڈن! افسانے تو ردا کی جان و شان ہیں۔ سارے افسانے بہترین لگے۔ اللہ پاک ردا کو مزید ترقی، کامیابی و کامرانی عطا فرمائے (آمین!) ردا کی آٹھ سال پرانی رائٹر کا آپ سب کو پیار بھرا سلام، اللہ پاک آپ سب کی اور میری خوشیاں قائم و دائم رکھے، آمین۔ اللہ پاک آپ کو صحت و تندرستی والی زندگی عطا فرمائے، آمین۔ اس اپنے بن کے ساتھ کے ردا پڑھتے اور ردا میں لکھتے رہیں گے، اپنا اور اپنے سے جڑے رشتوں کا خیال رکھیں گے۔ مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں، اللہ حافظ۔

رابعہ افضل خان..... کراچی

ردا کی تمام قارئین، رائٹرز اور صالحہ آپ کو رابعہ افضل خان کا جذبات سے لبریز اور محبت سے گندھا سلام حاضر ہے سب سے پہلے بات ہو جائے مارچ کے ٹائل کی ماڈل کا میک اپ ڈریس ہینئر اسٹائل سب پر فیکٹ تھا سب سے پہلے گوشہ آگئی پر آ کر نظریں رک گئیں۔ صالحہ آئی کیا بات ہے آپ کی اس کے بعد ردائے جنت کی طرف بڑھے اور بہت ساری اسلامی معلومات حاصل کیں۔ سلسلے وار ناول میں سب ہی رائٹر نے زبردست

لکھا جتنی تعریف کی جائے کم ہے افسانے بھی سب ہی اچھے تھے پھر ہم پٹری کی طرف بڑھے اور اپنی نظم دیکھ کر از حد خوش ہوئی، محفوظ الحسن کی شاعری بہت اچھی لگی۔ لیکن میں ساری ریسیپر زبردست لکھیں، منہ میں بانی بھرا آیا، سنگھار میں اس دفعہ کی ساری میس اچھی تھیں، ردا کی ڈائری زبردست تھی کہنے کے لئے بہت کچھ باقی ہے مگر خیر قلم کا نانا یوں ہی ردا سے جڑا رہے انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گی۔ اب اجازت چاہوں گی خدا حافظ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور دن بدن ترقی سے ہمکنار کرے، آمین۔

زاہدہ زاہی..... کراچی

ہمارے دلوں کی دھڑکن اور خوبصورت احساسات و جذبات کی مالک سوئیٹ سی صالحہ آئی! کو زاہدہ ہاشمی کا پر خلوص سا سلام پہنچا رہی ہیں اپنی جانی؟ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ آپ کی جی ”رگ جاں سے جو قریب تھے“۔ کا اینڈ آپ نے بہت زبردست کیا۔ حقیقت سے قریب تر اس ناول نے میرے ذہن پہ یادگار سے نقش چھوڑ دیے۔ بے شک آپ کے لکھنے کا انداز بہت خوبصورت ہے۔ میں نے اس ناول سے بہت کچھ سیکھا۔ اب شدت سے انتظار ہے آپ کے ٹیکسٹ ناول کا۔ تو اپنا جی! کب تک روٹیں بجھیں گی آپ ردا کو آپ جی! آپ کے لئے ڈھیر ساری دعائیں ہیں، مارچ کا ماہنامہ کافی لیٹ ملا۔ صبر کا پیمانہ تقریباً لبریز ہو گیا تھا۔ خیر جب ردا ہاتھ میں آیا تو سکون سا مل گیا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو دل خوش ہو گیا۔ اور تمام افسانے اور ناول بہت اچھے تھے۔ عشق کدہ نائلہ طارق نے بہت اچھا ناول لکھا۔ اور تمام سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح بہت خوبصورت اور دلچسپ تھے۔ میری طرف سے تمام ردا اسٹاف و قارئین کو سلام۔

عمارہ شاہ..... شاہ کوٹ

السلام علیکم سوئیٹ صالحہ آئی! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ سب سے پہلے آپ کو آپ کے شاندار ناول کے اختتام پر بہت زیادہ مبارک باد۔ آئی بہت شاندار ناول تھا، بہت زیادہ مزہ آیا پڑھ کے، اٹھل اور رومی تو اس ناول کے جان تھے، آپ یوں سمجھ لیں میں آپ کی بہت بڑی فین بن گئی ہوں اس ناول کی وجہ سے۔ آپ کی میری طرف سے ایک بہت بڑا اپوارڈ ملنا چاہئے آپ کو اس unique ناول پر، فی الحال آپ کی میری طرف سے دنیا کی ساری اچھی دعائیں آپ کے نام آئی۔ اس کے علاوہ ہر ماہ کا ردا super ہوتا ہے۔ ”تیرے پیار کی خوشبو“ قمرش آپ کی پلیز زریں کی سزا کو بس ختم کر دیں، بذمہ ڈالے کو کب یقین آئے گا زریں کی محبت کا۔ ہر ماہ کے ناول، افسانے اور ناول بھی بہت زبردست ہوتے ہیں۔ خوشبو، اس ماہ میں اور دوستوں کے نام پیغام کے سلسلے بھی ہر ماہ شاندار ہوتے ہیں۔ میری دعا ہے ”ردا“ یوں ہی ترقی کرتا رہے۔ آپ! اپنا خیال رکھیے گا اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

مونا شمیم..... حیدر آباد

آئی! بعد سلام کے عرض ہے دس سال کے بعد جب میں کراچی میں تھی ردا ڈائجسٹ میں میری دوست عابدہ عین، تہینہ الیاس، اجالا خان، عیشیہ مسعود، رخ چوہدری ان دنوں چھائی ہوئی تھیں، اور میں نے آپ کو اس وقت سندیر مونا سرفراز کے نام سے لکھا تھا اب میں مونا شمیم کے نام سے لکھتی ہوں، آپ! اتنے دنوں کے بعد ردا دیکھ کر میں چلتی گاڑی سے اتر پڑی، گوشہ آگئی پڑھ کر یوں لگا جیسے برسوں کی شناسائی تھی جو ایک بل میں مل گئی، سندیر سے ہی مجھے پتہ چلا کہ آپ کا ناول کچھ ہی ماہ پہلے اختتام پذیر ہوا ہے اور

وہ بے حد سراہا بھی گیا، آپ! مجھے کتابی شکل میں آپ کے سارے ناول خریدنے ہیں میں کراچی اکثر آتی جاتی ہوں دل چاہ رہا ہے بھی آؤں تو آپ کے آفس بھی چکر لگاؤں، نئے نئے نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، لیکن پرانے ساتھیو! آپ کہاں ہو؟ یاد آیا سویرا فلک بھی ہوا کرتی تھیں، نجانے وہ سب کہاں ہیں، ایک جانا پہچانا سا احساس مجھے کتنے خوابوں میں لے جا رہا ہے، اپنے میکے کی یادیں اپنے سارے دوست اپنے ناظم آباد کا اردو بازار جہاں پر میں نے ٹھیلے سے پہلی بار مارچ کا ردا خریدا تھا آج بھی مجھے یاد ہے۔ شازیہ مصطفیٰ جی کو میں نے پڑھا اور پرانے ناموں میں قمرش کو دیکھ کر میں لپک پڑی جھٹ کھولا ہائے قمرش وہیں نہیں کھٹ سے ایک ریلہ یادوں کا گزرا ارے ہاں غزالہ شہزاد بھی تو ہوئی تھیں، آپ! آپ یقین کریں دل دھکی دھکی سا ہو گیا نو شاہ فاروق، ”روپ میرا سنور جانے دو“ بنتی ہوئیں سامنے آ گئیں۔ ردا ڈائجسٹ پہلے سے کہیں بہتر ہو گیا ہے کچھ سلسلے نئے ہیں بانی سب پرانے ہیں۔ خوشبو، ردائے جنت، آج بھی مہک رہے ہیں۔ ردا کی ڈائری اور اشعار آج بھی گنگنا رہے ہیں، سنگھار اور کچن کا تو لطف ہی کچھ اور ہے، اس ماہ کی تو بات ہی کچھ ہے، یوں دیکھا جائے تو آئی! میں ردا کی پرانی قاری ہونے کے ناطے میں بھی ردا کی شہزادی ٹھہری یوں لگا سب سلسلے مجھے آواز دے رہے ہیں، مونا شمیم! واپس آؤ اپنے شہر، واپس آؤ! میرا کوئی بھی بہن بھائی نہیں ہے، میں تنہا امی کے ساتھ رہتی تھی، پھر بیاہ کر تیا ابو کے گھر آ گئی، زندگی کی اس بھیڑ میں تنہا ہوں ہر چند کہ دو بچوں کا ساتھ ہے، آپ! پلیز پلیز میرا سندیر ضرور شامل کیجیے گا، میں ہر ماہ ردا خریدنے لگی ہوں، آپ پلیز میرا خط ردا کی

نوکری میں مت ڈالے گا۔

مصباح مسکان رؤف..... جہلم

پیارے پاکستان کے پیارے پیارے لوگو! ”ردا ڈائجسٹ“ کے توسط سے جہلم کی مصباح مسکان رؤف اور امینہ رؤف کی طرف سے پیار بھرا السلام علیکم! ہم نے پہلی بار ردا پڑھا، مگر ایک بار بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ پہلی بار پڑھ رہے ہیں، تمام تحریریں، ان کے الفاظ و انداز، منظر نگاری، کردار سازی اور زبردست کہانیاں، سچ میں ردا کی ادا دل کو بہت بھائی۔ تمام سلسلے وار ناول اچھے اور دلچسپ لگے کہ اب تو اگلی اقساط کا شدت و بے چینی سے انتظار شروع کر دیا ہے۔ برائے مہربانی ایک عرض سمجھ لیجیے یا مخلصانہ مشورہ کہ سلسلے وار ناولز کا خلاصہ بھی تحریر کیا کریں، تاکہ نئے پڑھنے والوں کو کہانی سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے، اور وہ کہانی سے مکمل طریقے سے لطف اندوز ہو سکیں، امید ہے غور کیا جائے گا، اس کے علاوہ تمام سلسلے مثلاً خوشبو، سندیلے، اس ماہ میں، ردا کی ڈائری، ذرا پھر سے کہنا اور اشعار الغرض سب ہی کچھ بہت عمدہ اور اچھا ہے۔ ہمیں ایک لگہ ہے کہ ہمارے شہر ”جہلم“ میں ردا ڈائجسٹ نہیں آتا، کیا جہلم والوں کو حق نہیں کہ وہ بھی ردا سے فیض یاب ہوں، ہمارے ساتھ یہ زیادتی کیوں آخر؟ ہر ایک شاپ، ہر جگہ سے پتہ کیا حتیٰ کہ پرانے رسالوں میں بھی ڈھونڈا مگر ”ردا“ نادر۔ بک شاپ سے یہ جواب ملا کہ لاہور سے ملے گا ”ردا ڈائجسٹ“۔ دس ازناٹ فیئر جی! ہمیں بھی لکھنے کا بے پناہ شوق ہے، پچھلے کئی سالوں سے اس شغف میں صفحے کالے کر دیئے اور ان کو الماریوں میں سنبھال سنبھال کر رکھ رہے ہیں (امی کی نظر سے بچا کے، ورنہ ہماری تو....) کیا ہماری تحریر ردا ڈائجسٹ میں شامل اشاعت ہو سکتی ہے؟ اگر ہو تو کتنے

عرصے تک شائع ہوگی، نیز کسی بھی سلسلے میں شمولیت کے لیے مواد بھیجئے کی آخری تاریخ کیا ہے؟ جواب ضرور دیجیے گا، ہم منتظر ہیں پلیز۔ امید ہے ہماری آبد کو قبول کر کے ہمیں ”سندیلے“ میں شمولیت کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ سندیلے میں ہمارا پہلا سندیلے قبول کیجیے اور ہمیں اجازت دیجیے۔ اگر اللہ نے چاہا، وقت و حالات نے موقع دیا اور قلم نے ساتھ دیا تو انشاء اللہ ردا ڈائجسٹ کے سندیلیوں میں دوبارہ سندیلے ضرور ملائیں گے، اب اجازت چاہتے ہیں اللہ حافظ!

جواب:- سویت مصباح، امینہ! آپ کو سندیلے میں خوش آمدید کہتے ہیں اور آپ کی شکایت نوٹ کر لی ہے ردا نہ ملنے کی، مگر ردا جہلم شہر میں جاتا ہے آپ کو کیوں نہیں مل رہا یہ بات باعث حیرانی ہے اور آپ کی تحریر ہمیں مل گئی ہے، انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہوگی اور ردا کے دیگر سلسلوں میں شامل ہونے کی آخری تاریخ ہر ماہ کی 10 تاریخ ہوتی ہے امید ہے آپ آئندہ بھی ردا کی محفل میں شامل ہوتی رہیں گی۔

افشاں علی..... حیدر آباد

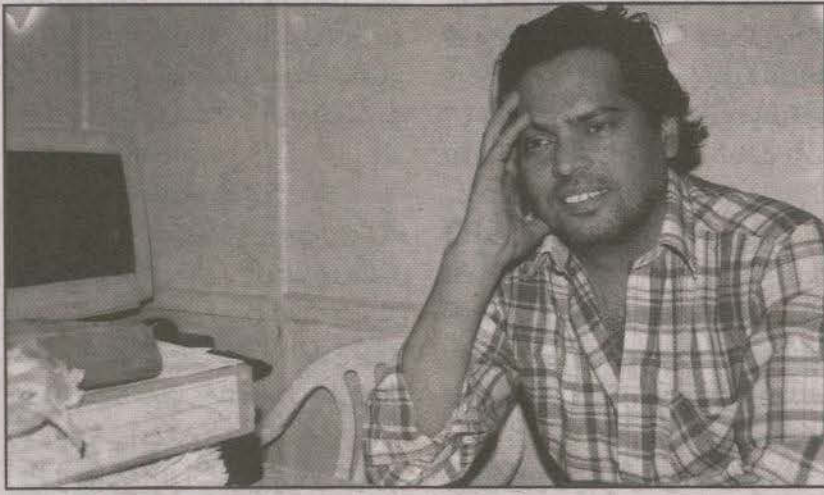
پیاری سی صالحہ آپی، کیوٹی سی نورین اپنا اور ردا کی سب ہی قارئین اور راسٹرز بہنوں کو حیدر آباد کی ٹھنڈی میٹھی ہواؤں کے سنگ سفر کرتا افشاں علی کا پیارا سا سلام قبول ہو، کراچی کی حد سے باہر نکلتے ہی جہاں حیدر آباد کی ٹھنڈی اور پرسکون ہواؤں اور چڑیوں کی کھنکھ نے دل کو لہرایا، وہیں مارچ کے تازہ اور مہکتے ہوئے شمارے کا ہم نے استقبال کیا۔ سب سے پہلے تو آپ سے ڈھیروں معذرت میں، چاہ کر بھی پچھ نہ لکھ نہ پائی جیسا کہ آپ کو پتہ ہے پہلی انڈیا گئی ہوئی ہے، تو میں گھریلو ذمہ داریوں میں کچھ دنوں ایسی ابھی کہ چاہ کے بھی لکھنے کے لئے کچھ سمیٹ

نہ پائی، اس کے لئے معذرت، انشاء اللہ جلد ہی اچھی سی تحریر کے سنگ حاضری دوں گی۔ سوچ میں کم صم سی ماڈل کا انداز اچھا لگا۔ گوشہ آگاہی میں صالحہ آپی کے قلم سے کراچی کے حالات یہ لکھ گئے الفاظوں نے بھنجوڑ دیا۔ روئے جنت ہمیشہ کی طرح دینی معلومات سے لبریز تھا۔ اب آئی ہوں اس شمارے کے سلسلوں اور خوبصورت تحریروں کی طرف، نالندہ طارق نے صحیح کہا، محبت بہت خوبصورت ہے، محبت کا خوبصورت سا احساس جب رگوں میں سرایت کرتا ہے، تو دھڑکن دھڑکن جاہت کے گیت گاتی ہے، پرچوں کے سب کھیل نصیبوں کے ہوتے ہیں۔ مجھ سے مانگوں بھی کو اور پھر جب بند قبا کھلنے لگی، تو جاناں اس کے پیار کی خوشبو چار سو مہکتی لگی۔ اور جو عشق میں بیتی وہ عشق ہی جانے یہی بہترین مصنف ہے۔ اور وہ جو رگ جان سے قریب تھے بلا خروہ قریب سے قریب تر آگئے۔ ہمیشہ کی طرح دلکش اور دلوں کو چھوٹا صالحہ آپی کا ایک خوبصورت ناول اختتام پذیر ہو گیا، اتنے اچھے ناول کا اختتام دل پر افسردگی کے بادل چھا گئے، جسے اس امید نے دور کر دیا کہ بہت جلد صالحہ آپ کی نیوکاوش ضرور سامنے آئے گی، اور ساتھ ہی یہ ناول کتابی شکل میں بھی (بے نا آپی) ایک اور خوبصورت سی مکمل ناول کے اختتام اور اس کی اتنی پذیرائی پر صالحہ آپی کو بہت بہت مبارک۔ اس ماہ میں ردا کی ڈائری میں اشعار سب زبردست لگے، خوشبو تو بلا خرہ خوشبو ہی ہے۔ جسے نورین ملک خوبصورتی سے چاروں اور مہکتی ہیں۔ ذرا پھر سے کہنا میں ہم جہانہ آفتاب، حافظہ مون شاہ، زارا صدف قرمر، رابعہ افضال، سعدیہ — عابد، روحان — دانش، افسانہ آفتاب، سندیلے میں مدیحہ اعجاز، عانیہ نیازی

صبا، سحر، دھنک ناز، اور نور بانو اور باقی تمام خاموش قارئین، جن کو میرا ناول آتش عشق، پسند آیا آپ سب کے لئے تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ سب کی پذیرائی، اور صالحہ ایسا کیا یوں ہی بھرپور تعاون رہا تو انشاء اللہ آپ میرا نام یونہی ردا میں شامل اشاعت دیکھیں گے۔ میرا نام جو آج یوں ردا کی زینت بنتا ہے، ڈیر صالحہ آپی! یہ آپ ہی کی بدولت ہے، میں آپ کی بے حد ممنون ہوں، صالحہ آپی نے جو امید کا ننھا سا جگنو ردا تھمایا، اس کی روشنی دور دور تک پھیلنے لگی ہے۔ چراغ بہت کم جگہ گھیرتا ہے، لیکن اس کی روشنی وسیع رقبے کو منور کرتی ہے۔ یہی حال ردا کے اس ننھے سے چراغ کا ہے، جواب آفتاب کی مانند روشن ہو کر سب کی زندگی میں سویرا بکھیر رہا ہے، مثال اگرچہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو اگر قابل تقلید ہو تو پھر خاص بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح ردا آج کل مقبول و خاص ہے۔ میری دعا ہے ردا یونہی ترقی کرے اور اسی کے ساتھ ہم بھی منزل در منزل آگے بڑھیں، بہت ساری دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ اب آپ کی ڈیر افشاں علی کو اجازت خدا حافظ۔

روشنی فیصل..... کراچی

ڈیر صالحہ آپی آپ کو اور ردا کے تمام اشاف کو روشنی کا ڈھیروں ڈھیروں ڈھیروں السلام علیکم بہت عرصے کے بعد سندیلے میں شامل ہو رہی ہوں۔ زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے ردا میں شمولیت ہو سکے یا نہیں ردا تو ہمارے دلوں میں بستا ہے۔ اب اس سے جدا ہونا نہ ممکن ہے۔ ردا میں نئے راسٹر کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی تعداد واقعی قابل تعریف ہے ردا کی ہمیشہ سے یہ ہی انفرادیت رہی ہے کہ روئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ زندگی کتنی مصروف سہی صالحہ آپی آپ کی یاد ہمیشہ دل



انٹرویو: روحان دانش

ڈرامہ نگار، کہانی کار، ابن آس کی باتیں

ہو کے رہ گئے ہیں حال ہی میں ان کا تحریر کردہ ڈرامہ کلموئی، نجی ٹی وی چینل سے آن ایئر ہوا جس نے بے پناہ مقبولیت سمیٹی، متعدد چینلوں سے ان کے ڈرامے آن ایئر ہیں اور ہوتے رہے ہیں۔ جبکہ ان کی کہانیوں کے بھی متعدد انتخاب شائع ہو چکے ہیں جبکہ حال ہی میں ایک اور کتاب، ابن آس کی کہانیاں، کے نام سے شائع ہوئی ہے جسے عوام کی بے پناہ پذیرائی ملی ہے۔

کہانی لکھنا اور اصلاحیت ہے اپنی اس صلاحیت کا ادراک کب ہوا؟

بہت کم عمری میں اپنے گاؤں میں تاجا جان کی دکان پر ایک کم کتاب ”داستان ایمان فردوشوں“ کی پڑھی، بس یہیں سے کہانیاں پڑھنے کا چمکا لگا اور اس کے بعد

کہانی کار کہانی تخلیق کرتے ہیں یہ کہانی کبھی لفظوں کی شکل میں کبھی کرداروں کی صورت قلم نی وی پر آپ کے سامنے آتی ہے کبھی آپ کے ذہن کی ساری کھڑکیاں کھول دیتی ہے کبھی سوچ کے سارے در بند کر دیتی ہے کبھی گھپ اندھیروں میں لے جاتی ہے کبھی کوئی روشن راستہ دکھائی ہے کہانی بھی بڑی عجیب شے ہوتی ہے اور کہانی تخلیق کرنے والے کیسے ہوتے ہیں اکثر یہ جاننے کی کوشش رہی ہے۔

ابن آس بھی ایک کہانی کار اور ڈرامہ نگار ہیں لاتعداد تحریروں لکھ چکے ہیں ان میں بچوں کے لیے کہانیاں، تراجم، اور ڈرامے شامل ہیں کئی سالوں تک صحافت میں بھی رہے آج کل صرف ٹیلی ویژن کے

واپس نہیں آتا، بس احساس و محبت کا ایک رنگ چھوڑ جاتا ہے، بہت سے خوشگوار لمحے ہم پیچھے چھوڑ آئے اور ہمیں وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلا۔ آئی! کچھ دنوں پہلے ایک راگ نمبر ایک خاتون کے خوبصورت آواز لب و لہجے اور شائستہ انداز نظم نے جو کہ ہو ہو آپ جیسا ہی تھا، آپ کی یاد تازہ کر دی اور ماضی کے ڈھیروں خوبصورت باب وا ہو گئے، کچی کلیاں آنگن کی، تم میرے ہو کے رہنا، بالا کوٹ سے کشمیر تک، شفو، چوڑیاں، بھاگ بھری، دبسمبر پر لکھی گئی خوبصورت نظم اور نہ جانے کتنی ہی دلکش تحریروں اور نظمیں غزلیں خاص کر وہ نظم جو آپ نے ردا کی سالگرہ کے موقع پر تاجپزی کی نظر کی وہ لکھی تھی واہ! کیا بات تھی اس کی۔ آئی! پتا نہیں کب اور کیسے ہم اتنی دور ہو گئے شاید زندگی کی مصروفیات اور پریشانیوں نے ہمیں آپ سے دور کر دیا جس کا مجھے ہمیشہ ملال رہے گا، بہر حال آج اچانک ہی آپ کی یاد شدت سے دل میں کروٹیں لینے لگی تو کاغذ قلم اٹھا کر آپ ہی کے ڈائلاگ اور دل میں اتر جانے والی باتیں آپ ہی کے لیے قلم بند کر ڈالے۔ آپ کی وہ خوبصورت نظمیں، غزلیں، ناول ہمیشہ ہمارے دل میں آپ کی یادوں کے چراغ کو روشن رکھیں گی اور ہماری محبت، دوستی و خلوص اسی طرح ہمیشہ قائم و دائم رہیں گے، آخر میں ہماری دعا ہے کہ آپ کا ہر اٹھنے والا قدم آپ کو کامیابی سے ہمکنار کرے (آمین!)

جواب:- سوئیٹ گیتی آراء! آپ کی محبتوں اور خلوص کا بے حد شکر ہے! آپ کی تحریر جلد ردا میں شامل اشاعت ہوگی اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ردا کی محفل میں مستقل شامل ہوا کریں گی، خوش رہیں اور اپنا بہت زیادہ خیال رکھیں۔

☆.....☆.....☆

میں رہتی ہے۔ ردا میری زندگی کا بیت بڑا سرمایہ ہے اس نے مجھے رائٹر کہلانے کا حق دیا ہے۔ صالحہ آئی بہت مشکور ہوں کہ آپ مجھے یاد رکھتی ہیں حالانکہ مصروفیت کے باعث میں کافی ماہ سے بذریعہ ناول، ناولٹ شامل نہیں ہو پا رہی۔ ابھی بھی میرا بیٹا مجھ سے پین اور پیپر لینا چاہ رہا ہے ردا کی تمام رائٹرز کو اور فرینڈز کو میرا سلام۔ انشاء اللہ جلدی ناول یا افسانے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ پلیز آپ کی خط کو سندیے میں ضرور شامل کیجیے گا۔ کیوں کہ یہ خط میں بہت دل سے لکھ رہی ہوں۔ نورین ملک آپ کو میرا بہت سلام مجھے آپ سے ایک ملاقات ہمیشہ یاد رہتی ہے شاید آپ کو یاد نہ ہو۔ اللہ پاک ردا کو ترقی سے ہم کنار رکھے۔ اور صالحہ آئی کو ہمیشہ مسکراتا، خوش و خرم رکھے۔ اب اجازت دیں۔

گیتی آراء..... کراچی
پیری آئی، السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ پیری آئی! سال نو کا نیا سورج ہم سب کو خوش آمدید کہہ رہا ہے، زندگی کی صبح ایک بار پھر نئی امیدیں لیے نمودار ہوئی ہے، ایک بار پھر سبز پتوں پر شیشی قطرے نمودار ہوئے اور رنگ پھولوں پھر ہنسنے لگے، زندگی پھر رواں دواں ہوگئی، نام یہ ہے ہمارے بدلے موسم کا، اس رُت کا جو آن پہنچی ہے ہم سب کو خوش آمدید کہنے۔ ڈیڑہ آئی! نیا سال مبارک ہو! اللہ آپ کو اور ردا کے تمام قارئین کو ایسی ہزاروں خوشیاں دیکھنا نصیب کرے (آمین!) آئی! آج برسوں بعد آپ کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں، کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کہاں سے، کیسے بات شروع کروں، بس وقت ایک خوبصورت لمحے کی کہانی ہے جس کا انتقام کبھی نہیں ہوتا، سمندر کی بے کراں لہروں کی طرح ماہ و سال بیت جاتے ہیں، بیتا ہوا بل بھی

کتا میں بڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا پہلی کہانی بھی اسی عمر میں ہی لکھی اس کہانی کا نام ”روزے کی خوشبو“ تھا جو کہ اسکول میگزین میں چھپی تھی تب سے اب تک یہ سلسلہ جاری ہے بچوں کے تقریباً سبھی رسائل کے لیے لکھا اور اب بھی لکھ رہا ہوں۔

اب تک کتنی کہانیاں لکھ چکے ہیں؟

تقریباً 6 ہزار سے زائد کہانیاں تو ہوں گی جو میں لکھ چکا ہوں اور میرا نہیں خیال کہ ابھی تک بچوں کے کسی ادیب نے اتنی کہانیاں تحریر کی ہوں۔ جب میں روزنامہ ”امت“ میں بچوں کے صفحے کا انچارج تھا تو ہر ہفتے 10 سے زائد کہانیاں لکھتا تھا اور یہ سلسلہ 9 سال تک چلا سوا اب آپ کہانیوں کی تعداد کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں جبکہ تراجم اس کے علاوہ ہیں جن میں ہیری پورٹز شامل ذکر ہے۔

آپ کی ذہنی و فنی تربیت میں کن لوگوں کا حصہ رہا ہے؟

زندگی سیکھنے کا نام ہے میں نے بھی بذات خود ہر شخص سے سیکھا ہے مگر میری باقاعدہ تربیت کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ میں اپنی صحافتی ملازمتوں کے دوران سیکھتا رہا ہوں، مجھے لکھنے کی طرف براہ راست راغب کرنے کا کام حنیف سحر نے سرانجام دیا انہی کے توسط سے ایک شو بزمیگزین میں ملازمت ملی جہاں فیض حبیب صاحب سے بہت کچھ سیکھا ایک سال محمود شام کے زیر تربیت بھی رہا ہوں صحافتی اور ادبی ماحول کو سیکھنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔

ڈرامے کی طرف کیسے آئے؟

بالکل حادثاتی طور پر، ایک دوست نے جو کہ ڈائریکٹر بھی تھے مجھے آفر کی میں نے ڈرامہ پڑھا تو بہت تھا مگر اسکرپٹ لکھا نہیں تھا انہوں نے مجھے اسکرپٹ دکھایا جسے دیکھ کر میں نے کوشش کی ڈرامہ لکھنے کی یوں پہلا ڈرامہ لکھا جس کا نام ”زہر“ تھا جو کہ انڈسٹری وی سے آن ایئر ہوا تھا اس کے بعد سلسلہ چل پڑا اور آج تقریباً ہر چھ ماہ میں ڈرامے آن ایئر ہو چکے ہیں۔

ڈرامہ یا کہانی کن موضوعات پر لکھتے ہیں؟

ہر طرح کے موضوع پر لکھ لیتا ہوں، میں پروفیشنل اور کمرشل رائٹر ہوں اور بنیادی طور پر کہانی کا آدمی ہوں اس لئے کوشش یہی کرتا ہوں کہ کہانی کو بنیادی فوقیت دوں، یہی وجہ ہے کہ میری کہانیاں اور ڈرامے ہر طرح کے موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔

ڈرامہ اپنی مرضی سے تحریر کرتے ہیں یا پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی ڈیمانڈ پر؟

دونوں باتیں ہوتی ہیں لکھتے تو اپنی مرضی سے ہی ہیں مگر ڈائریکٹر کی سوچ اور صلاحیت کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے سینئر اور جین کی پالیسی کو بھی دیکھنا ہوتا ہے ڈرامہ دراصل ٹیکنیکل پلس کریٹیو ورک ہے اس لئے کافی چیزیں دیکھنی پڑتی ہیں یہ محض تخلیقی کام نہیں ہے۔

کیا ڈرامہ آپ کی توقعات کے مطابق ہی بنتا ہے؟

کئی دفعہ مختلف ہوتا ہے ڈائریکٹر پر ہوتا ہے کہ وہ جس سچ پر آکر ڈرامے کو مجھے کا ڈرامہ ویسا ہی بنے گا پھر وسائل کا بھی اہم کردار ہے زیادہ وسائل ہوں گے تو ڈرامہ مزید بہتر ہو سکتا ہے کم وسائل اور کم بجٹ میں ڈرامے کا معیار بھی متاثر ہوتا ہے۔

حال ہی میں آپ کا تحریر کردہ ڈرامہ ”کلو نمی“ آن ایئر کیا، جو کہ ایک مظلوم عورت کی کہانی تھی، ایک مرد ہو کر ایک عورت کی کہانی کیسے لکھ لیتے ہیں؟

میرے خیال میں کہانی ہوتی ہی عورت کی ہے، کوئی بھی کہانی عورت کے بغیر مکمل ہوتی ہی نہیں ہے، پھر ایک کہانی کا ان چیزوں سے باور ہوتا ہے اسے کئی دفعہ دوسروں میں ڈھل کے کہانی تخلیق کرنی ہوتی ہے یہ ضروری نہیں کہ ایک عورت ہی عورت کہ بارے میں اچھا لکھ سکتی ہے، ہماری ادبی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب مختلف طبقات اور مختلف موضوعات پر لکھا گیا، حتیٰ کہ ایک جانور کے احساسات کی بھی لفظوں میں ترجمانی کی گئی۔ تاہم میرا ماننا ہے کہ ہر کہانی معاشرے سے جنم لیتی ہے وہ کسی نہ کسی طور عورت سے جڑی ہوتی

ہے سو عورت کے بغیر کہانی مکمل نہیں ہو سکتی

کن ڈرامہ ڈائریکٹرز کے ساتھ اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے؟

انڈر اسٹینڈنگ تو سب سے ہی اچھی ہے جن کے لیے کام کیا اور جن کے ساتھ ابھی کام کر رہا ہوں عاطف حسین، اسد ملک اور شاہد شفاعت سے اچھی دوستی ہے بلکہ شاہد شفاعت نے جو پہلا ڈرامہ ڈائریکٹ کیا تھا وہ میرا ہی لکھا ہوا تھا۔

آپ کے پسندیدہ ادیب کون سے ہیں؟

مجھے منسوب سے زیادہ پسند ہے تصوف کے حوالے سے اشفاق حسین کی تحریریں پسند ہیں کرشن چندر میری رائے میں عظیم افسانہ نگار ہیں شعراء میں ساحر لدھیانوی اور احمد فراز کی شاعری اچھی لگتی ہے اور ڈرامہ کی طرف آئیں تو نور الہدیٰ شاہ بڑی رائٹر ہیں میں آج تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ باوجود یہ زیادہ بڑی رائٹر ہیں یا نور الہدیٰ شاہ۔

ڈرامہ لکھتے لکھتے کبھی خود بھی اداکاری کا خیال آیا؟

ڈرامہ نگاری سے بہت پہلے ہی اداکاری کرتا رہا ہوں ان دنوں دوستوں کے ساتھ مل کر ایک تھیٹر گروپ بنایا تھا جس کے تحت کئی جگہوں پر تھیٹر ڈرامے کئے اب بھی ڈراموں میں مختلف کردار کرتا رہتا ہوں اس لئے کہ اگر ایک رائٹر بھی کھارایٹنگ کرے تو لکھنے کے معاملے میں بہت سی ٹیکنیکل باتوں کو سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

آج کے اور 20 سال پہلے کے ڈرامے میں کیا فرق دیکھتے ہیں؟

پوری دنیا راگ الاپ رہی ہے کہ ڈرامہ اب وہ نہیں رہا یا پہلے جیسا ڈرامہ نہیں بن رہا، وغیرہ وغیرہ جبکہ میری ذاتی رائے ہے کہ اصل ڈرامہ تو بن ہی اب رہا ہے آج کا ڈرامہ پہلے کے ڈرامے سے ہزار ر ہا رہے بہتر ہے موضوع، کہانی، اداکاری ہر لحاظ سے جبکہ ٹیکنیکل معاملوں میں بھی ڈرامہ خاصا بہتر ہوا ہے۔

کبھی فلم لکھنے کا سوچا؟

فلم ہی لکھنا چاہتا ہوں، فلم لکھنا اہم کام ہے، مگر ہمارے یہاں اس کام کو اہم نہیں سمجھا گیا۔

ہماری فلم انڈسٹری کی زبوں حالی کی آپ کے نزدیک کیا وجہ ہے؟

بہت ساری باتیں ہیں فلم ٹیکنیکل کام ہے اس کی کامیابی میں اب کہانی سے زیادہ ٹیکنیکل چیزوں کا زیادہ حصہ ہونے لگا ہے۔ مگر یہ بہت زیادہ ضروری نہیں ہے، اچھی فلم سادہ انداز میں اور کم وسائل میں بھی بن سکتی ہے۔

فیوچر پلان کیا ہیں آپ کے؟

اپنی لکھی ہوئی بچوں کی کہانیاں اکٹھی کر کے کتابی صورت میں شائع کرنی ہیں پھر بچوں کے لیے ایک منفرد رسالہ نکالنے کا سوچا ہے کیونکہ کتابیں پڑھنے سے ہی سوچ میں تبدیلی آتی ہے سوچ بدلے کی تو ہی معاشرہ بھی بدلے گا معاشرہ کی تبدیلی کے لیے لازم ہے کہ کتاب پچھ عام کیا جائے اور کتاب پڑھنے کا شوق تو بچپن سے ہی آتا ہے اسی لئے بچوں کے لیے رسالہ نکالنا پہلی ترجیح ہے پھر اپنا پبلشنگ ہاؤس کھولنا ہے۔

آپ پبلشنگ ہاؤس کا سوچ رہے ہیں جبکہ کہا جاتا ہے کہ ہم کتاب سے دور ہو چکے ہیں؟

کتاب پچھ لانے کی اشد ضرورت ہے اور اس کے لیے ہم ادیبوں نے ہی کچھ کرنا ہے رہی بات کہ کتاب کوئی نہیں پڑھتا، کتاب کتنی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ تو یہ سب محض باتیں ہیں آج کتنے پبلشرز ہیں جو کتاب چھاپتے چھاپتے کڑو پتی بن چکے ہیں اگر کتاب کتنی نہیں ہے تو پچھ کر کیسے ہوا جبکہ آج کا لکھنے والا کچھ لکھاری خود سرمایہ لگا کر کتاب چھپواتا ہے مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا جبکہ یہی پبلشرز اس کتاب کے دس دس ایڈیشن چھاپ کر امیر ہو جاتے ہیں۔ کتاب بھی نہیں سکتی، اسی سوچ کو آگے بڑھانا ہے اسی لئے پبلشنگ ہاؤس کھولنے کا سوچا ہے۔

رَوْدِ اَکْی شَہزادِ عَیْبِی

حافظہ مون شاہ بخاری.. سرگودھا
 صالحہ آپ مصنفین اور قارئین کرام السلام علیکم
 ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں کس طرح تجھے لفظوں کا پیر بن بخشوں
 میرے ہنر کی بلندی تو سرگوں ہے ابھی
 گو کہ صالحہ آپ کے حکم نامے پر اپنی شخصیت کو
 آپ کے رو برد لانے کا بیڑا اٹھا لیا ہے مگر میں
 حقیقتاً خود کو کسی قابل نہیں سمجھتی ہوں میری ذات میں
 کوئی ایسا ہنر نہیں جو آپ کی توجہ کا مرکز ٹھہرے اور نہ
 کوئی ایسا جو ہرے جس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر
 دے۔ مجھے لفظوں کی جادوگری نہیں آتی۔ انداز بیان
 کو دلچسپ بنانا نہیں آتا۔ بس کچھ پرت ہیں جن کو
 بڑی سچائی اور سادگی کے ساتھ کھولنا ہے۔ انسان کی
 پہچان کرنے میں اس کا نام گہرا عمل و دخل رکھتا ہے، سو
 میرا نام ”مون شاہ“ ہے۔ میرا تعلق سرگودھا کے سید
 گھرانے سے ہے۔ میں نے 18 اگست 1991 کو
 اس جہان ناپائید میں قدم رنجہ فرمایا۔ بس بے حد
 عام، سادہ، اور صاف گولڑی ہوں۔ مجھے اپنے وطن
 پاکستان، شہر اور گھر والوں سے بے حد پیار ہے۔
 میرے عزیز و اقارب میری کل متاع ہیں۔ ہم چھ
 بہن بھائی ہیں میرا نمبر آخری ہے۔ والدین اور بھائی
 قاری سید شجاعت کی میرے نزدیک بے حد اہمیت
 ہے 2011 میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی اور
 اب درس نظامی کا کورس کر رہی ہوں۔ لہذا تعلیمی سفر
 ابھی جاری ہے۔ غزوہ تکبر، ریا کاری، چٹل خوری،
 منافقت اور حسد سے نفرت ہے۔ مذہبی، منکسر مزاج
 اور تعلیم یافتہ لوگوں سے مل کر خوش ہوتی ہے۔ رنگ اور

کھانے سب ہی پسند ہیں۔ کہانیاں لکھنا اور کتابیں
 پڑھنا میرا شوق ہے۔ البتہ، سفیران حرم اور اراقی عم
 پسندیدہ کتابوں میں شامل ہیں۔ سید محمد عرفان شاہ
 مشہدی، محمد قمر ظہور ترائی، محمد اشرف سیالوی، اور محمد دم
 جعفر قریشی پسندیدہ علماء ہیں۔ محمد شہباز قمر فریدی
 پسندیدہ نعت خواں ہیں۔ جیولری اور میک اپ وغیرہ
 سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ دوستی نے میرے مزاج
 سے میل نہیں کھایا۔ حلقہ احباب بے حد محدود ہے تاہم
 شانکہ و حاجت میری بھابھی کو ابھی تک واحد خرمی
 دوست ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت محمد ﷺ
 حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ
 تعالیٰ عنہا، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
 میری پسندیدہ شخصیات ہیں۔ محبت پر یقین ہے کیوں
 کہ کائنات کی بناء محبت ہے۔ مجھے اپنے نبی کریم ﷺ
 اور ان کی آل و اصحاب سے محبت ہے۔ خلفائے
 راشدین سے محبت ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اقرباء
 سے محبت ہے۔ صحابہ کرام کے کردار سے محبت
 ہے۔ اپنے خاندان کے ہر فرد سے محبت ہے۔ محمد علی
 جناح سے محبت ہے۔ اسلام سے محبت ہے۔ پاکستان
 سے محبت ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں مسلمان ہوں اور
 پاکستانی ہوں۔ شاپنوں کے شہر سرگودھا میں رہتی
 ہوں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش زیارت
 روضہ رسول ﷺ ہے۔ اس کے بعد اپنے خاندان کے
 ہر فرد کو آپس میں یکجا و پیوستہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ گنہگار
 ہوں۔ نیک بننا چاہتی ہوں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے
 خاندان اور وطن کا فخر بننا چاہتی ہوں۔ خامیاں بے
 شمار ہیں جن کے بوجھ تلے دب کر خوبیاں دب جاتی

ہیں۔ محبت وطن اور محبت اسلام ہوں یہی میری پہچان
 ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول پر اختتام
 کرتی ہوں کہ خدا کے نزدیک بندے کی وہ غلطی جو
 اسے تکلیف دے اچھی ہے اس خوبی سے جو اسے
 مغرور بنادے۔ اپنا اور اپنے سے وابستہ رشتوں کا بے
 حد خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔

رابعہ افضل خان..... کراچی
 السلام علیکم اردو کی پیاری پیاری شہزادیوں کی
 اس خوبصورت اور پر رونق محفل میں ایک اور شہزادی
 شرف ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لئے بے
 قرارو بے تاب ہے تاہم ہمارا رابعہ افضل خان ہے
 مگر سب پیار سے گزرا کہتے ہیں۔ دبیر کی بی بی
 ٹھنڈی سی رات کو اس دنیا میں تشریف لائی ہوں۔
 کراچی جیسے خوبصورت شہر کی شہری ہوں ہم تین
 بہنیں اور ایک بھائی ہے میں پہلے نمبر پر ہوں
 مابعد دولت نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی ہے، اس
 کے علاوہ شارٹ کورسز میں کمپیوٹر کورس، انگلش
 لیکنج کورس، بیوٹیشن کورس کیا۔ قدرتی مناظر ہمیشہ
 اٹریکٹ کرتے ہیں۔ شام کے اوقات ساحل سمندر
 کے کنارے ڈوبتے سورج کو دیکھنا دنیا جہاں سے
 غافل کرنے کا سبب بن جاتا ہے دبیر کی ٹھنڈی
 ٹھنڈی بارشوں میں لمبی سڑک پہ بھٹکتے ہوئے واک
 کرنا اور آنس کریم کھانا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ الگ
 بات ہے کہ بعد میں ڈھیروں صلواتیں سننا بھی پڑتی
 ہیں۔ میوزک میں غزلیں اور سیڈ سونگ پسند
 ہے۔ پھولوں سے مجھے عشق ہے دل چاہتا ہے دنیا میں
 جتنے بھی پھول ہیں سارے میرے گھر میں موجود ہوں
 پونٹری سے دلی لگاؤ ہے اور میرے فیورٹ شعراء کی
 لسٹ میں پروین شاکر، دوس شاہ، اور فیض احمد فیض کا
 نام شامل ہے مطالعہ کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور ہر
 اچھی بک کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتی ہوں۔ رنگوں
 میں مجھے پنک، وائنٹ ریڈ لکھر پسند ہیں۔ لباس میں

سازھی، لاگ شرت کے ساتھ ٹراؤز اور بڑا سادو پہنہ
 اچھا لگتا ہے۔ کیوں کہ دوپٹہ عورت کی عزت کے
 ساتھ ساتھ اس کے لباس کی زینت بھی ہے۔ فیورٹ
 نائٹز کی لسٹ میں تم میرے ہو کے رہو، دل
 دیادلیز محبت دل کے صحرا میں شامل ہے۔ کوکنگ کا
 بہت شوق ہے اور تقریباً سب ہی کھانے پکا لیتی
 ہوں۔ وہ بھی بہت مزے دار، دبیر کی خاموش اور
 ٹھنڈی راتوں میں چاند کو دیکھنا بہت اچھا لگتا
 ہے۔ دبیر کی راتیں بے شک اداس ہوتی ہیں مگر بہت
 پرکشش اور فسون خیز بھی۔ تدریس کے شعبے سے
 وابستہ ہوں کیوں کہ مجھے بچوں میں تعلیم پانٹنا اور انہیں
 آگے بڑھتے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ بچپن سے ایک
 خواہش تھی کہ میں بھی رائٹر بنوں تو اب بطور رائٹر
 کبھی کبھی کچھ نہ کچھ رواں میں لکھ لیتی ہوں۔ تھوڑی سی
 زیادہ سینٹو (حساس) ہوں کسی کی آنکھوں میں
 آنسو برداشت نہیں ہوتے اور ہر لمحہ کوشش کرتی
 ہوں مگر کبھی کبھی ڈنڈی مار جاتی ہوں۔ مگر دعا کرتی
 ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نماز کا بہت پابند بنا دے
 آمین۔ بہت زیادہ مذہبی نہیں ہوں مگر کوشش کرتی
 ہوں کہ زیادہ سے زیادہ خود کو شریعت کے مطابق
 بننے سانچے میں ڈھال سکوں۔ تھوڑی سی جذباتی
 تھوڑی غصے کی تیز مگر پر خلوص غفلت اور سب سے
 محبت کرنے والی لڑکی ہوں۔ ارے ایک بات بتانا
 تو بھول گئی کھانے کی بے حد شوقین ہوں فاسٹ فوڈ
 بہت شوق سے کھاتی ہوں جبکہ بریانی، گاجر کا
 حلوہ، اور ہری مرچوں کا قیمہ میری فیورٹ ڈشز
 میں شامل ہیں۔ کہنے کو تو بہت کچھ باقی ہے مگر پھر
 سہی فی الحال آپ کی اس پر رونق محفل سے پہلے اتنا
 ضرور کہنا چاہتی ہوں ہم سے مل کر آپ کو کیسا لگا
 ضرور بتائے گا ہمیں انتظار رہے گا، خدا حافظ!

☆.....☆.....☆



نجانے اس کی کیا کیا شرارتیں ہوں گی
ادا سے وہ جو بھر لگیں گی اپنی بانہوں میں
کہ اس انداز میں کتنی مہارتیں ہوں گی
اس کے لمس کی تاثیر سنی ہے میں نے
اس کے چھوئے ہی بدن میں حرارتیں ہوں گی
ہوا جو اس کی زلفوں میں گرفتار بھی
تمام عمر نہ میری ضمانتیں ہوں گی
نئے لباس کو پہنوں عطر لگا رکھوں
اس کی بزم میں ہر سو طہارتیں ہوں گی
کئی سلیم لڑے ہیں اسے پانے کے لیے
کیا سلطنت میں پھر سے بغاوتیں ہوں گی
کمال ضبط ہے جس میں ہے حوصلے کا بلند
اسی بے خاص قسم کی عنایتیں ہوں گی
بہت مقصوم سا کمزور سا عقیق ہوا تیرا
میرے لیے حسن کچھ تو رعایتیں ہوں گی
محفوظ احسن

☆.....☆.....☆

صالحہ آبی کے نام

مائی ڈیئر اینڈ سوئیٹ ایسا! آپ کے ناول ”وہ جو
رگ جاں سے قریب تھے“ کی لاسٹ قسط پڑھی اور
آپ یقین جانیئے آپ کے لفظوں کی جادوگری کا سحر
ابھی تک مجھ پر طاری ہے اتنا خوبصورت اور منفرد اینڈ
شاید ہی کسی رائٹر نے آج تک کیا ہو، آپ نے تمام
کرداروں کے ساتھ بھرپور انصاف کیا اور روی کو اس
کے صبر کا پھل اشل کے خوبصورت ساتھ کی صورت
خدا نے عطا کر کے اس کی تمام عمر کی تشنگی مٹا دی۔ آپنی!
اتنا کامیاب اور خوبصورت ناول لکھنے پر آپ کو بہت
بہت مبارک باد! اب آپنی! جلدی سے آپ اپنا نیا
سلسلہ وار ناول شروع کر دیں کہ سلسلے وار میں آپ کی
کی مجھے بے حد محسوس ہوتی ہے۔

عانیہ نیازی..... ربوہ

انہوں کے نام

السلام علیکم! فرسٹ آف آل ہماری پیاری آپنی کو
ان کا جنم دن بہت بہت مبارک ہو! اللہ آپ کو خوشیاں
اور کامرانیوں عطا فرمائے (آمین)۔ 19 اپریل کو
زبردست ٹریٹ تیار رکھنا، اوکے ناں! اس کے بعد سونیا
صدیق جو کہ میری کزن ہوتی ہیں ان کو 20 اپریل کے
دن جنم دن مبارک ہو۔ محترمہ! بہت بہت مبارک ہو
تمہیں بھی۔ پریشان نہ ہو۔ اور منہ نہ بسور، تمہارا گفت
لے چکی ہوں، اور تم تک وہ پہنچ بھی جائے گا۔

امبرین حیدر..... اسلام آباد

ردا فرینڈز کے نام

دوستوں کے نام پیغام سلسلہ میرا فیورٹ سلسلہ
ہے، اور اس میں شامل پیغامات میں نہایت شوق سے
پڑھتی ہوں، آج میں اس کالم کے ذریعے ردا میں
شامل تمام رائٹرز و قارئین کو دوستی کی آفر کر رہی ہوں،
آپ سب لوگ مجھے بے حد پسند ہیں خواہ وہ ردا کے
سلسلے وار ناولز کی مصنفین ہوں یا پھر ردا کے مستقل
سلسلوں میں شامل قاری سسٹمز۔ مجھے آپ سب سے
دوستی کرنی ہے، امید ہے آپ لوگ میری اس دوستی کی
آفر کو ضرور قبول کریں گی۔

صباحہ..... ہارون آباد

چھوٹی بہن عیمہ کے نام

مائی لولی اینڈ سوئیٹ ہارٹ عیمہ! تمہارے دو
اپریل سے سپر ز اشٹارٹ ہیں میٹرک کے، مجھے یقین
ہے جیسے تم نے اب تک اپنا تعلیمی سلسلہ برقرار رکھا ہے
اور تعلیمی میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور
ہمارا اور ہماری فیملی کا سرفخر سے بلند کر دیا مجھے یقین
ہے میٹرک کے بورڈ میں بھی شاندار کامیابی حاصل
کر کے تم یہ سلسلہ جاری رکھو گی، اللہ تعالیٰ تمہاری تمام
جائز خواہشات پوری کرے اور بہت سی کامیابیوں
سے نوازے (آمین)۔

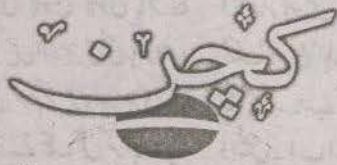
السلام علیکم! ردا ڈاؤ انجسٹ اور FM-100 کے
دوستو! آپ سب کا بہت شکریہ جو آپ نے میری
حوصلہ افزائی کی اور خاص کر ردا کا بہت شکریہ جنہوں
نے مجھے پورا ایک صفحہ عنایت کیا، آپ سب کی محبت
میں، میں اپنے 2 تازہ کلام آپ کی نظر کر رہا ہوں،
آپ کی رائے کی ہمیشہ ہی ضرورت ہے۔

بیٹیاں (نظم)

روح کا چین دل کا ارمان بیٹیاں
ماں باپ کی تسکین کا سامان بیٹیاں
قائم ہے بیٹیوں سے گھر کی رونقیں
ہر شخص پہ اللہ کا احسان بیٹیاں
سر سے با ائثار کا منہ بولتا ثبوت
ماں باپ کی عزت پہ قربان بیٹیاں
پھولوں کی طرح رکھو اور پیار سے دیکھو
نجانے کتنے دن کی مہمان بیٹیاں
بے لوث اور بے غرض کرنی ہیں خدمتیں
خود غرضی کی باتوں سے انجان بیٹیاں
رہتی ہیں فکر مند سسرال میں بھی وہ
ماں باپ کی تکلیف میں پریشان بیٹیاں
کفالت کرے بیٹیوں کی چستی ہے وہ
مومن کا مکمل کریں ایمان بیٹیاں
شہید کر بلا ہیں بنے فاطمہ کے لال
دنیا میں بنی نسلوں کی پہچان بیٹیاں
اس گھر پہ برستی ہیں اللہ کی رحمتیں
جس گھر میں حسن رہتی مہمان بیٹیاں

غزل

حدوں سے پار جو بے حد محبتیں ہوں گی



جیسے روزانہ ہوتی ہیں، خوش باش اور خوب صورت۔
مس! میں نے اور میری تمام فرینڈز مدیر، نمرہ، شمرہ
حسین، انعم، کنول، سونی یعنی کہ (سائلنگ گروپ آف
شبلی کالج) نے سوچا اس دفعہ آپ کو منفرد طریقے سے
آپ کی سالگرہ آپ کو دوش کی جائے، کیسے! کیسا لگا
آپ کو ہمارا یہ منفرد اسٹائل؟ So Happy
Birth Day my sweet Teacher!
ارے حافظ تم کیوں منہ بنانے لگی ہو، یارا مجھے
یاد ہے تمہیں بھی تمہاری سالگرہ بہت مبارک ہو۔ اللہ
تمہیں ایسی ہزاروں سالگرہیں دیکھنا نصیب کرے
اور تم ہمیشہ خوش رہو آمین!
سارہ شاہین.....تلونڈی

دشمنہ مدر.....کراچی

ردا کے نام

ردا کا لفظ زبان پر آتے ہی ایک تحفظ اور مان بھرا
احساس دل و جان میں اتر جاتا ہے رداسے جڑے
مجھے دو سال ہوئے ہیں مگر یہ ساتھ مجھے دو صدیوں
سے زیادہ کا لگتا ہے میری تہائی کو ردا کے ساتھ نے
مہکا دیا ہے اس میں شامل خوبصورت سلسلے مجھے
خوابوں اور خیالوں کی حسین وادی میں لے جاتے ہیں
جہاں میں ہوتی ہوں اور ناؤز میں شامل کردار۔ میری
دعا ہے کہ ردایوں ہی ہم سب کے دلوں کو منور کرتا
رہے اور اپنی روشنی بکھیرتا رہے۔

بشری علی.....پیچہ وطنی

نانکھ طارق اور شازیہ مصطفیٰ کے نام

ویسے تو رداس میں شامل ہر دانشور ہی بہترین اور
خوبصورت لکھتی ہیں مگر شازیہ مصطفیٰ اور نانکھ طارق کا
اپنا ایک مخصوص اور منفرد انداز ہے جو دلوں کو جکڑ کر سحر
طاری کر دیتا ہے اور ہر باری قسط کے اختتام پر بڑی
بے چینی سے اگلی قسط کا انتظار شروع ہو جاتا ہے اللہ
کرے زور قلم اور زیادہ اور اتنا خوبصورت آپ
ہمارے لیے لکھتی رہیں۔ ہمیشہ بہت سی دعائیں اور
پیار آپ کے لیے، خدا آپ کو بہت سی خوشیاں عطا
کرے (آمین)

نور بانو.....کوئٹہ

مس آصفہ حسن اور حافظ انعم رشید کے نام
السلام علیکم! پیاری اور سونپٹ مس آصفہ حسن کیسی
ہیں آپ؟ یقیناً ٹھیک ہوں گی اور ویسے ہی ہوں گی

ہرے بھرے کباب

اجزاء:

آلو (ابلے ہوئے): 300 گرام
مٹر (ابلے ہوئے): 150 گرام
پالک (ابلے ہوئے): 150 گرام
ادرک (باریک کٹی ہوئی): 1 ٹکڑا
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا):

1/2 پیالی

چاٹ مصالحہ: 1 کھانے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ
تیل: تیل کیلئے

ترکیب: ایک پیالے میں آلو مٹر اور پالک کا
بھرتہ بنالیں۔ اس آمیزے میں باقی تمام اجزاء بھی
شامل کر دیں۔ پیالے کو ایک گھنٹے کیلئے فریج میں
رکھ دیں۔ سبزی کے آمیزے کے گول کباب بنا
لیں۔ فرائی پین میں تیل گرم کریں اور کباب دونوں
جانب سے سنہری رنگ آنے تک تھلیں۔ مزیدار
برے بھرے کباب کو املی کی چٹنی یا ٹماٹو کچپ کے
ساتھ پیش کریں۔

سبزیوں کا منچورین

اجزاء:

گاجر (چوپ کی ہوئی): 1/4 پیالی
مٹر (ابلے ہوئے): 1/4 پیالی
آلو (ابلے ہوئے): 200 گرام
لہسن (چوپ کیا ہوا): 1 چائے کا چمچ
ادرک (چوپ کیا ہوا): 1 چائے کا چمچ
ہری مرچیں (چوپ کی ہوئی): 2 عدد
کارن فلور: 1 کھانے کا چمچ
میدہ: 1 کھانے کا چمچ
پسی ہوئی لال مرچ: 1/2 چائے کا چمچ
ہری پیاز (چوپ کی ہوئی): 2 کھانے کے چمچ
نمک: 1 چائے کا چمچ
تیل: تیل کیلئے
ساس کے اجزاء:
ٹماٹو کچپ: 1/4 پیالی
ادرک (چوپ کی ہوئی): 1 چائے کا چمچ
لہسن (چوپ کیا ہوا): 2 چائے کا چمچ
چلی ساس: 1 کھانے کا چمچ
سویا ساس: 1 کھانے کا چمچ
کارن فلور (پانی میں گھلا ہوا):

1 کھانے کا چمچ
تیل: 4 کھانے کے چمچ
ترکیب: پیالے میں آلو مٹر، گاجر، ہری پیاز

لواہہ رڈ ڈائجسٹ کی طرف سے
بچوں کے لیے خوبصورت ٹائلز
جنگلی ہوئی رت میں
بیت 150 روپے
صالحہ محمود
گچی کلیاں آگن کی
بیت 500 روپے
صالحہ محمود
تم میرے ہو گے
بیت 500 روپے
صالحہ محمود
شکایت
ویل کم بک پورٹ اردو بازار کراچی

قدرے بلکے میک اپ کے حساب سے ڈارک آئی شیڈ وکرا استعمال کریں آپ کے تمام میک اپ کے ساتھ ساتھ آئی شیڈ وکرا میں بھی سرلک ہونا چاہیے اس کے لئے لائٹ لپ اسٹک بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

مسکارہ:-

جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ آپ کا مسکارہ پرانی طرز کا روایتی مسکارہ نہیں رہا آج کل کلر اور فارمولا مسکارہ بازار میں نہایت آسانی سے دستیاب ہے جنہیں آپ اپنی جلد رنگت کے اعتبار سے منتخب کر سکتی ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں یقیناً واٹر پروف مسکارہ بہتر رہے گا چونکہ گرمیوں میں پسینہ زیادہ آتا ہے سوئمنگ وغیرہ کے لئے بھی اس طرح کا واٹر پروف مسکارہ مناسب رہے گا۔

ہونٹ:-

گرمیوں میں لپ اسٹک کے لئے مناسب رنگوں میں ٹھنڈے رنگ مثلاً گلابی اور پیازی وغیرہ ہیں جس کے ساتھ ڈارک لپ لائز استعمال کرنا زیادہ بہتر ہے اگر آپ ڈارک لک چاہتی ہیں تو کلاسیک ریڈ استعمال کریں جو کبھی بھی آؤٹ آف فیشن نہیں ہوتا۔

بروزنگ پاؤڈر:-

جس نے بروزنگ پاؤڈر ایجاد کیا تھا اس نے دنیا جہاں کی لڑکیوں پر بہت بڑا احسان کیا تھا کیونکہ یہ

گرمیوں کا میک اپ چند احتیاط

گرمیاں شروع ہو چکی ہیں اور گرمیاں سال کے بارہ مہینوں میں سب سے زیادہ عرصے پر قابض ہوتی ہیں۔ گرمیوں کا موسم میک اپ کے لئے خاصہ چیلنجنگ سیزن ثابت ہوتا ہے لیکن ذرا سی توجہ سے آپ گرمیوں کی مناسبت سے بہترین میک اپ کر سکتی ہیں اس موسم میں استعمال ہونے والی کاسمیٹک گرمیوں کے میک اپ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اس کے لئے سب سے پہلے آپ کو موسم کے حساب سے اپنی جلد کا مطالعہ کرنا ہوگا کہ اس موسم میں کس طرح کا میک اپ آپ کی شخصیت میں تبدیلی لاسکتا ہے اور تیز گرمی سے کہیں میک اپ میں استعمال ہونے والی کاسمیٹکس آپ کی جلد پر منفی اثرات تو نہیں مرتب کریں گی۔

فاؤنڈیشن:-

اپنے فاؤنڈیشن کو بھی ہلکا رکھیں اور گرم ہوا اور دھوپ کے اعتبار سے فاؤنڈیشن بنائیں اس موسم میں آپ کی جلد کی ٹیون تبدیل ہو جائے گی۔ لہذا اپ اپنی پسند کی کسی بھی برانڈ کی بوتل خرید کر اس میں مکسٹنگ کے بعد اپنی جلد کے اعتبار سے میچ کر لیں اگر یہ بوتل زیادہ ہو تو اس میں کچھ پانی ڈالیں یا ماسیجر انزر ملا کر بھی اسے کچھ پتلا کیا جاسکتا ہے۔

آئی شیڈ وکرا:-

دارک کال لیں اور لہسن کو پیش لیں۔ پیاز کو گھی میں ڈال کر بھونیں۔ بادامی ہونے پر قیمہ ڈال دیں اور نمک 'مرچ' ہلدی اور سرخ وحنیا ڈال کر بھوننے جائیں۔ جب قیمہ بھن جائے تو میتھی کو پانی نچوڑ کر ڈالیں۔ اب اسے اتنا بھونیں کہ میتھی کا سبز رنگ مصالے کے ساتھ ملا ہوا نظر آئے۔ اس پر پانی کا چھینٹا دے کر مزید بھونیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر دم پر لگائیں۔ جب میتھی گل جائے تو اس کا رنگ بھی سیاہ ہو جائے گا۔ اب اس میں دودھ ملا دیں اور تیز آگ پر بھون کر دودھ خشک کر دیں۔ میتھی اور قیمہ کا عمدہ سالن تیار ہو گیا۔

بنانا ٹونی پڈنگ

اجزاء:
کیلے: 8 عدد
چینی: 250 گرام
سوکھا ہوا دودھ: 50 گرام
تازہ کریم: 1 پیالی
ترکیب: کیلے بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کریں ایک پیالے میں ڈال کر چینی ملائیں اور ایک طرف رکھ دیں۔ گرم پانی میں سوکھا ہوا دودھ ملا کر آمیزہ تیار کریں۔ دودھ کا آمیزہ کیلے کے آمیزے میں ملائیں اور اسے ساس پیمن میں ڈال کر ہلکی آگ پر گاڑھا کریں۔ آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو اسے ٹھنڈا کر کے کریم شامل کریں اور فریج میں رکھ دیں۔ مزید ار پڈنگ خوب ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

☆☆☆

ادرک ہری مرچ، لہسن، نمک اور لال مرچ ڈال کر بھرتہ بنا لیں۔ آمیزے کی چھوٹی چھوٹی بالٹر بنا لیں۔ میدہ اور کارن فلور ملائیں اور سبزی کی بالٹر اس میں لپیٹیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور سبزی کی بالٹر اس میں سنہری رنگ آنے تک تل کر جاذب کاغذ پر اتار لیں۔ ساس بنانے کے لئے تیل گرم کر کے لہسن اور ادرک ہلکا سنہری کریں اور ٹماٹو کچپ اور چلی ساس ڈال کر ایلنے تک پکائیں۔ اس میں سویا ساس اور کارن فلور شامل کر کے گاڑھا کر لیں۔ ڈش میں سبزی کی بالٹر رکھیں اوپر سے تیار ساس ڈال دیں۔ ہری پیاز سے سجا کر پیش کریں۔

قیمہ میتھی

اجزاء:
قیمہ: نصف کلو
میتھی: نصف کلو
پیاز: 250 گرام
گھی: 125 گرام
دودھ: 1 گلاس درمیانہ
لہسن: 1 گٹھا
دھنیا خشک: چائے کا نصف چمچ
سبز مرچیں: 6 عدد
نمک اور سرخ مرچ: حسب ذائقہ
ہلدی: حسب پسند
ترکیب: میتھی کی پتیاں دھو لیں سے الگ کر کے کھلے پانی میں تین چار مرتبہ دھو لیں تاکہ مٹی اور ریت کے ذرات سے صاف ہو جائیں۔ پیاز لچھے

Medora
Perfumed Talc

خوشبو کی دنیا کے 5 شگفتہ احساس



میڈورا پرفیوڈ ٹالک کی تازگی جگاتی خوشبوؤں سے ملے
آپ کو مہکتا، فریش احساس جو ہے دن بھر آپ کے ساتھ۔

MEDORA OF LONDON

دونوں موسموں سردی اور گرمی میں بہت سے طریقوں سے استعمال کیا جاسکتا ہے چاہے سال کا کوئی بھی مہینہ ہو برونک پاؤڈر رخساروں پر اس طرح لگائیں کہ وہ آپ کے چہرے کو ایک Slim Look دے سکے یا یہ ناک کو خوبصورت اور ٹیکھا انداز دینے کے کام بھی آتا ہے۔

اچھا لباس اور اسٹارٹ لک:-
اگر آپ دہلی تپتی ہیں تو یقیناً آپ لباس کے معاملے میں کسی مشکل کا شکار ہرگز نہیں ہوں گی کیونکہ نارل ہاڈی نارل ہائیٹ اور نارل وزن پر کوئی بھی ڈیزائن اور کوئی بھی اسٹائل زیب تن کیا جائے وہ نظر کو بھاتا ہے لیکن اصل مسئلہ ان خواتین کا ہے جو اوور ویت ہوتی ہیں ایسی خواتین کے لئے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ ہرگز اسکن ٹائٹ فٹنگ ڈریس نہ پہنیں اس طرح یقیناً آپ دیکھنے میں پہلے سے بہتر نظر آئیں گی۔

خوب صورت بال

خوب صورت چہرے کے ساتھ بالوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے آپ کی تھوڑی سی توجہ آپ کے بالوں کا رنگ روپ بدل سکتی ہے اس کے لئے آپ کو ذیل میں درج طریقے آزمانا ہوں گے۔
☆ لیو کا رس نکال کر اسے سر میں اچھی طرح مالش کریں کچھ دیر بعد دھو لیں چند ہفتوں تک یہ عمل دہرائی رہیں آپ کے بال چمک دار ہونا شروع ہو جائیں گے۔

☆ رات کو پانی میں تھوڑی سی املی ڈال کر بھگو کر رکھ دیں اور پھر صبح اس پانی سے بال دھو لیں یہ عمل ہفتے میں ایک دفعہ ضرور کریں املی کے پانی سے بال دھونے کے بعد سر میں ناریل کے تیل کا مساج بھی

☆ شہد اور زیتون کا تیل ہم وزن لے کر بالوں کی جڑوں میں اس آمیزے سے مالش کریں اور دو تین گھنٹوں بعد دھو لیں اس سے بال بے حد نرم و ملائم ہو جائیں گے۔
☆ بالوں میں خشکی دور کرنے کے لئے دہلی میں انڈیا اور تیل ملا کر لگانے سے خشکی مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆